قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار طلوعِ اسلام کراچی

جلد نمبر ۸ شمارہ ۱۸ | کراچی : ہفتہ ۴ - جون ۱۹۵۵ء | قیمت چار آنہ سالانہ دس روپے

قرآن نے کیا کہا ؟

فرقے مٹتے ہیں ما یوحیٰ کی اتباع سے - سوال یہ ہے کہ ما یوحیٰ کیا ہے ؟ ما یوحیٰ کے معنی ہیں " جو کچھ خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے ملا ہے " - وحی کے ذریعے کیا ملا ہے ؟ اس کی بابت خدا نے اپنے رسول سے کہا کہ ان لوگوں سے کہدو کہ اوحی الی ہذا القران - میری طرف یہ قران وحی ہوا ہے - لانذرکم بہ - تاکہ میں تمہیں اس قران کے ذریعے تمہاری غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کردوں - صرف تمہیں ہی نہیں جو اس وقت میرے مخاطب ہو بلکہ ومن بلغ (۶/۱۹) ان سب کو بھی جن تک یہ قران پہنچے - یعنی

(۱) نبی اکرم کو خدا کی طرف سے صرف قران وحی کے ذریعے ملا تھا -

(۲) یہ قران صرف انہیں کے لئے نہیں تھا جو حضور کے زمانے میں موجود تھے بلکہ ہر زمانے کے لوگوں کے لئے جن تک یہ پہنچے ما یوحیٰ ہے -

لہذہ فرقے صرف اس صورت میں مٹ سکینگے کہ اطاعت خالص ما یوحیٰ (قران) کی کی جائے -

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ....

۱ تنہا انسانی عقل زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں ۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ۔

۲ یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے جس کے لئے نوع انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی ۔

۳ حق و باطل کا معیار قرآن ہے ۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہو صحیح ہے جو اس کے خلاف ہے غلط ہے ۔

۴ حضور نبی اکرم انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن عجمی سازشوں نے ہماری تاریخ میں ایسی چیزیں شامل کر رکھی ہیں جن سے حضور کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے ۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضور کی سیرت کا تنہا معیار خود قرآن کریم ہے ۔

۵ قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے ۔

۶ اس عالمگیر نظام زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انہیں قانون شریعت کہا جاتا ہے) یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے ۔

۷ اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشو و نما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا اسے ربوبیت عالمین یعنی تمام نوع انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔

۸ ربوبیت عالمین کے مقصد عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے ۔ اسے " قرآنی نظام ربوبیت " کہا جاتا ہے ۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ....

ابتداءً پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں قرآنی نظام ربوبیت نافذ ہو جائے تاکہ صفات خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی ذاتی ہوئی صلاحیتیں کامل نشو و نما پا سکیں اور اس طرح " زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے "

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک و مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ خدا اور قیصر
★ عورت کا قران
★ عالم اسلامی
★ وزیر اعظم سے خطاب
★ مجلس اقبال
★ بین الاقوامی جائزہ
★ عرصہ محشر
★ گفتگوئے خداوندی
★ بزم طلوعِ اسلام
★ تاریخی شواھد
★ وراثت و وصیت
★ اندرون ھند
★ اسلام کی سرگزشت
★ باب المراسلات

اقبال اور قرآن

اقبال نے جو کچھ سمجھا قرآن سے سمجھا اور زبان شعر میں قرآنی پیغام لوگوں تک پہنچایا

قرآن کے حقائق کیا ھیں اور اقبال کا پیام کیا ھے؟ انکے جوابات پرویز صاحب کی تشریحات میں دیکھئے جو آپ کو اقبال اور قرآن میں ملینگی

صفحات ۲۵۶ قیمت دو روپے

قیمت -/-/۲ روپے

فردوس گم گشتہ

مفسر قرآن اور ترجمان اقبال جناب پرویز کے دلکش مضامین اور سحر آور تقاریر کا مجموعہ - نوجوان طبقہ کے لئے فکر و عمل کی نئی دعوت -

صفحات ۳۱۲ قیمت چھ روپے

قیمت -/۱/۸ روپیہ

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ - کراچی - ۳۰

ہفتہ وار
طلوعِ اسلام
جلد ۸ ۴ر جون ۱۹۵۵ء نمبر ۱۸

خدا اور قیصر

رمضان المبارک کی انتیسویں تاریخ ہے۔ مطلع ابر آلود ہے۔ افطار کے بعد ہر شخص کی آنکھیں ایک خاص سمت کو اٹھ رہی ہیں کہ دیکھیں وہاں سے کیا فیصلہ ہوتا ہے؟ کل عید ہوگی یا ایک اور روزہ رکھنا ہوگا۔ وقت گزرتا جارہا ہے۔ تذبذب کی وجہ سے سینوں میں دل دھڑک رہے ہیں۔ دوکاندار دکانوں پر سودے نہیں لگاتے کہ نہ معلوم کل کے متعلق کیا فیصلہ ہو۔ خریدار چیزیں نہیں خریدتے کہ پہلے کچھ فیصلہ ہو جائے تو پھر خریداری کی جائے۔ غرضیکہ ساری کی ساری قوم اس فیصلہ کے انتظار میں ہے۔

مملکت کا گورنر جنرل بھی انتظار میں ہے۔

وزیر اعظم بھی انتظار میں ہے۔

کابینہ کے وزراء بھی انتظار میں ہیں۔

تو آئین ساز حضرات بھی انتظار میں ہیں۔

عدالتوں کے جج انتظار میں ہیں۔

فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس بھی انتظار میں ہے۔

پولیس کا انسپکٹر جنرل انتظار میں ہے۔

فوج کا کمانڈر انچیف انتظار میں ہے۔

یہ سب انتظار میں ہیں کسی کے فیصلے کے! یقیناً یہ سوال پیدا ہوگا کہ یہ سب کے سب کس کے فیصلے کے انتظار میں ہیں؟ وہ کونسا مرکز ہے جس کی طرف مملکت کے کروڑوں انسانوں کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ وہ کونسی اتھارٹی ہے جس کے پیش نظر یہ تمام ارباب اقتدار و اختیار دم بخود بیٹھے ونتظر انتظار ہیں اور کوئی یارائے لب کشائی نہیں پاتا؟

یہ کروڑوں نگاہوں کا مرکز، یہ اتھارٹی اور اقتدار کا سب سے بڑا سرچشمہ، کراچی کی ایک بوسیدہ سی مسجد ہے جس میں دو تین مولوی صاحبان، بڑے عزّ و تمکنت سے بیٹھے یہ سوچ رہے ہیں کہ کل کے لئے عید کا فیصلہ کر دیا جائے یا ایک روزہ اور رکھا دیا جائے۔ اگر انہوں نے کہدیا کہ کل کو عید ہے تو کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ کل کا روزہ رکھ لے۔ اور اگر ان کا فیصلہ یہ ہوا کہ کل کا روزہ رکھنا ہوگا تو کسی کو اس کی ہمت نہیں ہو سکے گی کہ وہ عید کرلے۔ ان کے اس فیصلے کے خلاف نہ گورنر جنرل دم مار سکے گا نہ کمانڈر انچیف، نہ کوئی جج اس کے خلاف جا سکے گا نہ چیف جسٹس نہ سب کو اس فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہوگا۔ نہ ان میں سے کوئی، اس فیصلے سے پہلے، اس معاملہ میں دخل دے سکتا ہے۔ نہ فیصلہ صادر ہونے کے بعد اس کے خلاف کہیں اپیل ہو سکتی ہے: پوری کی پوری قوم پر ان کی حکومت ہے۔ حالانکہ قوم ان فیصلہ کرنے والوں کو جانتی خوب پہچانتی ہے۔ حتیٰ کہ جس وقت یہ لوگ ان کے فیصلہ کا انتظار کر رہے تھے اس وقت بھی ان کے متعلق آپس میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود فیصلہ انہی کا ماننا تھا۔ نہ کسی اور کا۔ غور کیجئے کہ ان حضرات کی حکومت کتنے بڑے اقتدار و اختیار و اقتدار کی حکومت ہے۔

فیصلہ دینے کے بعد ان میں سے ایک صاحب اپنی گاڑی پر روانہ ہوئے۔ چوراہے پر پہنچے تھے کہ ٹریفک کے سپاہی نے سیٹی بجا کر روک لیا اور کہا کہ گاڑی کی بتیاں کیوں نہیں جلائیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ایک بتی تو جل رہی ہے۔ دونوں کی کیا ضرورت ہے۔ سپاہی نے ڈانٹ کر کہا کہ بتیوں کا حکم چیف کمشنر صاحب کا دیا ہوا ہے۔ اس میں آپ کو مجال گفتگو نہیں۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے پرچہ کاٹ کر ان کے ہاتھ میں تھما دیا اور کہا کہ کل دس بجے تیموری صاحب کی عدالت میں پیش ہونا ہوگا۔

کل عید ہوگی یا نہیں ہوگی —— اس کا فیصلہ مسجد کے مُلّا کریں گے۔

گاڑی کی بتیاں کس طرح جلائی جائیں گی —— اس کا فیصلہ چیف کمشنر صاحب کریں گے۔

ایک ہی مملکت میں ایک ہی شہر میں دو متوازی حکومتیں!!

٭٭٭

ایک اور منظر سامنے لائیے۔

پولو گراؤنڈ (کراچی) میں عید کی نماز کا اجتماع ہے۔ لاکھوں کا مجمع ہے۔ گورنر جنرل صاحب تشریف فرما ہیں، وزیر اعظم صاحب بھی دو زانو بیٹھے ہیں۔ کابینہ کے وزراء۔ چیف کمشنر، مجلس آئین ساز کے اراکین سب موجود ہیں۔ سندھ چیف کورٹ کے جج بھی۔ اور اتفاق سے فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس بھی۔ سب کسی کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ وقت گزرتا جارہا ہے۔ ہر ایک آنکھیں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہا ہے لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ بالآخر ایک عبا و قبا میں ملبوس مولوی صاحب تشریف لاتے ہیں۔ انہیں آتا دیکھ کر بہت سی آنکھوں میں تحقیر کی ہنسی پھر جاتی ہے۔ بہت سے خندۂ زیر لبی سے ان کا استقبال کرتے ہیں۔ وہ آکر محراب میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سب صف بستہ ان کے پیچھے خاموشی سے ایستادہ ہو جاتے ہیں۔ وہ جھکتے ہیں تو سب جھکتے ہیں وہ اٹھتے ہیں تو سب اٹھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ منبر پر تشریف لیجاتے ہیں اور جو جی میں آتا ہے کہتے چلے جاتے ہیں۔ یہ سنتے ہیں اور جی ہی جی میں ہنستے ہیں۔ کیونکہ ان کی باتوں میں سے اکثر ایسی ہیں جن پر انسان ہنس دے۔ لیکن انہیں علانیہ ہنسنے کی جرأت نہیں۔ جب تک ان کا جی چاہا انہوں نے انہیں باندھ کر بٹھائے رکھا کسی میں اتنا کہنے کی ہمت نہیں کہ وقت زیادہ ہو رہا ہے۔ ہمت اور جرأت کیسے ہو۔ یہاں ان کی حکومت ہے۔ یہاں انہی کے فیصلے چلیں گے۔ بہرحال، انہوں نے خطبہ ختم کیا۔ دعا مانگی۔ محفل برخاست ہوئی۔ بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ یہ ایک طرف سے تیزی سے باہر نکلنے لگے تو سپاہی نے ڈانٹ دیا کہ دیکھتے نہیں کہ یہ رستہ حضور گورنر جنرل کے لئے مخصوص ہے۔ ادھر ہٹ کر چلو۔ یعنی تمہاری حکومت کا دائرہ اور تھا۔ اب تم کسی اور کی مملکت میں پہنچ گئے ہو!

ایک ہی میدان میں، پانچ منٹ کے اندر اندر، حکومتیں بدل گئیں۔

٭٭٭٭

اور تیسرا منظر بھی۔

جناب وزیر اعظم کے صاحبزادہ کی شادی ہے گورنر جنرل صاحب تشریف فرما ہیں۔ وزراء سلطنت، اعماد مملکت، اراکین مجلس آئین ساز، بڑی بڑی عدالتوں کے جج۔ سب زیب دہ محفل ہیں۔ دولہا مجلس میں ہے۔ دولہن اندر گھر میں۔ سب کسی کے انتظار میں ہیں اور رہ رہ کر دروازے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ دیر ہوتی جارہی ہے۔ چہ میگوئیاں سب کرتے ہیں لیکن سب بے بس سے ہیں۔ کافی انتظار کے بعد مولوی صاحب تشریف لاتے ہیں۔ سب تعظیم سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ (دولہا کے باپ) وزیر اعظم صاحب

کو حکم دیتے ہیں کہ آپ اندر جائیے۔ وہاں یوں کیجئے اور یوں کیجئے۔ فلاں، فلاں کو ساتھ لے جائیے۔ گورنر جنرل صاحب! آپ ادھر تشریف لائیے۔ چیف جسٹس صاحب! میں جو کچھ کہوں، آپ اس کے گواہ رہیئے۔ وہ سب تعمیل ارشاد کرتے ہیں۔ اس کے بعد، وہ کچھ الفاظ کہتے ہیں۔ دولہا ان الفاظ کو دُہراتا ہے۔ ساری محفل ساکت و صامت بیٹھی ہے۔ پھر وہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ جتنا وقت جی چاہے دعا میں لگا دیتے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ ان سے سبقت کر کے اپنی دعا پہلے ختم کر لے۔ اس کے بعد وہ وزیر اعظم صاحب کو مبارک باد دیتے ہیں کہ ان کے صاحبزادہ کا نکاح، احکام شریعت کے مطابق بحسن و خوبی تکمیل پا گیا۔ انہوں نے جو کچھ کیا اس میں کسی کو دخل دینے کی اجازت نہ تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد اس نکاح کے متعلق ایک تنازعہ پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے لئے کوئی ان مولوی صاحب کی طرف رجوع نہیں کرتا بلکہ معاملہ اس عدالت تک پہنچتا ہے جسے وزیر اعظم صاحب کی حکومت نے مقرر کر رکھا ہے۔ معاملہ ایسا ہے جس کے لئے پہلے سے واضح قانون موجود نہیں۔ لہٰذا ایک نیا قانون بنانے کے لئے اسے مجلس قانون ساز کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ ادھر یہ ہوتا ہے اور اُدھر سے مولوی صاحبان کی طرف سے آواز آتی ہے کہ نکاح طلاق کے بارے میں قانون بنانے والے تم کون ہوتے ہو؟ تمہیں یاد نہیں کہ یہ نکاح خود ہمارا پڑھایا ہوا ہے جب تم سب موجود تھے اور مولوی صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔ جب تمہیں نکاح پڑھانے کا حق نہیں تھا تو اب نکاح کے متعلق قانون بنانے کا حق کس طرح حاصل ہو گیا۔ یہ ہمارے حدود اختیار کے معاملات ہیں جن میں تم دخل انداز نہیں ہو سکتے۔

غور کیجئے، کیا پاکستان کی آئین سازی کی ہشت سالہ تاریخ، اسی کشمکش و تنازع حدود و اختیارات ہی کی داستانِ الم انگیز نہیں؟ کیا یہاں آٹھ سال سے یہی نہیں ہو رہا کہ "قوم کے نمائندے" ایک آئین بناتے ہیں اور "خدا کے نمائندے" یہ کہہ کر اسے ٹھکرا دیتے ہیں کہ تمہیں اس آئین سازی کا حق ہی حاصل نہیں۔ یہ مملکت اسلامی ہے۔ یہاں شریعت کا نظام نافذ ہوگا۔ اور نظام شریعت کے مطابق آئین و قوانین سازی کے حقدار ہم ہیں۔ تم نہیں ہو! "قوم کے نمائندے" کہتے ہیں کہ نہیں! اس کا ہمیں حق حاصل ہے۔ یہ کہتے ہیں اور ساتھ ہی عید کے چاند۔ نماز اور خطبہ اور اپنے اور اپنے بچوں کے نکاح کے لئے فیصلہ "خدا کے نمائندوں" سے طلب کرتے ہیں۔ بات بالکل صاف ہے۔ اگر رویتِ ہلال۔ خطبہ عید۔ اور نکاح خوانی میں فیصلہ کا حق مولوی کو حاصل ہے تو یقیناً قانون سازی کا حق بھی اسی کو حاصل ہونا چاہیئے۔ اور اگر قانون سازی کا حق اسے حاصل نہیں تو پھر ان امور میں فیصلوں کے لئے اس کی طرف کیوں رجوع کیا جاتا ہے؟ کہدیا جاتا ہے کہ یہ معاملات "شریعت" سے متعلق ہیں۔ اس لئے ان کے لئے ارباب شریعت ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ یہ ہے وہ اصلی نکتہ جس کی وضاحت کے لئے ہم نے اس قدر طویل تمہید اٹھائی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اسلام میں امور شریعت اور امور دنیا دو الگ الگ شعبوں سے متعلق ہیں؟ تو پھر ایک دفعہ بیٹھ کر اس کا فیصلہ کر لینا چاہیئے اور دونوں دوائر کی الگ الگ فہرستیں مرتب کر کے خدا کو خدا کی مملکت اور قیصر کو قیصر کی حکومت دیدینی چاہیئے۔

اور اگر یہ دوائر الگ الگ نہیں تو پھر اس شرک جلی کو ختم کرنا چاہیئے کہ رویتِ ہلال کا فیصلہ مسجد میں ہو اور عید کی تعطیل کا فیصلہ وزارت امور داخلہ میں۔ مقام اجتماع عید کا تعین چیف کمشنر کی طرف سے ہو اور عید کی نماز مُلّا جیون پڑھائیں۔ وزیر اعظم صاحب کا نکاح مولوی صاحب پڑھائیں اور نکاح کے متعلق قوانین کا اجراء وزیر اعظم صاحب فرمائیں۔

یاد رکھئے! ایک مملکت میں بیک وقت دو بادشاہ کبھی نہیں سما سکتے۔ جہاں ایسا ہوگا انارکی پھیل جائے گی۔ ماسکو میں قیصر ہی قیصر ہے۔ وہ خدا کو اپنے ہاں آنے نہیں دیتے۔ ویٹیکن (پوپ کی مملکت میں) "خدا ہی خدا" ہے۔ وہ قیصر کو اس مملکت میں قدم نہیں رکھنے دیتے۔ انگلستان میں "خدا" کو گرجا کی چار دیواری میں مقید کر دیا گیا ہے، اور اس سے باہر قیصر کی مملکت ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی مملکت میں آ جا نہیں سکتے۔ لیکن ہم ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں "خدا اور قیصر" کی متوازی حکومت جاری ہے۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ (یعنی قرآن کے الفاظ میں) پستیوں اور بلندیوں میں ہر جگہ فساد ہی فساد۔ کوئی چیز اپنے اصلی اور ٹھیک مقام پر نہیں۔ اور تماشا یہ کہ ہر منبر اور ہر اسٹیج سے یہ آواز بھی برابر بلند ہوتی رہتی ہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست، دین اور دنیا، الگ الگ نہیں ہیں۔ ایسی "خالص منافقت" بھی دنیا میں شاید ہی کہیں اور دیکھنے میں آئی ہو۔ جب تک یہ دوعملی اور منافقت ختم نہیں کی جائے گی، آپ کا ایک قدم بھی تعمیری منزل کی طرف نہیں اٹھ سکے گا۔

قرآن کا فیصلہ اس باب میں بالکل واضح ہے۔ اس کی رو سے دین اور دنیا دو الگ شعبے نہیں ہیں۔ مملکت کا نظم و نسق، ہدایت خداوندی کی روشنی میں، تمام ملت کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ اس میں نہ کوئی خدا کا الگ نمائندہ ہے نہ قیصر کا۔ جب نظم و نسق مملکت کے اس قرآنی تصور کے بجائے، ہمارے ہاں قیصر (سلاطین) پیدا ہو گئے تو ان کے ساتھ ہی خدائی نمائندے (ارباب شریعت) بھی معرض وجود میں آ گئے۔ لہٰذا اگر آپ نے قیصریت کو مٹانا ہے تو اس کے لئے مذہبی پیشوائیت کو ختم کرنا نہایت ضروری ہے۔ جب تک آپ کے ہاں قیصریت یا پیشوائیت کا ذرا عنصر بھی باقی ہے، مملکت کا نظم و نسق (قرآنی ہدایت کے مطابق) ملت کے سپرد کبھی نہیں ہو سکتا۔

لیکن پیشوائیت کا مسئلہ ذرا ٹیڑھا ہے اس لئے اس کے حل کے لئے غور و فکر اور عملی اہتمام کی ضرورت ہے۔ مذہبی پیشوا (مولوی حضرات) کوئی ایسا ہنر نہیں جانتے جس سے وہ اپنی روٹی آپ کما کھائیں۔ تقسیم سے پہلے، پاکستانی علاقہ کی تمام مساجد آباد تھیں اور مذہبی مدرسوں کی اسامیاں بھی پُر تھیں۔ "یہاں سے جو غیرمسلم ہندوستان کی طرف چلے گئے وہ اور سب کچھ تو چھوڑ گئے" لیکن مسجدیں اور مذہبی مکتب تو چھوڑ کر نہیں گئے۔ اُدھر ہندوستان سے جس قدر مولوی صاحبان ادھر آئے، وہ اپنے ساتھ مسجدیں اور مکتب لے کر نہیں آئے۔ اب سوچئے کہ جس ملک میں اس قسم کے بیکار لوگوں کا اتنا جم غفیر آ جائے اور ان کے لئے سینگ سمانے کی کوئی جگہ نہ ہو، وہ اپنی "خدائی نمائندگی" کے دعوے کو چھوڑ دیں تو روٹی کہاں سے کھائیں؟ یہ ہے یہاں کا اصل مسئلہ۔ جمیعت العلماء ہو یا مجلس احرار۔ جماعت اسلامی ہو یا نظام اسلام، سوال سب کے ہاں معاش کا ہے۔ لہٰذا جب تک قوم ان کے معاش کا انتظام نہیں کرے گی، یہ قوم کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ تحفظ ذات (PRESERVATION OF SELF) تو حیوانی جبلت کا بنیادی تقاضا ہوتا ہے۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ ہے کہ

(۱) اس کا اعلان کر دیا جائے کہ اسلامی مملکت میں الگ مذہبی پیشواؤں کے وجود کی گنجائش نہیں۔

(۲) موجودہ مولوی صاحبان کے معاش کا انتظام حکومت کی طرف سے کیا جائے۔

(۳) آئندہ کے لئے الگ مذہبی مدارس کو قانوناً بند کر دیا جائے۔

(۴) دین کی تعلیم، انہی مدرسوں اور کالجوں میں دی جائے جو آج محض دنیاوی تعلیم کے لئے جاری ہیں۔ اور

(۵) مملکت کا آئین، نمائندگان ملت کے باہمی مشورہ سے اس طرح مرتب کر لیا جائے کہ اس میں کوئی چیز قرآن کی مقرر کردہ حدود سے ٹکرائے نہیں۔

اگر پاکستان نے یہ کچھ کر لیا تو یہ نہ صرف زندہ رہ سکے گا بلکہ پائندہ سے پائندہ تر ہوتا چلا جائے گا۔ اگر ایسا نہ کیا اور موجودہ دوعملی اسی طرح سے رہی تو یہ دن بدن تباہی کی طرف بڑھتا چلا جائے گا۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے جس کی نتیجہ خیزی کسی کے روکے رک نہیں سکتی۔

اگر ملک میں کوئی ایسا طبقہ موجود ہے جسے اپنی حفاظت، آنے والی نسلوں کی سلامتی، پاکستان کی بقا اور شرف انسانیت سے بہرہ یاب ہونے کا کچھ بھی احساس ہے تو اسے سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیئے اور زندگی اور موت کے اس اہم سوال کا فیصلہ کر کے اٹھنا چاہیئے۔

زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نہ ماند

عرصۂ محشر!

پنجاب کے مطلع سیاسی پر جو گھنگھور گھٹائیں ایک عرصے گھر رہی تھیں وہ بالآخر برسیں اور صوبے بھر کو جل تھل تو کیا، لت پت کر گئیں۔ ان دنوں پنجاب کے قریہ قریہ، گلی گلی، کوچے کوچے میں کیچڑ ہی کیچڑ دکھائی دے رہا ہے اور جسے دیکھئے وہ گند اچھال رہا ہے یہاں تک کہ کوئی سفید پوش ایسا نظر نہیں آئے گا جو کیچڑ میں لتھڑا نہ ہو۔ یقین نہ آئے تو ذرا ایک ایک کو دیکھئے۔

گورنر پنجاب فرماتے ہیں کہ ملک فیروز خاں نون اپنی پارٹی کا اعتماد کھو بیٹھے ہیں، لہٰذا انہیں برطرف کیا جاتا ہے۔

ملک فیروز خاں نون فرماتے ہیں کہ جب سے میاں مشتاق احمد گورمانی پنجاب تشریف لائے ہیں وہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی میں پھوٹ ڈلوانے میں مصروف رہے ہیں۔

ملک صاحب کے تین ساتھی وزیر کہتے ہیں کہ وزیر اعظم پاکستان نے بذریعہ ٹیلیفون انہیں بتایا ہے کہ گورنر کو انہوں نے برطرفی کا اختیار نہیں دیا۔

وزیر اعظم پاکستان فرماتے ہیں کہ انہوں نے ان سے ٹیلیفون پر کوئی بات نہیں کی۔

یہ میاں دولتانہ ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ملک نون جب سے وزیر اعلیٰ بنے ہیں استبداد و تغلّم سے کام لیتے رہے ہیں۔ انہوں نے مسلم لیگ کے منشور کو ٹھکرایا اور بدنام یونینسٹوں کے ہمجولی بن گئے۔

آل پاکستان مسلم لیگ کے سکریٹری، فضل الٰہی پراچہ، کی سنئے،

ملک فیروز خاں نون نے کراچی میں وعدے کئے لیکن لاہور میں ان سے منحرف ہو گئے اور اس طرح عوام میں تذبذب اور بے یقینی کی فضا پیدا کر دی اور ملازمتوں میں بددلی پھیلا دی۔

ستائیس ضلعی اور شہری مسلم لیگوں کے صدر اور سیکریٹری مل کر کورس گاتے ہیں کہ ملک صاحب رجعت پسند یونینسٹوں کے ایجنٹ بن گئے تھے۔

مسٹر شمیم احمد خاں صاحب، سکریٹری پنجاب مسلم لیگ اسمبلی پارٹی فرماتے ہیں کہ میاں دولتانہ نے اپنی وزارت کے دوران میں پاکستان کو معرض خطر میں ڈال دیا تھا لیکن ملک صاحب نے بروقت پہنچ کر صوبے کو سنبھالا۔

یہ دیکھئے مسٹر مظفر علی قزلباش — جن کی وجہ سے ملک نون صاحب کو بھی یونینسٹ کہا جا رہا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میاں دولتانہ نے ملک صاحب پر سیاسی استبداد کا الزام لگایا ہے اور اس کے حق میں کوئی ثبوت نہیں دیا۔ حالانکہ دولتانہ صاحب کے عہد حکومت میں فلاں فلاں ظلم سرزد ہوا۔

ملک صاحب کے کارنامے ایسے ہیں کہ ان پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یونینسٹ کہا جاتا ہے۔ میں کبھی یونینسٹ تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے میاں گورمانی اور میاں دولتانہ کے والد مرحوم یونینسٹ تھے۔ لیکن ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ میں شامل ہو گیا تھا۔ مسٹر دولتانہ نے ہم پر دولت سمیٹنے کا الزام لگایا ہے۔ میں انہیں چیلنج دیتا ہوں کہ وہ ذرا تقسیم سے پہلے اور بعد کا اپنا بینک کا حساب دکھائیں۔

اب چودھری محمد حسین چٹھہ تشریف لاتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ مشرقی پنجاب میں جو دس لاکھ مسلمان ذبح ہوئے ان کی ذمہ داری تنہا مظفر علی قزلباش پر عائد ہوتی ہے۔ (اس کے برعکس) میاں دولتانہ پاکستان کے بانیوں میں سے ہیں۔

یہ رہے شیخ صادق حسن صاحب۔ آپ فرماتے ہیں کہ مسٹر گورمانی تشکیل پاکستان کے ہی خلاف تھے اور بہاولپور ریاست و ہندوستان میں ملانا چاہتے تھے۔ مرکز میں رہ کر انہوں نے بنگال اور پنجاب میں پھوٹ ڈلوائی اور پنجاب میں آکر وہ ملک نون صاحب کے شرکائے کار کو ان سے علیحدہ کرنے میں لگے رہے۔

یہ نمونہ ہے گالی گلوچ کے اس گھناؤنے کھیل کا جس میں پنجاب کے قائدین مصروف ہیں۔ اور یہ ڈرامہ کیوں کھیلا جا رہا ہے؟ آخر بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا کہ حمام میں سبھی ننگے نظر آ رہے ہیں؟ یہ شرمناک ہنگامہ صرف اس بات پر اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ پنجاب کو مجوزہ مجلس دستور ساز کے لئے نمائندے منتخب کرنے ہیں۔ دیوانے کی بڑ کی طرح بات جو چل نکلی ہے تو کسی کے منہ سے کوئی کلمۂ خیر نہیں نکلتا۔ اس کے نزدیک وہ غدار، اُس کے نزدیک یہ مردود ازلی، یہ کیا عذاب مسلط ہو گیا کہ ہر ایک شخص آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے کی بجائے دوسرے کا بگڑا ہوا حلیہ دیکھ رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ سبھی صورتیں مسخ ہو گئی ہیں اور ہر شخص حبشی کی طرح آئینے میں اپنا ہی چہرہ دیکھ رہا ہے لیکن سمجھ رہا ہے کہ اس میں شیطان بیٹھا ہے؟

ہمیں رونا ان مسخ شدہ چہروں کا نہیں بلکہ ماتم اس کا کرنا ہے کہ یہی سیاہ چہرے کل کو ایک جگہ جمع ہوں گے تو اپنے آپ کو مجلس دستور ساز کا نام دیں گے اور ان کے ذمہ فریضہ یہ ہوگا کہ وہ جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے لئے شایانِ شان دستور مرتب کریں۔

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر زخاک
سر برآر و این قیامت درمیانِ خلق بیں

اب ذرا اس بھنگڑ خانے سے باہر آئیے اور قبل اس کے کہ سعدی کے الفاظ میں یہ آواز آئے کہ "فلاں نماند" یہ سوچئے کہ کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

ہمارے سامنے سوال یہ نہیں کہ ملک فیروز خاں نون کا جرم کیا تھا اور انہیں اس کی کیا سزا دی گئی۔ وزارتیں جلیبی بھرتی جھاگ کی ہوتی ہیں وہ بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ نہ ان کی آنے کی خوشی ہونی چاہیئے نہ جانے کا غم۔ کیونکہ "اسم راز شبہا پائندہ تر دل" کے مصداق دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس آمد و رفت میں ملک اور قوم کا کیا بنتا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں سیاسیات پاکستان کا جائزہ لیا جائے تو یہ رنجیدہ حقیقت روح کی گہرائیوں میں لرزہ برپا کر دیتی ہے کہ اب جو سیاست پر چند شاطر بیٹھے ہیں جو جوڑ توڑ اور ہار جیت میں لگے رہتے ہیں۔ ان کے ذاتی مصالح اور شخصی مفادات کے مطابق ملک کی قسمت کے پانسے پلٹتے رہتے ہیں۔ اور اگر ملکی سیاست ہر وقت متزلزل اور توازن نا آشنا رہتی ہے تو وہ کسی سیاسی خرابی کی بدولت نہیں بلکہ محض انہی اصحاب غرض و ارباب ہوس کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہے۔ اور یہ ریشہ دوانیاں محض اس لئے نہیں ہو رہیں کہ ہمارے سیاست داں جاہ و منصب کے بھوکے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قوم کی طرف سے ان پر کسی قسم کا کوئی احتساب نہیں۔ ہر ابن الوقت مفاد خویش کا تحفظ کرتا ہے اور اسے تقاضائے ملی قرار دیتا ہے لیکن کہیں سے کوئی آواز نہیں اٹھتی کہ وہ غلط کہہ رہا ہے۔ جمہوریت میں احتساب کا تقاضا سیاسی جماعتیں پورا کرتی ہیں۔ وہ وزارتوں کو خشائے عوامی کے مطابق ایک منشور عمل دیتی ہیں اور پھر اس میزان میں ان کی کارگزاری کو تولتی رہتی ہیں۔ جب بھی کوئی وزارت کم عیار نکلتی ہے اس کی برأت موت ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں صورت یہ ہے کہ سیاسی پارٹیاں یکسر مردہ ہو چکی ہیں۔ حکومتیں کہنے کو سیاسی جماعتوں کی نمائندہ ہیں لیکن ان سے احتساب کرنے والا کوئی نہیں۔ چنانچہ وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہونے کے باعث سیاسی سازشوں کی آماجگاہ بن گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گورنر جنرل اور گورنروں کے ہنگامی اختیارات کا استعمال بڑھ گیا ہے اور سیاسی مقدمہ بازی کا دور دورہ ہو گیا ہے۔ لیکن سیاست میں توازن نہ اس سے پیدا ہوتا ہے نہ اس سے۔ طلوع اسلام کا مشورہ تو اس بارے میں یہ ہے کہ سیاسی پارٹیوں کے لاشوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا جائے اور آئندہ کے لئے ملت کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے نہ کیا جائے۔ ہم نے بارہا اس حقیقت کو پیش کیا ہے کہ قرآن کے نزدیک ملت فی ذاتہ ایک پارٹی ہے اور پارٹی بازی کا تصور شرکانہ ہے۔ ہماری یہ دعوت اب تک صدا بصحرا ثابت ہوئی ہے۔ لیکن اگر ہمارے ارباب سیاست اس مقام پر نہیں پہنچ سکتے جس کی نشاندہی قرآن نے کی ہے تو کم از کم عہد حاضر کی اس جمہوریت کا تقاضا ہی پورا کریں جس کا وہ دم بھرتے ہیں۔ وہ سیاسی زندگی کو پارٹی پالیٹکس کی لائنوں پر ہی چلائیں تو ایک حد تک موجودہ فساد میں کمی واقع ہو سکتی ہے اس طرح وہ خدا تک رسائی حاصل نہیں کر سکیں گے تو کم از کم آدم تک تو پہنچ ہی جائیں گے، ورنہ اس وقت تو حالت

یہ ہے کہ

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

ملک اس وقت ایک نہایت نازک دوراہے تک آپہنچا ہے۔ آٹھ سال تک جھک مارنے کے بعد ہمیں پھر موقع مل رہا ہے کہ ہم اپنا آئین مرتب کریں اور اس کے مطابق انتخابات عمومی کراکے ملک میں باقاعدہ پارلیمانی زندگی کا آغاز کریں۔ ہم "عرصۂ محشر" میں کھڑے ہیں اور وقت کا اقتضا یہ ہے کہ ہم اپنا بہترین عمل پیش کریں۔ یہ موقع کامل یکسوئی اور یک جہتی کا ہے۔ کیونکہ اگر پوری توجہ سے اور کم سے کم وقت میں تسویدِ آئین کے کاروبار کو سرانجام نہ دیا گیا تو جن فتنوں کا آغاز ہو چکا ہے وہ ملک کو تباہ کرکے رکھ دیں گے۔ گو ہمارے نزدیک پاکستان کی حقیقی ترقی اور سرفرازی کا راز قرآنی نظامِ معاشرت میں پنہاں ہے۔ لیکن اگر سابقہ تجربات کی روشنی میں سیاسی ضروریات سے ہی عہدہ برآ ہو لیا جائے تو موجودہ تذبذب اور بے یقینی کا دور ختم ہو جائیگا۔ اور کم از کم یہ خطۂ زمین تو محفوظ رہ جائے گا۔ اس کے بعد توقع کی جاسکے گی کہ ہم سے بہتر لوگ اٹھیں گے تو وہ تحریکِ پاکستان کے حقیقی منشاء و مفہوم کی عملی تعبیر کرلیں گے۔

ہم اس موقع پر گورنر جنرل کی خدمت میں خصوصیت سے گزارش کریں گے کہ عدالتی فیصلوں نے ان کی ذمہ داری دوچند کردی ہے۔ وہ اپنی پوزیشن کے صحیح استعمال سے ملک کو موجودہ خلفشار سے نکال لے جانے کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ اگر ان کی جراءت اور بیدار مغزی سے پاکستان موجودہ خلفشار سے نکل جائے تو تاریخ انہیں واقعی محافظِ ملت کے نام سے یاد کرے گی۔

وزیرِ اعظم سے خطاب

بازارِ سیاست میں چلتی زبان، صاحبِ زبان کے لئے ایک عمدہ حربے کا کام دیتی ہے۔ لیکن یہی زبان بے قابو ہو جائے تو طرفہ مصیبت برپا کرنے کا موجب بھی بن جاتی ہے۔ ہمارے وزیرِ اعظم نے گزشتہ چند دنوں میں اس کی جو مثال قائم کی ہے وہ حد درجہ افسوسناک ہے۔ ذرا مختصراً جائزہ لے کر دیکھئے، ان کے تازہ بیانات اور بیانات در بیانات کا۔

۱۰ر مئی کو آپ نے دہلی میں اخباری نمایندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ نیا سال ہے اور ہم کشمیر کے بارے میں نئے (۱۹۵۵ء کے) حل کا طریقہ استعمال کریں گے۔ اس نئے طریق کی وضاحت چاہی گئی تو آپ نے جواب دیا کہ لوگ ہر سال اپنی موٹر کاریں بدل دیتے ہیں، ہم بھی اب ۱۹۵۵ء کا ماڈل استعمال کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی دہلی سے یہ تشویشناک خبریں آنا شروع ہوئیں کہ اپنا سارا موقف چھوڑ چھاڑ، ہمارے وزیرِ اعظم نے کشمیر کا معاملہ کم و بیش ختم کر دیا ہے۔ پاکستان میں بجا طور پر ۱۹۵۵ء کے ماڈل کا یہی مفہوم لیا گیا۔

۱۱ر مئی کو وزیرِ اعظم نے دہلی میں پھر اخباری نمایندوں سے ملاقات کی اور گو آپ نے فرمایا کہ کشمیر کا جو حل ہوگا اس میں اہلِ کشمیر کی منشاء کا ضرور لحاظ رکھا جائے گا لیکن یہ بھی فرمایا کہ ان کی منشاء استصواب (plebiscite) ریفرنڈم اور انتخابات کے ذریعہ معلوم کی جاسکتی ہے، ہندوستان اور پاکستان کے مابین سلامتی کونسل کی وساطت سے جو معاہدہ ۱۹۴۸ء میں ہوا تھا اس کی رو سے اہلِ کشمیر کی منشاء معلوم کرنے کا طریقہ استصواب (plebiscite) طے پایا تھا۔ جب وزیرِ اعظم نے اس ایک طے شدہ لفظ کی بجائے تین الفاظ استعمال کئے تو ان شکوک کی تصدیق ہوتی نظر آئی کہ استصواب کا متفق علیہ اصول پرانا ماڈل سمجھ کے ترک کر دیا گیا ہے۔ دہلی سے رخصت ہوتے وقت آپ نے پھر اخباری نمایندوں سے ملاقات کی اور کہا کہ کشمیر سے متعلق مذاکرات میں بعض "نئی باتیں" سامنے آئی ہیں اور ہمارا طریق کم سخت (LESS RIGID) ہو گیا ہے دونوں وزرائے اعظم کو اب اپنے سرکار سے ان نئی باتوں پر تبادلۂ خیال کرنے کے لئے کچھ وقت درکار ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی ایک خبر رساں ایجنسی نے یہ خبر چار دانگ عالم میں پھیلادی کہ وزیرِ اعظم پاکستان واپس اپنے ملک جاکر اپنے سرکار کو اس پر آمادہ کریں گے کہ کشمیر میں موجودہ صورتِ حال کو قبول کرلیں اور بس۔ اس خبر کی روشنی میں وزیرِ اعظم کے بیان کا جو مفہوم لیا جاسکتا تھا وہ ظاہر ہے۔

دہلی میں رخصت ہونے سے پیشتر آپ نے یہ فرمایا کہ مذاکرات میں بات ذرا آگے بڑھی ہے۔ کراچی میں آکر آپ نے فرمایا کہ مذاکرات نہ کامیاب ہوئے نہ ناکام، البتہ ان کا سلسلہ جاری ہے۔ ۱۲ر مئی کو آپ نے معاصر "پاکستان سٹینڈرڈ" کو ایک خصوصی بیان دیا۔ اس میں آپ نے فرمایا کہ مذاکرات مفید ثابت ہوئے ہیں۔ اور حل کی طرف قدم بڑھے ہیں۔ اس بیان میں آپ نے پھر یہ کہا کہ اہلِ کشمیر کی منشا جاننے کی کئی صورتیں ہیں اور "الیکشن" (ELECTION) ان میں سے ایک ہے۔ ان بیانات پر جب تنقید ہوئی تو آپ نے ۱۵ر مئی کو معاصر "ڈان" کو ایک خصوصی بیان دیا۔ اس میں آپ نے فرمایا:

> یہ سراسر غلط ہے کہ میں نے استصواب کے علاوہ کسی اور طریق کے ذریعہ اہلِ کشمیر کی منشا جاننے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے ... میں نے الیکشن (ELECTION) کا لفظ یونہی استعمال کر دیا تھا۔ دراصل میں بلند آواز سے سوچ رہا تھا۔

آگے چل کر اس بیان میں آپ نے کہا کہ استصواب کے علاوہ ان کے اور پنڈت نہرو کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ الیکشن کا سوال تک پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ دورانِ گفتگو میں ایک ہی لفظ استعمال ہوتا رہا اور وہ تھا استصواب (PLEBISCITE) کا۔

چونکہ ایک ہی مرتبہ صاف بات کرکے معاملہ نپٹایا نہیں دیا گیا اس لئے ہر بیان کے بعد وزیرِ اعظم کو وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی رہی۔ چنانچہ ۲۴ر مئی کو آپ نے ایک پریس کانفرنس طلب کی۔ اس میں آپ نے بتایا کہ دہلی مذاکرات میں اور ان سے پہلے نیز پنڈت نہرو سے ساری مراسلت میں کوئی دوسرا لفظ استعمال ہی نہیں ہوا، صرف استصواب (PLEBISCITE) کا لفظ استعمال ہوتا رہا۔

سیدھی سی بات ہے کہ اگر امرِ واقعہ یہ تھا کہ دہلی میں استصواب ہی پہ گفتگو ہوتی رہی اور کوئی متبادل تجویز زیرِ بحث نہیں آئی تو وزیرِ اعظم کو غیر متعلق اصطلاحیں استعمال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ دہلی سے کتنا زہریلا پروپیگنڈہ ہو رہا ہے؟ اگر اس سے وہ باخبر تھے تو کیا وہ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکے کہ الفاظ کے استعمال میں ان کی بے احتیاطی اس غلط پروپیگنڈے کو کس قدر تقویت دینے کا موجب بن سکتی ہے؟ لیکن ایسا ہو یا نہ ہو، ایک مملکت کے وزیرِ اعظم کو ہر حال میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

یہاں تک تو معاملہ کشمیر سے متعلق تھا۔ اب دو ایک اور امور کو دیکھئے۔ ۲۶ر مئی کی پریس کانفرنس میں پنجاب کا مسئلہ بھی سوالات کا موضوع تھا۔ ایک صاحب نے وزیرِ اعظم سے پوچھا کہ برطرفی کے احکام میں گورنر نے نون وزارت پر جو الزامات لگائے ہیں کیا آپ ان سے اتفاق کرتے ہیں؟ جواب ملاحظہ کیجئے:

> میرے خیالات، میرے خیالات ہیں۔ انہیں چھوڑیئے۔ حکومت کی رائے یہ ہے کہ وہ (ملک صاحب پارٹی کی مطلوبہ) تائید سے محروم ہو گئے تھے۔

کیا اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ وزیرِ اعظم کی ذاتی رائے اس اہم معاملہ میں حکومتی رائے سے مختلف ہے؟ اگر ایسا ہے تو وہ جراءت سے اسے کیوں پیش نہیں کرتے؟ اگر نہیں تو "برائے بیت" بات کرنے کا مطلب کیا ہے؟

اسی اجتماع میں آپ سے یہ بھی پوچھا گیا کہ آپ مجلس دستور ساز کے لئے کہاں سے امیدوار کھڑے ہوں گے۔ آپ جواب دیتے ہیں:

> ظاہر ہے کہ اپنے صوبے سے۔ میں ان دعوتوں کی قدر کرتا ہوں جو مجھے دوسرے صوبوں سے مل رہی ہیں لیکن میں اپنے ہی صوبے سے منتخب ہونا پسند کروں گا۔

پاکستان کا وزیرِ اعظم، جسے سب سے بڑا پاکستانی ہونا چاہیئے، کہہ رہا ہے کہ میں "اپنے صوبے سے منتخب ہونا پسند کروں گا"! انہیں از خود کسی "غیر" صوبے کو اپنا سمجھنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی تو کم از کم دوسروں کی دعوت پر ہی صوبائی سطح سے بلند ہوتے اور یہ مثال قائم کرتے کہ وہ کسی صوبے کے نہیں بلکہ پاکستان کے فرزند ہیں۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ آپ نے

(باقی صفحہ [illegible] پر)

تاریخی شواہد

(۱۷)

حضرت ہودؑ کی دعوت اور قوم کی طرف سے تکذیب برابر آگے بڑھتی گئی۔ طبیب کی شفقت اور مریض کی ضد متوازی چلتی گئی۔ حضرت ہودؑ ان سے بار بار کہتے تھے کہ دیکھو! قوانین الٰہیہ سے سرکشی کا مسلک چھوڑ دو، ورنہ اس کا نتیجہ ہلاکت اور تباہی ہوگا۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ آسمان کی فضا میں کس طرح اس وبا کے جراثیم پھیلتے جا رہے ہیں، جو قانون مکافاتِ عمل کے ماتحت تم پر عذاب بن کر مسلط ہو جائیں گے۔ اور پھر کوئی راہِ فرار باقی نہیں رہے گی۔ لیکن قوت اور دولت کا نشہ ان باتوں کی طرف کب کان دھرنے دیتا ہے؟ سرکش و متمول انسان دیکھتے تھے کہ جس طرف ان کا قدم اٹھتا ہے عروج و ترقی آگے بڑھ کر رکاب تھامتی ہے۔ ان بڑھتی ہوئی کامیابیوں اور چڑھتی ہوئی کامرانیوں میں ہلاکت و بربادی کا تصور بھی کیسے آسکتا تھا؟ لیکن وہ نہیں سمجھتے تھے کہ بادہ رنگیں کے اثرات سے جو سرخی چہرے پر دوڑتی ہے، وہ خون کی تازگی اور صحت کی شگفتگی کی سرخی نہیں ہوتی بلکہ شفق کی سرخی ہوتی ہے جو غروبِ آفتاب کا نقاب رنگیں بن کر نگاہوں کو فریب دیتی ہے۔

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ ۝ (۲۹/۳۸)

اور (دیکھو!) شیطان نے ان کی بداعمالیوں کو ان کی نگاہوں میں خوشنما بنا رکھا تھا چنانچہ (اس کے نتیجہ میں) شیطان نے انہیں (صحیح) راستہ کی طرف آنے سے روکے رکھا۔ (انہوں نے شیطان کی تعلیمات کی اندھا دھند تقلید کی اور اپنی عقل و بصیرت سے مطلق کام نہ لیا) حالانکہ وہ لوگ (سمجھ بوجھ رکھنے والے اور حقائق کو) دیکھنے والے تھے۔

غور فرمائیے کہ قرآن کریم کے الفاظ کس قدر جامع ہیں۔ شیطان، حق و صداقت کی راہ روکے کھڑا تھا۔ اور جس راستہ پر وہ چل رہے تھے اسے اس نے جذبات کی گل کاریوں سے ایسا فریب نظر بنا دیا تھا کہ وہ دیکھ ہی نہیں سکتے تھے کہ ان حسین و دل فریب پھولوں کی کیاریوں کے نیچے ہلاکت و بربادی کے کتنے بڑے ہولناک غار ہیں۔ حالانکہ وہ مستبصرین تھے۔ آنکھیں رکھتے تھے۔ صاحبِ دانش و بینش تھے۔ قرآن نے اس مقام پر عقل و بصیرت اور "شیطنت" کے تقابل سے نگاہ کا رخ ایک عظیم حقیقت کی طرف پھیر دیا ہے۔ "شیطنت" کے معنی ہیں ان جذبات کی غلامی جو وحی کے تابع نہ چلیں۔ اگر انسان پر یہ جذبات غالب آ جائیں تو اس کی عقل اسے کبھی صحیح راستہ پر نہیں لا سکتی بلکہ (جیسا کہ کتاب "ابلیس و آدم" باب وحی میں بہ تفصیل بتایا جا چکا ہے) عقل تو ان جذبات کی لونڈی بن جاتی ہے اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں اس کے لئے اسباب و ذرائع بھی بہم پہنچاتی ہے اور اس کے جواز میں دلائل بھی تراشتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ وہ وحی کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں زندگی کا سفر طے نہیں کرتی۔ "مستبصرین" ہونے کے باوجود، بربادی کے جہنم میں جا گرتی ہیں۔ یہ ہے وہ حقیقت جس کی طرف قرآن نے قوم ہودؑ کے "مستبصرین" کے تذکرہ سے نگاہ کا رخ پھیرا ہے۔ سورۂ احقاف میں انہی "مستبصرین" کے متعلق ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّاهُمْ فِيمَا إِنْ مَكَّنَّاكُمْ فِيهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَأَبْصَارًا وَأَفْئِدَةً فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ (۴۶/۲۶)

اور (دیکھو!) ہم نے انہیں وہ قوت و سطوت بخشی تھی جو ہم نے زمین میں تمہیں بھی نہیں بخشی، اور انہیں (سننے کے لئے) کان (دیکھنے کے لئے) آنکھیں اور (سمجھنے کے لئے) دل (عقل و شعور) عطا کئے تھے۔ مگر ان کے کان، آنکھیں اور دل کچھ بھی کام نہ آسکے کیونکہ وہ خدا کے قوانین کا انکار کیا کرتے تھے اور (بالآخر) جس عذاب کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہی ان پر نازل ہو کر رہا۔

غور کیجئے سمع و بصر و قلب۔ علم و عقل کے ذرائع سب موجود ہیں لیکن وحی کی روشنی سے منہ موڑنے کی وجہ سے وہی کیفیت ہو چکی ہے جو آج مستبصرینِ مغرب کی ہے جن کی دوربینیں مریخ تک کے احوال و کیفیات کا پتہ تو لے آتی ہیں لیکن تباہی و بربادی کا جو سیلاب ان کے دروازوں سے ٹکرا رہا ہوتا ہے وہ کسی کو نظر نہیں آتا تھا اور جب کوئی دیدہ ور ان سے کہتا ہے کہ؎

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہ گذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے (اقبالؒ)

تو یہ لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں کہ اس روشنی کے زمانہ میں یہ "دقیانوسی خیالات" کا مبلغ کہاں سے آگیا؟ جب حضرت ہودؑ نے ان مکذبین سے کہا کہ

إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ (۲۶/۱۳۵)

(اور دیکھو، ہودؑ نے کہا کہ اے میری قوم!) میں تم پر بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

تو اس کا جواب کیا ملا؟

قَالُوا سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَوَعَظْتَ أَمْ لَمْ تَكُنْ مِنَ الْوَاعِظِينَ ۝ إِنْ هَٰذَا إِلَّا خُلُقُ الْأَوَّلِينَ ۝ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ۝ (۲۶/۱۳۶-۱۳۸)

انہوں نے جواب دیا۔ اے ہود! خواہ تو ہمیں نصیحت کرے یا نصیحت کرنے والوں میں سے نہ بنے ہم پر سب برابر ہے (ہم تیری نصیحتوں سے کوئی اثر لینے والے نہیں) یہ تو (ہمیشہ سے) پُرانے (خیالات کے) لوگوں کی عادت رہی ہے (کہ وہ خواہ مخواہ لوگوں کو ڈراتے رہا کرتے ہیں) اور نہ ہی ہمیں کوئی عذاب دیا جائے گا۔

وہ بار بار ایک ناصح امین کی طرح انہیں ان کے اعمال کے عواقبِ انجام سے آگاہ کرتے تھے۔ لیکن وہ ہر بار یہی کہتے تھے کہ:۔

فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ (۴۶/۲۲)

اگر تم سچے ہو تو وہ بات لا دکھاؤ جس کا ہمیں خوف دلا رہے ہو۔

اس کے جواب میں حضرت ہودؑ فرماتے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں۔

حقیقت ہے: نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ رِجْسٌ وَغَضَبٌ (۷/۷۱)

ہودؑ نے کہا! یقین کرو، تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب نازل ہو چکا ہے (تمہاری آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں کہ تمہیں اس کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔)

وہ پوچھتے کہ یہ عذاب کب آئے گا؟ ارشاد ہوتا کہ:۔

قَالَ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ وَأُبَلِّغُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ وَلَٰكِنِّي أَرَاكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ ۝ (۴۶/۲۳)

اس کا علم تو صرف خدا ہی کے پاس ہے کہ یہ کب وارد ہوگا (میرا کام فرض یہ ہے کہ) جو ہدایت دے کر مجھے بھیجا گیا ہے وہ تم تک پہنچا دیتا ہوں لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک ایسی قوم ہو جو جہالت کی باتیں کرتی رہتی ہے۔

نوادرات
علامہ اسلم جیراجپوری کے مضامین کا مجموعہ
قیمت چار روپے

اسلام کی سرگزشت

گذشتہ اشاعتوں میں عربوں کے قومی خصائص و امتیازات سے بحث کی جا چکی ہے اس سلسلہ میں علمائے عمرانیات کی آراء کا خلاصہ بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ جاحظ، ابن خلدون، اور اولیری کی آراء پیش کر کے ڈاکٹر احمد امین نے جو تبصرہ کیا تھا۔ اسے بھی آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ آج کی فرصت میں ڈاکٹر احمد امین صاحب کی اس کے متعلق اپنی رائے پیش کی جا رہی ہے۔ نیز عربوں کی زمانۂ جاہلیت میں حیات عقلیہ پر بحث کی جائے گی۔

ان کا تخیل محدود اور غیر متنوع ہوتا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ان کا تخیل خود اپنی زندگی سے بہتر کسی زندگی کی تصویر کشی کر سکے۔ جس کے لئے وہ کوشش کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پورے لٹریچر میں انسانیت کا کوئی "بلند ترین نمونہ" نہیں ملتا۔ کیونکہ یہ بلند ترین نمونہ تخیل ہی کی پیداوار ہوتا ہے۔ نہ ہی ان کی زبان میں کوئی ایک ایسا لفظ ملتا ہے۔ جو کسی ایسی خیالی شخصیت پر دلالت کرتا ہو۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے انھوں نے اپنے کلام میں بھی اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ ان کا شعری تخیل بہت کم کسی نئے عالم کی طرف پرواز کرتا ہے۔ جہاں سے وہ کوئی نیا مضمون لاسکے تاہم وہ اپنے تنگ دائرہ میں رہتے ہوئے بھی ہر طرف اور ہر راستہ پر چلنے کی طاقت ضرور رکھتا ہے۔

رہ گیا ان کا اخلاقی پہلو تو وہ یقیناً حریت کی طرف مائل ہے۔ لیکن اس حریت کی کوئی حد بندی یا تعریف نہیں کی جا سکتی حریت سے جو کچھ لوگوں نے سمجھا ہے۔ وہ شخصی حریت ہے نہ کہ اجتماعی حریت۔ وہ کسی رئیس یا حاکم کے مطیع و فرمانبردار بن کر رہنا جانتے ہی نہیں۔ زمانہ جاہلیت میں ان کی تاریخ ـــ حتیٰ کہ اسلام کے بعد بھی ـــ اندرونی جنگوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا عہد ان کی تاریخ کا زریں عہد کہا جا سکتا ہے، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اندرونی جنگوں سے ہٹا کر بیرونی جنگوں میں مشغول کر دیا تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قدرت کی جانب سے خصوصیت کے ساتھ وہ گہری فہم عطا ہوئی تھی۔ جس کی بنا پر وہ عربوں کی نفسیات کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔

عرب قوم مساوات کو بہت پسند کرتی ہے۔ بلکہ اس سے عشق رکھتی ہے۔ لیکن یہ مساوات بھی قبیلہ کی حدود تک ہے۔ مساوات سے عشق رکھنے کے باوجود وہ اپنے قبیلہ اور پھر اپنی جنس کو ہر حال دوسروں کے مقابلہ میں نمایاں اور عظیم ترجیح دیتا ہے اس کے اعماق قلب میں یہ شعور جاگزیں ہے کہ اس کا خون بہت ہی ممتاز ہے وہ کبھی بھی ایران اور روم کی عظمت کا قائل نہیں ہو سکا۔ حالانکہ انکی حالت اور رومیوں اور ایرانیوں کی حالت میں بڑا فرق تھا یہاں قحط سالی اور خشکی تھی تو وہاں سرسبزی اور شادابی تھی۔ یہاں فقر تھا تو وہاں غنا تھا یہاں بادیہ نشینی تھی تو وہاں تمدن و حضارت تھی ان ظاہر و باہر تفاوتوں کے باوجود جب انھوں نے رومیوں اور ایرانیوں کے ممالک کو فتح کر لیا۔ تو وہ ان کی طرف اپنی نظروں سے دیکھتے تھے جیسا کہ ایک آقا اپنے غلام کی طرف دیکھتا ہے۔ ہم نے ان کا یہ مختصر سا ایک وصف بیان کیا ہے۔ جس کی تفصیل آئندہ فصل میں پیش کی جائے گی۔

جو کچھ ہم نے عربوں کی طبیعت عقلیہ کے متعلق بیان کیا ہے اور اس سے پہلے جو کچھ ہم وضاحت کے ساتھ دوسری متمدن قوموں کے ساتھ عربوں کے ارتباط و اتصال کے متعلق بیان کر چکے ہیں۔ یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی عقلی حیات کس قسم کی تھی۔ نیز یہ بھی کہ ان کی عقلی زندگی کا مظہر ان کی زبان، شعر، ضرب الامثال اور قصص ہی تھے۔

چوتھی فصل

(زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی حیاتِ عقلیہ)

ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ عرب لوگ اپنے زمانۂ جاہلیت میں زیادہ تر بادیہ نشین تھے۔ اور بادیہ نشینی کا دور ایک ایسا طبعی اجتماعی دور ہوتا ہے۔ جس سے تمام قومیں ہی تمدن و حضارت تک پہنچتے ہوئے گذرتی ہیں۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس طبعی دور کے کچھ طبعی اور عقلی مظاہر بھی ہوا کرتے ہیں۔

اس جیسے دور میں جس سے عرب لوگ زمانہ جاہلیت میں گذرتے رہے ہیں، ہر قوم میں نمایاں طریق پر تعلیل کی قوت کمزور ہوا کرتی ہے یعنی اس میں علت اور معلول اور سبب اور مسبّب کے درمیان رابطہ کو پوری طرح پر سمجھ سکنے کی صلاحیت نہیں ہوا کرتی۔ ایک آدمی بیمار ہوتا ہے۔ اپنے مرض سے درد و الم محسوس کرتا ہے لوگ اسے اس کا علاج بتاتے ہیں۔ وہ اس دوا اور بیماری کے درمیان کسی قدر معمولی ارتباط کو تو سمجھ سکتا ہے۔ لیکن وہ اسے اس طرح پر نہیں سمجھ سکتا! جیسے ایک طرف فلسفہ آشنا باریک بین عقل سمجھ سکتی ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا قبیلہ اس بیماری میں اس دوا کو استعمال کرنے کا عادی رہا ہے۔ اس کی نگاہ میں بس اتنا ہی کچھ ہوتا ہے۔ لہذا اس کی عقل اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی کہ وہ اس قسم کا اعتقاد جمالے کہ بادشاہ کا خون باؤلے کتے کے کاٹے میں مفید ہوا کرتا ہے۔ یا یہ اعتقاد کہ بیماری کا سبب کوئی خبیث روح ہوا کرتی ہے۔ جو مرض میں حلول کر جاتی ہے۔ اور اس کے لئے وہ اس قسم کے علاج تجویز کر لیتا ہے۔ جن سے ان ارواح کو بھگایا جا سکے۔ یا انھیں جب کسی آدمی کے متعلق یہ خوف ہو کر وہ پاگل ہو جائے گا۔ تو وہ اس کے بدن پر نجاستیں اور مُردوں کی ہڈیاں لٹکا کر مریض کو نجس اور ناپاک کر دیتے ہیں، اس قسم کی اور بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ جب تک اس کا قبیلہ یا خاندان اس طرح کے کام کرتا رہتا ہے۔ وہ ان میں سے کسی بات کو بھی عجیب یا مستنکر نہیں سمجھتا۔ کیونکہ استنکار و ناپسندیدگی کا منشا دقت نظر اور مرض اور اس کے اسباب و عوارض کی تحقیق کی قدرت اور ان چیزوں کی تحقیق جو ان عوارض کو دور کر سکیں، ہو سکتی تھی۔ لیکن اس دور اول میں کسی قوم کی عقل اس درجہ تک پہونچتی ہی نہیں کہ وہ اس طرح کی تحقیقات کر سکے۔

قوتِ تعلیل کی یہ کمزوری ہی ہے جو ان تمام خرافات اور کہانیوں کی وضاحت اور تشریح کر دیتی ہے۔ جن سے عربی لٹریچر کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ اور جن پر عرب لوگ زمانہ جاہلیت میں اعتقاد رکھتے تھے۔ یہ لوگ ہم سے بیان کرتے ہیں کہ مآرب کا بند تین پہاڑیوں کے درمیان میں واقع تھا۔ جس میں سیلابوں اور چشموں کا پانی آکر جمع ہو جاتا تھا۔ پانی نکلنے کا راستہ صرف ایک ہی طرف سے تھا۔ پچھلے لوگوں نے اس راستہ کو ٹھوس پتھروں اور سیسہ پلائی ہوئی دیواروں سے بند کر دیا تھا جب وہ اپنے کھیتوں کو سیراب کرنا چاہتے تھے۔ تو اس سد کے اندر اپنی ضرورت کے مطابق مضبوط اور مستحکم دروازے کھول لیا کرتے تھے۔ اور یہ دروازے نہایت حساب کے ساتھ بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ ضرورت کے مطابق وہ اپنی کھیتوں کو سیراب کر لیتے۔ اور پھر جب چاہتے ان دروازوں کو بند کر دیا کرتے تھے۔ پھر اس کے بعد وہ یوں بیان کرنے لگتے ہیں کہ اس بند کے برباد ہونے کا سبب یہ ہوا کہ سرخ رنگ کے چوہے اس دیوار کو جو اس بند سے متصل تھی۔ اپنے دانتوں سے کھودنے لگے جس سے وہ پتھر اپنی جگہ سے اکھڑ گیا جسے سو آدمی بھی مل کر نہ اٹھا سکتے تھے۔ پھر وہ اپنے پیروں کے پنجوں سے اس بھاری چٹان کو دھکیلتے دھکیلتے یہاں تک لے آئے کہ وادی کو اس طرف سے بند کر دیا۔ جہاں سے اس میں پانی آکر جمع ہو جاتا تھا۔ اور اس طرف سے کھول دیا۔ جدھر سے پانی کو روکا گیا تھا۔ یہ لوگ اتنی بات نہیں سمجھ سکے کہ آخر ان خرافاتی چوہوں اور بند کے برباد ہو جانے میں کوئی صحیح ارتباط ہی نہیں ہو سکتا۔

اس کا صحیح سبب یہی تھا کہ لوگوں نے بند کی خبر گیری کی طرف سے غفلت برتی۔ حتیٰ کہ اس کی دیواروں میں اتنی طاقت ہی نہ رہی کہ وہ سیلابوں کے پانیوں کو برداشت کر سکتیں۔ اور ان کا دباؤ سہ سکتیں۔

اقبال اور قرآن

از :- پرویز

علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ

ڈسٹ کور کے ساتھ۔ صفحات ۲۵۶

قیمت :- دو روپے

مجلسِ اقبال

مثنوی اسرارِ خودی

(تمہید)

گذشتہ اشعار میں اقبالؔ نے کہا ہے کہ جن انقلاب آفریں حقائق کو میں واشگاف کر رہا ہوں انہیں سمجھنے اور اپنانے کے لئے

چیتے کا جگر چاہیئے شاہیں کا تجسس

ان کی گہرائیوں اور وسعتوں کو پالینا، کسی کم سواد کا کام نہیں۔

غنچہ کز بالیدگی گلشن نشد — درخورِ ابرِ بہارِ من نشد

وہ غنچہ جو کھل کر پورا گلستان نہ بن جائے، اس قابل ہی نہیں ہوتا کہ میری فکر کے ابرِ بہار سے سیراب ہو سکے۔ حقائق کو سمجھنے کے لئے شرحِ صدر کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ "شرحِ صدر" کوئی تصوف کی اصطلاح نہیں۔ نہ ہی اس کے لئے کسی باطنی کلید کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ فرعون کی طرف جاؤ اور اسے آسمانی انقلاب کی دعوت دو، تو انہوں نے دعا کی کہ رب اشرح لی صدری۔ اے میرے نشوونما دینے والے! میرے سینے میں کشادگی پیدا کردے۔ اس سینے کی کشاد "شرحِ صدر" میں عزم کی بلندی، نگاہ کی وسعت، علم کا تبحر، ہمت کی افزائش، بازوؤں کی قوت اور قوموں کی استقامت سب کچھ آجاتا ہے۔ اقبال بھی یہی کہتا ہے کہ جب تک تمہارے قلب و دماغ میں اس قدر وسعت پیدا ہو جائے، میرے پیش کردہ حقائق تمہاری سمجھ میں نہیں آسکیں گے۔ تنگ نظری اور ضیقِ نفس کو لئے ہوئے اس طرف آؤ گے تو یہاں سے کچھ نہیں مل سکے گا۔ اس لئے کہ

برقہا خوابیدہ در جانِ من است — کوہ و صحرا بابِ جولانِ من است

میری جانِ ناتواں میں بجلیاں خوابیدہ ہیں۔ اور پہاڑوں اور صحراؤں کی وسعتیں، میرے کھیل کے میدان، میری جولانگاہ کا دروازہ ہیں۔ یعنی جسے دنیا سب سے بڑی وسعت اور کشادگی سمجھتی ہے، وہ میری فکری جولانگاہ کے لئے بمنزلہ دروازہ کے ہے۔ لہذا

پنجہ کن با بحرم ار صحراستی — برق من درگیر اگر سیناستی

اگر تم میرے سمندر کے مقابل آنا چاہتے ہو تو پہلے یہ دیکھ لو کہ تم میں صحراؤں کی سی وسعت ہے یا نہیں۔ اگر ایسی وسعت ہے تو پھر میرے بحرِ فکر پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت کرو۔ میری آتشِ پنہاں کی بجلیوں کے سامنے آنے کا حوصلہ وہی کرے جو طور کا سا عزم و استحکام رکھتا ہو۔ اگر وہ ذرا بھی کمزور ہوا تو ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ لوگوں کو کیا پڑی ہے کہ وہ اس قدر شعلہ بدامن فکر کے قریب آکر خواہ مخواہ اتنا بڑا خطرہ مول لیں۔ یہ اس لئے کہ

چشمۂ حیواں براتم کردہ اند — محرمِ رازِ حیاتم کردہ اند

مجھے رازہائے حیات کا محرم بنایا گیا ہے۔ میری قسمت میں چشمۂ حیواں لکھ دیا گیا ہے۔ لہذا جو کوئی میری فکر سے بہرہ یاب ہو جائے گا اس پر زندگی کے سربستہ راز کھل جائیں گے اور وہ حیاتِ جاوداں کی متاعِ گراں بہا سے متمتع ہو جائے گا۔ مجھے وہ تب و تابِ زندگی ملی ہے کہ

ذرہ از سوزِ نوایم زندہ گشت — پَر کشود و کرمکِ تابندہ گشت

میری نوائے پُرسوز کی حرارت سے ذرۂ بے جان میں زندگی کی نمود پیدا ہو گئی۔ اس نے پَر کشائی کی اور دنیا کی نگاہوں میں کرمکِ شب تاب (جگنو) بن کر اڑنے لگ گیا۔ وہ کسی دوسرے کی روشنی کا محتاج نہ رہا۔ بلکہ دوسروں کے لئے شمعِ راہ بن گیا۔

ہیچ کس رازے کہ من گویم نگفت — ہمچو فکرِ من دُرِ معنی نسفت

زندگی کے لئے جو راز میں بتانا چاہتا ہوں، کوئی اور نہیں بتا سکتا۔ حقائق و معارف کے جو موتی میری فکر پرو سکتی ہے، کوئی اور ایسا نہیں کر سکتا۔ اس لئے

سرِ عیشِ جاوداں خواہی بیا — ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا

اگر تو عیشِ جاوداں کا راز پانا چاہتا ہے، تو میرے پاس آ۔ میں بتاؤں گا کہ تمہیں حیاتِ جاوید اور مملکتِ لایبلیٰ کس طرح مل سکتی ہے۔ قرآن میں ہے کہ ہمیشہ زندہ رہنے کی تمنا انسان کے آب و گل میں ہے۔ یہ حیاتِ جاوید چاہتا ہے۔ کبھی مرنا نہیں چاہتا۔ اور صرف یہی نہیں کہ زندہ رہنا چاہتا ہے بلکہ زندگی میں ایسا سامانِ عشرت بھی چاہتا ہے جسے کبھی زوال اور فنا نہ ہو۔ ابلیس نے آدم کی اسی ہوسِ عیشِ جاودانی سے فائدہ اٹھایا اور اسے کہا کہ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۔ (۲۰/۱۲۰) کیا میں تجھے اس درخت کا پتہ دوں جس کا پھل کھانے سے تمہیں حیاتِ جاوید مل جائے گی اور ایسی مملکت حاصل ہو جائے گی جو تغیر پذیر نہ ہو۔ آدم اس کے جھکمے میں آگیا اور کہا کہ ہاں! میں ایسا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کا سراغ دے۔ ابلیس نے کہا کہ تو اپنی اولاد کے ذریعے ہمیشہ تک زندہ رہ سکتا ہے۔ لہذا، تو باقی نوعِ انسانی سے اپنا رشتہ منقطع کر کے اپنے اور اپنی اولاد کے لئے سب کچھ اکٹھا کرنے کی فکر کرتا رہ۔ قرآن کہتا ہے کہ اس سے انسانیت کی عالمگیر برادری، ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور ہر فرد اپنی اور اپنی اولاد کی فکر میں اس قدر مستغرق ہو گیا کہ مختلف افراد کے درمیان مفاد پرستی کی (WEDGES) حائل ہو گئیں۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲۰/۱۲۳)۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آدم کو بے کس اور بے بس، مایوس و ناامید نہیں رہنے دیا۔ اس سے کہا کہ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۔ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۳-۱۲۴) جب میری طرف سے تمہارے پاس پیغامِ ہدایت آئے تو جو اس راہ نمائی کی اتباع کرے گا تو نہ وہ بے راہ رو ہوگا اور نہ ہی زندگی کی شادابیوں سے محروم رہے گا۔ لیکن جو کوئی میرے ضابطۂ ہدایت سے اعراض برتے گا تو اس کی روزی تنگ ہو جائے گی اور قیامت کے دن وہ اپنے اعمال کے نتائج میں اندھا اٹھے گا۔ یعنی جو شخص خدا کے ضابطۂ قوانین کی اطاعت کرے گا اسے اس دنیا کی آسائشیں بھی نصیب ہوں گی۔ اور حیاتِ جاوداں بھی۔ اسے حال اور مستقبل، دنیا اور آخرت دونوں میں سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب ہوں گی۔ اس حقیقت کو اقبالؔ نے اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ

ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا

یہ قرآن کی تعلیم کا ماحصل اور اقبالؔ کے پیغام کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ یعنی فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ اس دنیا میں خوشگواریوں کی زندگی اور اس کے بعد کی زندگی میں عیشِ جاوداں۔ اس کا نام "زمین و آسمان" کی برکات ہیں جو وحیٔ خداوندی کی اتباع سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہی اقبال کا پیغام ہے۔

پیرِ گردوں با من ایں اسرار گفت — از ندیماں رازہا نتواں نہفت

مجھے "آسمان" نے یہ راز بتائے ہیں۔ میں نے انہیں قرآن سے حاصل کیا ہے۔ میری فکر کا سرچشمہ وحیٔ خداوندی ہے جو کتاب اللہ کے اندر محفوظ ہے۔ ان رازوں کو جو مجھ پر اس طرح عیاں ہوئے ہیں، اپنے ہم فکر و ہم مشرب احباب سے چھپایا نہیں جا سکتا۔ اس مثنوی میں انہی سربستہ رازوں کو بے نقاب کیا جائے گا۔

حیاتِ جاوداں
ابلیس کے نزدیک اولاد کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔
لیکن
قرآن کا جواب
اس سے مختلف ہے۔
یہ جواب
ابلیس و آدم
میں ملاحظہ کیجئے
صفحات ۳۷۶
قیمت آٹھ روپے

عورت کا قرآن

(۱۵)

(۴) اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا
یُفْتَنُوْنَ ۰ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ
صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ ۰ (عنکبوت رکوع ۱)

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ صرف اتنا کہنے ہی پر کہ "ہم ایمان لے آئے" وہ چھوٹ جائیں گے؟ اور انہیں آزمایا نہ جائے گا؟ اور ہم تو ان لوگوں کو بھی آزما چکے ہیں جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں سو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو نکھار کر رہیگا جو سچے تھے اور وہ جھوٹوں کو بھی نکھار کر رہے گا۔

(۵) یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ
وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۰ وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ
جِھَادِہٖ ھُوَ اجْتَبٰکُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ
حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰھِیْمَ ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ
(حج رکوع ۱۰)

اے مسلمانو! تم احکام الٰہی کے آگے جھکے ہوئے اور سجدہ ریز رہو۔ پروردگار کی اطاعت کیا کرو۔ اور نیک کام کیا کرو۔ امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے اور اللہ کے کاموں میں خوب کوشش کیا کرو جیسی قدر کہ کوشش کرنے کا حق ہے اللہ نے تم کو ممتاز فرمایا اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی۔ تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر قائم رہو۔ اس نے تمہارا لقب مسلمان رکھا۔

(۶) اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۔ (آل عمران ع)

بلاشبہ اللہ کے نزدیک "دین" "صرف" "اسلام" ہی ہے۔

(۷) وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ
فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (آل عمران رکوع ۹)

اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

(۸) قُلْ اِنَّنِیْ ھَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ج دِیْنًا
قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا ج وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ
قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ
الْعٰلَمِیْنَ ۰ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ج وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا
اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (انعام ع ۲۰)

کہدو کہ مجھ کو میرے رب نے ایک سیدھا راستہ بتلا دیا ہے کہ وہ ایک دین ہے مستحکم۔ جو ملت ہے ابراہیم کی جو ہر غیر اللہ سے اپنا منہ موڑ چکے تھے۔ اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔ کہدو کہ بلاشبہ میری صلوٰة اور میری ساری اطاعت اور میرا جینا، اور میرا مرنا سب خالص اللہ ہی کے لئے ہے جو سارے جہان کا پرورش کرنے والا ہے۔ اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے اور میں سب ماننے والوں میں سے پہلا مسلمان ہوں۔

(۹) اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (حجرات ع ۲)

خدا کے نزدیک وہی معظم و مکرم ہے جو سب سے زیادہ خدا کے قوانین سے ہم آہنگ ہو۔

(۱۰) رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَا مِنْ
لَّدُنْکَ رَحْمَةً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ ۰
(آل عمران رکوع ۱)

اے پروردگار ہمارے دلوں کو کج نہ کیجئے بعد اس کے کہ تو ہم کو ہدایت کر چکا ہے اور ہم کو اپنے پاس سے رحمت عطا فرمایئے کہ بلاشبہ تو بڑا ہی عطا فرمانے والا ہے۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً
وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (بقرہ رکوع ۲۵)

اے پروردگار ہم کو مستقبل قریب میں بھی بہتری عنایت کیجئے اور انجام اور نتیجہ میں بھی بہتری دیجئے اور ہم کو النار کے عذاب سے بچایئے۔

(نوٹ)

زمن بر صوفی و ملا سلامے　　کہ پیغام خدا گفتند ما را
ولے تاویل شان در حیرت انداخت　　خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

"اسلام" جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم لائے اور جو "قرآن میں ہے، مذہب نہیں بلکہ "دین" ہے اور بہت ہی سادہ، فطری اور ہمیشہ باقی رہنے والا۔ "مذہب" چند رسومات کو ادا کر دینے کا نام ہے۔ "اسلام" کو رسومات اور ان کی ادائیگی سے ذرہ برابر بھی تعلق نہیں "اسلام" تو "دین" ہے یعنی ایک قانون، ایک آئین۔ ایک دستور اور ایک نظام۔ اسی لئے نظام اسلامی، نہایت سیدھے سادے اصول پر قائم اور آئینۂ فطرت کی طرح صاف اور شفاف ہے۔ اس میں کہیں کثافت نہیں۔ ٹیڑھ نہیں۔ سلوٹ نہیں۔ جھول نہیں۔

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ (ملک ع)

جن چیزوں کے اندازے خدا نے مقرر کر دیئے ہیں ان میں کہیں نقص و تفاوت نہیں ہوا کرتا۔

فَارْجِعِ الْبَصَرَ ھَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ (ملک ع)

جدھر جی چاہے نگاہ اٹھا کر دیکھ لو۔ کہیں کسی گوشے اور کونے میں بگاڑ نظر نہیں آئے گا۔

ایک بار نہیں بار بار نگاہ اٹھا کر دیکھو۔

یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّھُوَ حَسِیْرٌ (ملک ع)

ہر بار نگاہ ناکام و نامراد کاسۂ چشم میں لوٹ آئے گی اور کہیں کوئی الجھاؤ نہیں پائے گی۔

جس قدر الجھاؤ اور پیچیدگیاں، جتنی دشواریاں اور پریشانیاں، جس قدر اختلافات و نزاعات، جتنی فرقہ بندیاں اور گروہ سازیاں ہیں سب ہماری پیدا کردہ ہیں۔ اور یہ پیدا کیونکر ہوئیں؟ اس لئے کہ "اسلام" کو "دین" کے بجائے "مذہب" بنا دیا گیا۔ ہمارے علماء نے اسلام کی اس سادگی کو باقی نہ رہنے دیا جو وہ لے کر آیا تھا مگر یہ داستان ہے جگر خراش اور قصہ ہے الم انگیز لہذا ذرا تفصیل سے بتانے کی فرصت ہے تاکہ سمجھ میں آئے کہ "اسلام" کیا تھا یا کیا ہے اور مسلمانوں نے اس کو کیا بنا دیا یا کیا سمجھا جاتا ہے؟ اور ایسا کیوں ہوا؟

مقام حدیث
حدیث کے متعلق پوری تفصیل
جلد اوّل
جلد دوم
قیمت فی جلد چار روپے

گفتگوئے خداوندی کے تین طریقے

(ابن آدم)

سورہ شوریٰ کے پانچویں رکوع میں ایک آیت مع ترجمہ سنئے:۔

ماکان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیاً او من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ ما یشاء انہ علی حکیم

اور کسی بشر کی (حالت موجودہ میں) یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرمادے مگر (تین طریق سے) یا تو الہام سے یا حجاب کے باہر سے یا کسی فرشتے کو بھیج دے وہ خدا کے حکم سے جو خدا کو منظور ہوتا ہے پیغام پہنچا دیتا ہے۔ وہ بڑا عالی شان ہے اور بڑی حکمت والا بھی ہے (ترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ)

تمام مترجمین نے تقریباً اسی قسم کے ترجمے کئے ہیں اور سارے مفسرین کی تفسیریں اسی نوعیت کی ہیں۔ جن کا خلاصہ یوں ہے کہ کلام الٰہی کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) ایسی بلاواسطہ وحی ہو جس میں نہ کوئی آواز ہو۔ نہ کوئی رویت ہو۔ بس دل میں خود بخود اللہ کی طرف سے ایک بات ڈال دی جائے۔

(۲) پس پردہ گفتگو ہو جیسے سیدنا موسیٰ سے گفتگو ہوئی تھی

(۳) کوئی فرشتہ بھیج دیا جائے اور وہ وحی کرے۔

ہمیں اس تفسیر میں جو سقم نظر آتا ہے وہ یہ ہے

(الف) مفسرین و مترجمین کے کہنے کے مطابق یہ تینوں صورتیں ایسی ہیں۔ جو صرف انبیاء کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور صورت حال یوں ہے کہ آیت زیر بحث میں نبی و رسول سے گفتگو کرنے کا ذکر نہیں بلکہ عام نوع بشر سے گفتگو کرنے کا ذکر ہے۔ لفظ آیت ہے ماکان لبشر ان یکلمہ اللہ الا الخ یعنی کسی بشر کے لئے یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے گفتگو کرے مگر ان تین طریقوں سے الخ

(ب) وحی کا جو بھی طریقہ ہوگا۔ وہ من وراء حجاب (پس پردہ) ہی ہوگا۔ اس لئے اسے کلام الٰہی کی دوسری متغائر قسم قرار دینا سمجھ میں نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ جس طرح کسی کے سامنے نہیں آتا۔ اور اس کی عینی رویت نہیں ہوتی (لاتدرکہ الابصار) اسی طرح اس کی گفتگو کی آواز بھی کوئی نہیں ہوتی۔ جسے کان سن سکیں یہ خواہ مخواہ فرض کر لیا گیا ہے کہ سیدنا موسیٰ نے کوئی ایسی آواز سنی تھی۔ جس کا کوئی ادا کرنے والا پس پردہ چھپا ہوا تھا یعنی قول اور لحن نے آواز نے۔ مدرکات یعنی دسماعی وغیرہ سب کا تعلق مادیات سے ہے اور اللہ مادیت سے وراء الورا ہے۔ حضرت موسیٰ پر اسی طرح وحی ہوتی تھی۔ جس طرح دوسرے انبیاء پر ہوتی رہی۔ اس آیت سے بھی اس کی حقیقت کی تائید ہوتی ہے کہ

(۴:۱۶۳)

انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ

اے رسول ہم نے آپ کی طرف ایسی طرح وحی بھیجی جس طرح نوح اور ان کے بعد والے نبیوں کی طرف وحی کی

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا نوح کے بعد والے انبیاء پر جن میں سیدنا موسیٰ بھی ہیں وحی اسی طرح آتی رہی۔ جس طرح حضور پر آتی اور یہ سب کے سب من وراء حجاب ہی تھی خواہ براہ راست دل میں بات ڈال دی جائے۔ خواہ کوئی فرشتہ وحی لائے یا کوئی خواب اس کا ذریعہ ہو کچھ بھی ہو کلام خداوندی بہرحال پس پردہ ہی ہوگا۔ نہ اس کی صورت دکھائی دے گی۔ نہ آواز سنائی دے گی۔ وحی کی جتنی قسمیں بھی ہو سکیں۔ وہ سب اسی ایک ہی قسم میں داخل ہیں۔ جیسے "وحیاً" کہا گیا ہے۔ اور من وراء حجاب یقیناً اس سے الگ کوئی شے ہونی چاہیئے۔ کیونکہ ایسی وحی کوئی بھی نہیں جو من وراء حجاب نہ ہو۔

(ج) رسول کا لفظ بمعنی فرشتہ بھی قرآن میں آیا ہے۔ اس سے انکار نہیں۔ لیکن یہاں رسول کو خواہ مخواہ بمعنی فرشتہ لینے کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔ اگر رسول بمعنی رسول نہ لئے جا سکیں۔ پھر تو اسے بمعنی فرشتہ مان لینے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن آخر اسے (تمثیٰ بمعنی قَلادَرَہُ کی طرح) کیوں بمعنی فرشتہ لیا جائے؟ ایک قریب معنی کو چھوڑ کر بعید معنی کیوں لئے جائیں؟ علاوہ ازیں کلام خداوندی کی یہ تیسری قسم یعنی بذریعہ فرشتہ پیغام بھیجنا تو خود پہلی قسم وحیاً میں داخل ہے یہاں وحی کی نوعیتیں نہیں بتائی جارہی ہیں۔ جس کی یہ تین تقسیمیں ہوں۔ یہ خداوندی گفتگو کی تین قسمیں بتائی جارہی ہیں۔ فرشتے کا پیغام خداوندی پہنچانا بھی وحی ہی ہے۔ اور پہلی قسم وحیاً سے کوئی متغائر شے نہیں۔

اگر یہ تینوں شکلیں وحی کی ہوں تو لفظ وحیاً کو بالکل محدود معنی میں لینا پڑے گا۔ یعنی ایسی وحی جو بلا آواز اور بلا واسطہ جبریل ہو۔ اس کی دوسری قسم وہ ہوگی جس کی صرف آواز آئے اور تیسری یہ کہ جبریل آکر وحی پہنچا جائیں۔ حالانکہ قرآن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم قرآن تو بواسطہ جبریل ہی آیا ہے۔

(۲:۹۷)

قل من کان عدوا لجبریل فانہ نزلہ علی قلبک باذن اللہ

پوچھو کہ جبرئیل کا کون دشمن ہے۔ اس نے تو قرآن کو آپ کے دل میں بحکم الٰہی اتارا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے وحی جب آئی تو بواسطہ جبریل ہی آئی۔ لہٰذا یہ کوئی تیسری قسم نہیں بن سکتی جو وحیاً اور من وراء حجاب سے متغائر ہو۔

ان تمام اسقام کو دیکھتے ہوئے مفسرین کی یہ تفسیریں ہمیں مطمئن نہیں کر سکیں لہٰذا ہم جو کچھ سمجھ سکے ہیں۔ لیکن یہ واضح رہے کہ یہ ہماری فقط ایک کوشش ہے حرف آخر نہیں ہے — وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر بشر سے کلام یا باتیں کرتا ہے لیکن وہ مادیت سے بالکل وراء الورا ہے لہٰذا نہ اس کی کوئی شکل و صورت ہے جو وہ سامنے آئے۔ اور نہ اس کے کام و دہن اور زبان و لب ہیں جن کے انفعال و جنبش سے کوئی صوت مسموع خارج ہو سکے۔ بایں ہمہ وہ اپنے بندوں سے باتیں کرتا ہے۔ وہ کس طرح؟ وہ یوں کہ

(۱) یا تو وہ وحی کرتا ہے جو انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔

(۲) یا پس پردہ باتیں کرتا ہے۔ اس میں انبیاء اور غیر انبیاء سب افراد بشر داخل ہیں (تشریح ابھی آتی ہے)

(۳) یا کسی حامل وحی پیغمبر کو بھیجتا ہے۔ اور وہ بتاتے ہیں کہ خدا یہ فرماتا ہے۔ یہ صرف غیر انبیاء کے لئے ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ خاص بندوں (انبیاء) سے وہ بلا کسی انسانی واسطے کے باتیں کرتا ہے اور عام بندوں (غیر انبیاء) سے بواسطہ انسان یعنی بواسطہ انبیاء۔ ان دو قسموں کے علاوہ الٰہی گفتگو کا ایک اور انداز بھی ہے جو پس پردہ ہوتا ہے۔ اس میں انبیاء و غیر انبیاء کا کوئی امتیاز نہیں۔ خدا کا یہ طرز کلام سب کے لئے عام ہے۔ ہر وہ شخص جو عقل و شعور یا قوت تمیز رکھتا ہو اس سے خدا بولتا ہے اور بولتا رہتا ہے — نیلی نیلی گھٹائیں چمک کے ساتھ دکھائی دے رہی ہیں اور ہوا کے خنک جھونکے آرہے ہیں۔ لہٰذا طوفان باد و باراں سے بچنے کا انتظام کر لو۔ نبض کا نظام بگڑ چکا ہے۔ لہٰذا اب مریض چند گھڑی کا مہمان ہے وصیت نامہ لکھوالو۔ شدید معاشی بحران ہے۔ لہٰذا ایک انقلاب آنے والا ہے عام اخلاقی حالت بگڑ چکی ہے۔ اس لئے کوئی خاص آفت آئے گی۔ نسلی و وطنی تعصبات انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔ اس لئے جنگی تصادم سے مفر نہیں۔ فلاں قوم بے حد مظلوم ہو چکی ہے۔ اس لئے اس میں کوئی انقلابی لیڈر ظاہر ہوگا۔ اس درخت پر چیلوں نے بیٹھنا چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے اب یہ درخت گرنے والا ہے، چیونٹیاں اپنے انڈے نکال کر لئے جارہی ہیں۔ لہٰذا بارش ہونے والی ہے — یہ ساری باتیں خدا کی خاموش گفتگو ہیں جو ہر وقت اپنے بندوں سے وہ کرتا ہے۔ لیکن آثار و علامت کے پردے میں (من وراء حجاب) ان کی کوئی زبان نہیں کوئی آواز نہیں ہوتی۔ کوئی پیغمبرانہ وحی نہیں ہوتی۔ کوئی فرشتہ نہیں آتا۔ مگر جو جتنا زیرک ہوتا ہے۔ اتنی ہی جلد اور اتنا ہی صحیح فیصلہ کا نتیجہ نکال لیتا ہے۔ بے عقل انسان کہتا ہے کہ لولا یکلمنا اللہ (۲:۱۱۸) خدا ہم سے خود براہ راست باتیں کیوں نہیں کرتا؟ وہ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ارنا اللہ جہرۃ ہمیں خدا کی ذات عیاں دکھا دو۔ اس کا جواب خدا یوں دیتا ہے کہ وہ نہ دیکھنے کی چیز ہے نہ سننے کی۔ دیکھنا چاہو تو کائنات کے ایک ایک ذرے میں دیکھ سکتے ہو۔ لیکن اس طرح نہیں جس طرح کسی مادی چیز کو دیکھتے ہو۔ اور سننا چاہو ہر وقت سن سکتے

سلسلہ تاریخ ماضی کا پتہ بھی اسی خاموش کلام الٰہی سے چلتا ہے اور سائنس کے تمام اکتشافات میں بھی یہی کلام الٰہی مدد دیتا ہے۔ غرض تمام عقلی استدلالات و علامات خدا کی خاموش زبان ہیں۔ وحی کا کام یہ ہے کہ اس عقل کو بہکنے نہ دے اور ارتقائے عقلی میں سہارا دیتی ہے

ہو۔ لیکن اس طرح نہیں جس طرح کسی خطیب کا خطبہ یا موسیقار کی موسیقی سنتے ہو۔ بلکہ وحی کے الفاظ ہم یا عقل کے کانوں سے۔ قرآنی پیغام وحی وعقل کے تخالف کا قائل نہیں۔ بلکہ یہ دونوں میں توافق پیدا کرتا ہے۔ عقل کو وحی کا ہم آہنگ کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ وحی ہوتی ہی ہے۔ عقل کو سہارا دینے کے لئے۔

اب ہم اس تفسیر کی روشنی میں آیت کا ترجمہ یوں کر سکتے ہیں۔

کسی بشر کے لئے یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالےٰ اسے گفتگو بجز اس کے کہ بذریعہ وحی ہو

یا پس پردہ ہو یا کوئی رسول بھیجے جو باذن الٰہی وہ باتیں بتائے جو اللہ چاہے بلاشبہ

وہ برتر وحکیم ہے۔

یہاں علی وحکیم کے الفاظ بھی قابل غور ہیں بلند وبالا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ :-

اے برتر از قیاس وگمان وخیال ووہم — وز ہرچہ خواندہ ایم وشنیدیم وگفتہ ایم

پس جو علی یعنی ہمارے تمام قسم کے تصورات سے بالاتر ہو اسے دیکھنے یا سننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور حکیم کا مطلب یہ ہے کہ اس نے بندوں سے گفتگو فرمانے کے لئے تین طرح کے نہایت حکیمانہ طریقے رکھے ہیں۔

ایک الہامی

ایک عقلی

ایک دونوں سے بالاتر

پہلی قسم نبی اور غیرنبی دونوں میں مشترک ہے۔ بعض اوقات بغیر کسی منطقی استدلال اور بلا کسی عقلی ربط مقدمات کے دفعۃً حقیقت منکشف ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اور ایک خیال دل میں ڈال دیا جاتا ہے یہ بھی ایک خداوندی گفتگو ہے جو انبیاء کے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ قرآن پاک میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً

اذ اوحیت الی الحواریین ... (۵ : ۱۱۱) جب ہم نے حواریانِ مسیح کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔

واوحینا الی ام موسیٰ ... (۲۸ : ۷) اور ہم نے مادر موسیٰ (حضرت یوکبد) کے دل میں یہ ڈال دیا کہ موسیٰ کو سمندر میں ڈال دو۔

واوحینا الیہ لتنبئنھم ... (۱۲ : ۱۵) اور ہم نے یوسف کے دل میں (قبل از نبوت) یہ بات ڈال دی کہ تم اپنے بھائیوں کی حرکات سے انہیں مطلع کرو گے۔

یہ ساری باتیں ایسی ہیں جن کے لئے کشف وحدس سے زیادہ موزوں لفظ ہمارے پاس الہام ہے اس کے وجود سے انکار ممکن نہیں۔ اس کے لئے کوئی مناسب لفظ پیدا کر لیجئے۔ اس سے ہمیں بحث نہیں۔ اس وقت اس سے بھی بحث نہیں کہ دین میں اس کا مقام کیا ہے کہنا صرف یہ ہے کہ گفتگوئے خداوندی کا یہ بھی ایک طریقہ ہے جو نبی اور غیرنبی دونوں میں مشترک ہے۔

اسی طرح عقلی (من وراء حجاب) قسم کی گفتگوئے خداوندی بھی دونوں میں مشترک ہے ہاں یہ صحیح ہے کہ نبی اور غیرنبی کے الہام اور عقل دونوں کے مقام میں فرق ہے۔ اس کی تشریح اس وقت زیر بحث نہیں۔

تیسری قسم گفتگوئے خداوندی کی یہ ہے کہ عام بندوں تک بذریعہ رسول گفتگو کی جائے۔

ہماری یہ دوسری تفسیر بعض احباب کے لئے ممکن ہے قابل قبول نہ ہو۔ لیکن اسے رد کرنے کی معقول وجہ ہمارے پاس سردست موجود نہیں۔

طلوعِ اسلام سورۂ شوریٰ کی زیر نظر آیت کا جو مفہوم ہم سمجھ سکے ہیں، اسے ہم طلوعِ اسلام بابت مارچ ۱۹۵۴ء (کے باب المراسلات) میں لکھ چکے ہیں۔ مختصراً یہ کہ ہمارے نزدیک اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے ہمکلام ہونے کے دو طریقے بتائے ہیں۔ ایک انبیاء کرام کے ساتھ اور دوسرا غیرانبیاء کے ساتھ۔ انبیاء کے ساتھ ہمکلامی کا ایک طریقہ وحیاً ہے (یعنی دل میں امر الٰہی کا القاء کر دینا) اور دوسرا "من وراء حجاب" ہے (یعنی پس پردہ بات کرنا) غیرانبیاء سے اللہ تعالےٰ صرف اپنے رسولوں کی معرفت بات کرتا ہے۔ براہ راست بات نہیں کرتا۔

"ابن آدم" نے "من وراءِ حجاب" سے مفہوم لیا ہے۔ نظام کائنات پر غور وفکر کے بعد یہ سمجھ لینا کہ یہاں خدا کا قانون کس طرح کام کر رہا ہے۔ بظاہر بات تو بہت جچی تلی ہوئی۔ لیکن یہ مفہوم قرآن کے بنیادی اصول کے خلاف جاتا ہے۔ اس لئے ہمیں اس سے اختلاف ہے۔

قرآن کی رو سے ایک چیز ہے خدا کا بندوں سے کلام کرنا۔ اور دوسری چیز ہے بندوں کا عقل وفکر کی رو سے خدا کی باتوں کو معلوم کرنا۔ دونوں میں بنیادی فرق ہے۔ جب خدا بندوں سے کلام کرتا ہے تو وہ حتمی اور یقینی بات ہوتی ہے۔ جس میں ظن وقیاس، شک وشبہ اور ابہام و التباس کا کوئی شائبہ تک نہیں ہوتا۔ یہ چیز اس وحی کے ساتھ مخصوص ہے۔ جو انبیاء کی طرف ہوتی ہے، لیکن جب انسان، اپنی عقل کی رو سے، مظاہر فطرت پر غور کر کے، خدا کی باتوں کو معلوم کرتا ہے۔ تو اس میں ظن وقیاس، شک وشبہ، اور ابہام اور التباس کا امکان ہوتا ہے عقل کا طریق استدلالی اور تجرباتی ہے، اس لئے وہ براہِ راست انکشافِ حقیقت نہیں کر سکتی۔ وحی اور بصیرتِ انسانی کا یہی وہ بنیادی فرق ہے۔ جو انسانوں کو انبیا اور غیرانبیا میں تقسیم کرتا ہے لہٰذا یہ کہنا کہ نیلی نیلی گھٹاؤں اور ہرے ہرے پتوں کے پردوں کے پیچھے سے خدا صاحبانِ عقل وفکر سے باتیں کرتا ہے شاعرانہ اسلوب بیان تو ہو سکتا ہے۔ حقیقت پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ انسان ان گھٹاؤں اور پتوں کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت کو معلوم کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ لیکن خدا انسان سے باتیں صرف وحی کے ذریعے کرتا ہے جو انبیا پر آتی تھی۔

"ابن آدم نے کہا ہے کہ وحی کے دو طریقے تسلیم کرنا۔ (یعنی ایک طریقہ یہ کہ خدا نبی کے دل میں حقیقت کا القاء کر دیتا ہے۔ اور دوسرا طریقہ یہ کہ نبی خدا کی باتیں سنتا ہے) صحیح نہیں انبیاء کرام پر وحی کس طرح ہوتی تھی۔ اس کی ماہیت کیا تھی؟ اس کی نوعیت کیا تھی۔ یہ وہ باتیں ہیں۔ جنہیں کوئی غیرنبی جان ہی نہیں سکتا۔ لیکن جب خود خدا نے حضرت موسیٰؑ کے متعلق ایک جداگانہ طریقہ کا ذکر کر دیا ہے تو ہمارے لئے اس کے صحیح ماننے میں کون سے شبہے کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ "ابن آدم" نے سورۂ نساء کی آیت کا صرف اتنا حصہ نقل کیا ہے۔ انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ (۴ : ۱۶۳)، لیکن ان مختلف انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں یہ بھی تو کہا گیا ہے کہ وکلم اللہ موسیٰ تکلیما (۴ : ۱۶۴)، اگر کما اوحینا سے مراد "وحی کا طریق" تھا (اور وہی طریقہ حضرت موسیٰ کے لئے بھی اختیار کیا گیا تھا) تو حضرت موسیٰ کو باقیوں سے الگ کر کے یہ کہنا کہ وکلم اللہ موسیٰ تکلیما (معاذ اللہ) بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ خدا کی ہر وحی (جو کسی نبی پر ہوئی ہو) کلام اللہ ہے (اور قرآن اس پر شاہد ہے) لیکن طریق وحی کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ سے کلام کا ذکر خصوصیت سے آیا ہے۔ لہٰذا اس طریق میں کوئی بات تو ایسی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کے خصوصی تذکرہ کی ضرورت سمجھی گئی۔

باقی رہا یہ کہنا کہ آواز ایک طبعی یا مادی شے ہے۔ جس کی نسبت خدا کی طرف نہیں کی جا سکتی تو گذارش ہے کہ کلام (یا الفاظ) کا تعلق بھی مادیات سے ہے۔ اس کی نسبت بھی خدا کی طرف کیسے کی جا سکتی ہے؟ بات یہ ہے کہ آواز ہو یا الفاظ۔ جب ان چیزوں کی نسبت انسانوں کی طرف ہو گی تو ان سے مفہوم مادی آواز اور الفاظ ہوں گے۔ لیکن جب ان کی نسبت خدا کی طرف ہو گی تو یہ چیزیں مادیات سے ماوراء ہو جائیں گی۔ جس طرح ہم یہ نہیں جان سکتے کہ وحی کے الفاظ کس طرح قلب نبی پر القاء کئے جاتے تھے۔ اسی طرح ہم یہ بھی نہیں سمجھ سکتے کہ انبیاء "خدا کی آواز" کس طرح سنتے تھے

اب رہی "ابن آدم" کی دوسری تفسیر کہ ایک چیز ہوتی ہے وحی (جو صرف انبیاء سے مختص ہوتی ہے) اور ایک چیز ہوتی ہے الہام (جس میں نبی اور غیرنبی دونوں شریک ہوتے ہیں) تو اس کی بابت ہم مقام حدیث (جلد اول) کے آخری باب (نیز طلوعِ اسلام بابت مارچ ۱۹۵۴ء۔ باب المراسلات) میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ اگر الہام سے مراد یہ ہے کہ خدا انسان سے براہِ راست کلام کرتا ہے تو یہ تصور قرآن کے یکسر خلاف اور ختم نبوت کی نقیض ہے۔ خدا انسانوں سے صرف وحی کے ذریعہ کلام کرتا ہے۔ انبیاء کو وحی خدا کی طرف سے براہِ راست ملتی ہے اور غیرانبیا تک یہ وحی انبیاء کی وساطت سے پہنچتی ہے۔ وحی آخری مرتبہ نبی اکرمؐ پر آ گئی۔ اب (حضور کے بعد) خدا، انسانوں سے صرف قرآن کے ذریعے باتیں کرتا ہے: اس کے علاوہ خدا سے ہمکلامی کا کوئی اور طریق نہیں۔ کشف والہام کا عقیدہ مہر نبوت کو توڑنے کے لئے وضع کیا گیا تھا اور یہی وہ کھڑکی ہے جس کے راستے کاذب مدعیانِ نبوت امت کے لئے وجہ غارت گری دین و دانش بنتے رہے ہیں۔

حدس اور الہام میں بڑا فرق ہے حدس (INTUITION) کو کہتے ہیں۔ اور اس کے متعلق برگساں کا قول ہے (جو INTUITION کا بہت بڑا حامی ہے) کہ یہ عقل (INTELLECT)

ہی کے ایک اعلیٰ درجہ کا نام ہے۔ انسان کے دل میں بیٹھے بیٹھے یونہی ایک خیال آجاتا ہے۔ اور وہ بعض اوقات ٹھیک بھی نکل آتا ہے۔ اسے حدس کہتے ہیں۔ خیال کے متعلق ابھی انسانی علم بڑا سطحی سا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس میں انسان کے شعور کا کس قدر دخل ہوتا ہے اور لاشعور کا کس قدر۔ جس خیال میں شعور کا عنصر غالب ہو۔ اس کے متعلق ہم کہہ دیتے ہیں کہ وہ ہماری عقل (REASON) کا تخلیق ہے۔ لیکن جس خیال میں لاشعور کا عنصر زیادہ ہو تو اسے ہم حدس سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ شعور اور لاشعور کی یہ تفریق و تحدید بھی ہنوز اپنے ابتدائی مراحل میں ہے۔ نہ جانے آگے چل کر اس کے متعلق بھی کیا کیا انکشافات ہوں گے۔ لہٰذا حدس کے متعلق یہ سمجھنا کہ یہ الہام ہے۔ یعنی خدا کا بندے سے ہمکلام ہونا' درست نہیں ہے۔ حدس میں تو کافر و مومن اور مشرک و موحد کی بھی تمیز نہیں ہوتی۔ وہ کون سا انسان ہے جس کے دل میں یونہی بیٹھے بیٹھے کوئی خیال نہیں آجایا کرتا؟ تو کیا اس چیز کے متعلق بھی سمجھا جائے کہ یہ خدا کی طرف سے انکشافِ حقیقت ہوا ہے۔ (اسی طرح جس طرح انبیاء پر انکشافِ حقیقت ہوا کرتا تھا) لہٰذا سورۂ شوریٰ کی زیر نظر آیت میں الہام کا کوئی ذکر نہیں۔ خدا سے براہِ راست انکشافِ حقیقت کا دروازہ بند ہو گیا (اسے ختم نبوت کہتے ہیں) اب انسانوں کے پاس خدا کا کلام قرآن کے اندر ہے۔ اس کے علاوہ ذریعہ علم عقل ہے۔ قرآن کی روشنی اور عقل کی آنکھ ان دونوں سے مل کر جو علم حاصل ہو، وہی حقیقت ہے۔ باقی افسانے ہیں۔ خواہ وہ مغرب کے انکشافات ہوں یا مشرق کے الہامات (اس ضمن میں بہتر ہو کہ دسمبر ۱۹۵۴ء میں شائع شدہ "سلیم کے نام خط" بھی ملاحظہ کر لیا جائے۔ جس میں تصوف کی حقیقت اور ماخذ سے بحث کی گئی ہے)۔

آپ طلوعِ اسلام کی مدد کیسے کر سکتے ہیں

اپنے احباب کو طلوعِ اسلام کا خریدار بنایئے
اپنے شہر میں طلوعِ اسلام کی ایجنسی قائم کیجئے
کسی مقامی ایجنٹ کو تیار کیجئے کہ وہ طلوعِ اسلام کا لٹریچر منگائے۔
اپنے علاقے سے طلوعِ اسلام کے لئے اشتہار مہیا کیجئے۔

طلوعِ اسلام کا دفتر

۲۳/۱ فاؤلرز لائن نپیئر بیرکس میں واقع ہے صدر کی طرف سے آنیوالے حضرات نپیئر بارکس میں داخل ہو کر بجائے سیدھے جناح اسپتال جانے کے بائیں ہاتھ ڈرگ روڈ کی طرف مڑ جائیں تو تھوڑے فاصلہ پر بائیں ہاتھ کو پی ڈبلیو ڈی کے انکوائری آفس کے عقب میں طلوعِ اسلام کا دفتر ہے۔ اسی دفتر میں ہر اتوار کو صبح ۸ بجے محترم پرویز صاحب قرآن پر لیکچر دیتے ہیں۔

وِراثت و وصیّت

محترم عبدالماجد صاحب دریابادی کے اخبار صدق (بابت ۳۰ مئی ۱۹۵۵ء) میں حسب ذیل استفسار اور اس کا جواب شائع ہوا ہے۔

"اب تک تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث قرآن کے خلاف نہیں ہیں۔ لیکن ادارہ طلوع اسلام کراچی کی شائع کردہ ایک کتاب میں مندرجہ ذیل عبارت کو پڑھ کر تعجب ہوا امید ہے کہ جناب صدق جدید کے صفحات میں اظہار خیال فرمائیں گے۔

"مقام صد حیرت ہے کہ مسلمانوں کا "مسلمہ" قانون وراثت کس قدر قرآن کے خلاف ہے اور یہ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ قانون وراثت ہم میں صدیوں سے چلا آرہا ہے اس پر سوائے اس کے کہ انسان سر پکڑ کر بیٹھ جائے اور کیا کرے۔ اس قانون میں یا تو سرے سے وصیت کی اجازت ہی نہیں۔ اور اگر اجازت ہے تو صرف تہائی مال میں اور وہ بھی وارثین کے لئے نہیں اور یا للعجب! کہ اس قانون کو منسوب کیا جاتا ہے اس ذات گرامی کی طرف جس کی حیات طیبہ کا ایک ایک سانس قرآن کی اتباع میں گزرا اور یہ صرف اس لئے کہ بدقسمتی سے ہمارے مجموعہ روایات میں کسی طرح سے دو چار روایتیں اس قسم کی شامل ہو گئیں۔ اب رواۃ پرستی کا تقاضا تھا کہ ان روایات کو صحیح سمجھا جائے خواہ اس سے قرآن کریم کے صریح احکام کی مخالفت ہی کیوں نہ ہوتی ہو۔ اور خواہ اس سے حضور صاحب قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) کی ذات اقدس پر بھی طعن کیوں نہ آئے آپ اس کا خیال بھی کر سکتے ہیں کہ قرآن کریم وصیت کو فرض قرار دے اور بلا شرط یعنی پورے مال میں وصیت کا حق دے (اور اس کی تاکید کرے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمائیں کہ نہیں یہ وصیت صرف ایک تہائی مال میں ہو سکتی ہے۔ اور وہ بھی غیر وارثین کے لئے۔ خدا کے حکم میں ایسا رد و بدل یقیناً رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان اقدس کے سخت خلاف ہے۔ لیکن با ایں ہمہ ہمارے یہاں یہ قانون موجود ہے اور صدیوں سے اس پر امت کا عمل ہوتا چلا آرہا ہے"۔

ابو البقا از خانپور۔ ریاست بہاولپور (پاکستان)

صدق | بات صاف اور سیدھی سی ہے۔ انکار حدیث کے پروپیگنڈے نے لے خواہ مخواہ ایک "مہیب" مسئلہ کی شکل دے دی ہے۔

قرآن مجید کے دو مختلف موقعوں کی آیتوں میں دو مختلف حکم ملتے ہیں۔ پہلی آیت سورۃ البقرۃ (پ ۲) میں نمبر ۱۸۰ پر ہے اس میں حکم یہ ہے کہ قبل موت اپنے مال میں وصیت کر جاؤ۔ دوسری آیت سورۃ النساء (پ ۴) میں ۱۱ پر۔ اس میں حکم ہے کہ تمہارے ترکہ میں تمہارے وارثوں کے لئے فلاں فلاں حصہ مقرر ہیں۔ پہلے حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان آزاد ہے کہ اپنے ترکہ کے بارے میں جو ہدایتیں چاہے دے جائے۔ دوسرے حکم سے نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ آزاد نہیں۔ سب وارثوں کے حصہ متعین و مقرر ہیں۔ دونوں احکام بظاہر متضاد ہیں۔ پھر ان پر عمل کی کیا صورت ہو سکتی ہے!

صورت صرف یہ ہے کہ حکم سابق پر حکم مابعد کی روشنی میں اور اس کے ماتحت عمل کیا جائے۔ اور یہ مسلم ہے کہ وصیت والا حکم مقدم ہے اور میراث والا حکم اس سے متاخر۔ تو قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ وصیت اب بھی جائز رہے گی۔ لیکن اجراء احکام میراث کے بعد۔ حکم وصیت اصلاً اس وقت کے لئے تھا، جو نسبتاً آغاز اسلام کا دور تھا۔ اور احکام شریعت اس وقت تک مکمل نہیں ہوئے تھے۔

احکام کی اس عقلی ترتیب و تنظیم کو اسی رعایت تقدم و تاخر کو قدیم مفسرین اپنی اصطلاح میں ایک آیت کا دوسری آیت سے منسوخ ہو جانا کہتے ہیں۔ جس میں کوئی بات نہ تمسخر کی ہے نہ طنز و تعریض کی۔

اب رہا یہ کہ کل مال کے کتنے حصہ میں میراث جاری ہو گی اور کتنے میں وصیت چل سکے گی۔ شارع و شارح وحی کے فرائض میں اس کا بتانا داخل تھا۔ چنانچہ مستند راویوں کی شہادت سے معلوم ہوا کہ آپ نے وصیت کی صورت میں ۲/۳ حصہ میراث کے لئے رہنے دیا ہے۔ اور صرف ۱/۳ حصہ میں وصیت چلائی ہے۔ اور وصیت کا حکم بھی وجوبی نہیں اختیاری ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلعم نے کوئی مالی وصیت نہیں فرمائی۔

اس عادلانہ و حکیمانہ قانون کو خدا کے احکام میں رد و بدل سے تعبیر صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جن کے ہاں عین فقاہت و فہم سلیم کا نام "رواۃ پرستی" ہے اور جن کے ہاں دنیا کے مستند ترین تاریخی وثائق کی کائنات کل اتنی ہے کہ ہمارے مجموعہ روایات میں کسی طرح دو چار روایتیں اس قسم کی شامل ہو گئیں"۔

آپ نے محترم دریابادی صاحب کے جواب پر غور فرمایا (یاد رہے کہ انہوں نے قرآن کی تفسیر بھی لکھی ہے) ان کا کہنا یہ ہے کہ

(۱) قرآن نے پہلے کل ترکہ کے لئے وصیت کرنے کا حکم دیا اور اسے فرض قرار دیا۔

(۲) پھر ورثاء کے حصے مقرر کر دیئے۔

(۳) اس طرح قرآن میں دو متضاد حکم موجود ہو گئے۔ جن میں تطبیق کی کوئی صورت نہیں تھی۔

(۴) ان میں تطبیق کی صورت رسول اللہ نے پیدا کی یعنی آپ نے فرمایا کہ ۱/۳ مال میں وصیت کر دیا کرو (اور یہ محض اختیاری چیز ہے اور ورثاء کے لئے نہیں ہے) اور باقی ۲/۳ مال کو خدا کے مقرر کئے ہوئے حصوں کے مطابق تقسیم کر لیا کرو۔

(۵) اس طرح خدا کا دیا ہوا پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ اور اب عمل اس حکم پر ہو رہا ہے۔ جو رسول اللہ نے دیا تھا۔

یہ اس قرآن کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے۔ جس کا اعلان ہے

(اور اس اعلان کو یہ تمام مولوی صاحبان خود محراب و منبر سے گلا پھاڑ پھاڑ کر دہراتے رہتے ہیں) کہ اس کی تعلیم بے مثل و بے نظیر ہے۔ اور تمام دنیا کے انسان مل کر بھی اس کی ایک آیت (ایک حکم) کی مثل آیت نہیں بنا سکتے۔ اور ان حضرات کا یہ ارشاد ایسے حکم کے متعلق ہے۔ جو ایک اہم قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ جس کتاب میں (ان مولویوں کے کہنے کے مطابق) قوانین بھی اس انداز سے دیئے گئے ہوں، اسے کوئی صاحب ہوش ایک بے مثل و بے نظیر ضابطہ حیات ماننے کے لئے تیار ہوگا۔؟ اور آپ یہ بھی سوچئے کہ جس قرآن کے متعلق آپ کا عقیدہ یہ ہو کہ اس میں اس قسم کے احکام ہیں اس کی کس قدر عظمت و تقدیس آپ کے دل میں باقی رہ گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان مولوی صاحبان کے دل میں قرآن کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔

اب دیکھئے کہ قرآن نے اس باب میں ارشاد کیا فرمایا ہے اس کا حکم یہ ہے۔

(۱) كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (۲/۱۸۰)

تم پر فرض قرار دیدیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آ کھڑی ہو اور وہ مال چھوڑ کر مر رہا ہو تو وہ اپنے والدین اور دیگر اقرباء کے لئے وصیت کرے

ایسا کرنا متقیوں پر لازم ہے۔

یہ ہے ترکہ کے لئے وصیت کا حکم خداوندی، جس کے متعلق شروع میں کہا کہ یہ خود تم پر فرض ہے۔ اور پھر آخر میں مزید تاکید کے لئے کہا کہ ایسا کرنا تم پر لازم ہے۔ جو ایسا نہیں کرے گا وہ متقی نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ سورۂ مائدہ میں تفصیل طور پر بتایا کہ اس وصیت کے لئے گواہ بھی ہونے چاہئیں (۵/۱۰۶-۱۰۷)

(۲) سورۂ نساء میں جہاں والدین اور اقربین کے لئے ترکہ کے حصے مذکور ہیں وہاں صاف الفاظ میں لکھا ہے مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ (۴/۱۲)، یعنی جو وصیت مرنے والے نے کی ہو یا جو قرضہ اس کے ذمہ ہو۔ اس کے بعد جو باقی بچ جائیں۔ اس کے لئے یہ حصے مقرر کر دیئے گئے ہیں

(واضح رہے کہ قرآن نے ان دو آیتوں میں چار مرتبہ ان الفاظ کو دہرایا ہے کہ تقسیم مرنے والے کی وصیت اور قرضے کے بعد عمل میں آئے گی)

بات صاف ہے کہ اگر اس کی وصیت ایسی ہو جس سے پورا مال (COVER) نہ ہوتا ہو تو باقی ماندہ مال کی تقسیم کے لئے خود قرآن نے حصے مقرر کر دیئے (ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کی موت اچانک واقع ہو جاتی ہے اور اسے وصیت کرنے کا موقعہ ہی نہ ملے) اس صورت میں بھی قرآنی تقسیم کا حکم نافذ ہو جائے گا۔

اب آپ غور کیجئے کہ کیا قرآن کے یہ دو حکم ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ جو ان میں سے ایک کو منسوخ تسلیم کیا جائے یا ان میں تطبیق دینے کے لئے یہ کہا جائے کہ وصیت سے اللہ میاں کی مراد ⅓ مال میں وصیت ہے اور وہ بھی ورثا کے لئے نہیں، کیا یہ احکام ایک دوسرے کی تنسیخ کے لئے ہیں یا ایک حکم دوسرے کی تکمیل کر رہا ہے؟

دریابادی صاحب فرماتے ہیں کہ "یہ مسلم ہے کہ وصیت والا حکم مقدم ہے۔ اور میراث والا حکم اس سے متاخر۔ تو قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ وصیت اب بھی جائز رہے گی۔ لیکن اجراء احکام میراث کے بعد" یعنی اللہ تعالے کا ارشاد ہو کہ اجراء احکام میراث ہوگا مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ وصیت کے بعد۔ لیکن ہمارے یہ مفسرین قرآن فرماتے ہیں کہ نہیں کہ جو ترتیب اللہ میاں نے بتائی ہے وہ (معاذ اللہ) درست نہیں۔ درست (اور قدرتی نتیجہ کے مطابق) ترتیب یہی ہے کہ جسے ہم بیان فرما رہے ہیں۔ یعنی وصیت کا عملدرآمد ہوگا۔ اجرائے احکام میراث کے بعد۔

کتنا بڑا احسان ہے ان حضرات کا اللہ میاں پر کہ یہ اس کی (معاذ اللہ) غلط ترتیبوں کو درست کر دیتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ یہ تمام کشمکش۔ قرآنی آیات کی یہ تمام کھینچا تانی۔ اللہ میاں کے متعلق (معاذ اللہ) اس قسم کا تصور ناسخ و منسوخ کا جیسا کیکپا دینے والا عقیدہ، یہ سب کچھ کس بناء پر ہے؟ دو تین حدیثوں کی بناء پر جن میں لکھا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ وصیت صرف ایک تہائی مال میں ہو سکتی ہے۔ اور وہ بھی ورثا کے لئے نہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے۔ یہ حدیثیں خود رسول اللہ نے امت کو نہیں دیں۔ حضور کے خلفاء نے بھی نہیں دیں۔ حضور کی وفات کے دو تین سو سال بعد لوگوں نے اپنے طور پر ان باتوں کو جمع کیا۔ جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ رسول اللہ نے ایسا فرمایا تھا۔ یہ ہیں وہ روایات جن کی بناء پر قرآن جیسی کتاب عظیم کے متعلق یہ کچھ سمجھا اور کہا جاتا ہے۔ قرآن ہی کے متعلق نہیں بلکہ حضور نبی اکرمؐ کے متعلق بھی اس قسم کا عقیدہ رکھا جاتا ہے، کہ اللہ تعالے نے حکم دیا تھا کہ تم پورے ترکہ میں وصیت کرو۔ یہ تم پر فرض ہے اور رسول اللہ (معاذ اللہ) حکم دیتے تھے کہ نہیں تم صرف ایک تہائی مال میں وصیت کرو۔ اور یہ بھی لازمی نہیں اختیاری ہے جی چاہے کرو، جی چاہے نہ کرو۔

آخر میں ہمارے مفسر دریابادی صاحب فرماتے ہیں کہ خود رسول اللہ نے کوئی مالی وصیت نہیں فرمائی" (بلکہ ایک نٹ نوٹ میں اس بات کو ان الفاظ میں دہرایا ہے کہ "یہ اگر قرآن کا مقرر کیا ہوا "فرض" تھا۔ تو خود صاحب قرآن نے کس حد تک اس "فرض" کو ادا کیا؟ کونسی وصیت آپ اپنے مال کے متعلق فرما گئے"؟

جب یہ حضرات، ذات رسالتماب (فداہ ابی و امی) کے خلاف اس قسم کا طعن کرتے ہیں۔ تو ہم آپ کو بتا نہیں سکتے کہ ہم پر کیا گذرتی ہے۔ جی یہ چاہتا ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم اس ذات اقدس و اعظم کے متعلق اس قسم کے جگر پاش الفاظ سنیں جن کی حیات طیبہ کا ایک ایک سانس احکام خداوندی کی اطاعت و تبلیغ میں گذرا تھا۔ ہم اپنے کلیجے میں چھرا بھونک کر مر جائیں و کنت نسیاً منسیا۔ یہ دریابادی صاحب ہم سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ تمہارے رسول نے اس فریضہ خداوندی کو کس حد تک ادا کیا تھا؟

یہ بات کوئی پادری نند ر پوچھتا۔ کوئی ہماشے رامچندر پوچھتا تو ہمیں اتنا رنج نہ ہوتا۔ اسے پوچھتے ہیں حضرت مولانا عبد الماجد دریابادی، مفسر قرآن!

اے محمدؐ! گر قیامت را برآری سر ز خاک
سر برآر و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں!

حضرت مولانا! اگر آپ کا ایمان بالرسول اس کی اجازت دیتا ہے تو آپ بڑے شوق سے رسول اللہ کی ذات گرامی پر اعتراضات کرتے رہئے (تاکہ آپ کے معبود رواۃ پر کسی قسم کی زد نہ پڑنے) ہم (جو اس ذات گرامی کو انا اول المسلمین کے بلند ترین مقام پر فائز سمجھتے ہیں) ان اعتراضات کا جواب دیں گے، سنئے۔

قرآن نے جہاں وصیت کو فرض قرار دیا ہے تو یہ کہہ کر قرار دیا ہے کہ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا اگر تم مال چھوڑ کر مرو تو . . . . اور یہ ظاہر ہے کہ وصیت کرنا اس پر فرض ہوگا۔ جس کے پاس وصیت کے لئے مال ہوگا۔ اور رسول اللہؐ کے متعلق ابو داؤد کی حدیث میں ہے کہ

ما ترک رسول اللہ صلعم دیناراً ولا درهماً ولا بعيراً ولا شاة

رسول اللہ صلعم نے نہ دینار چھوڑا نہ درہم۔ اور نہ اونٹ اور نہ بکری۔

اس کے بعد فرمایئے کہ حضور وصیت کس مال کے لئے کرتے؟

واضح رہے کہ یہ حدیث اس تصور کے عین مطابق ہے جو قرآن نے ایک رسول (بلکہ جماعت مومنین) کی بلند ترین زندگی کے متعلق پیش کیا ہے (ہمارے دریابادی صاحب تو اس بات کو کیا سمجھیں گے ہم قارئین طلوع اسلام کے لئے یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن کی رو سے قرآنی معاشرہ جب اپنی تکمیل تک پہنچتا ہے۔ تو اس میں املاک جائداد اور مال و متاع کی انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے اس مقام پر پہنچکر وصیت اور وراثت کے احکام بھی پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یہ احکام عبوری دور سے متعلق ہیں جب وہ معاشرہ ہنوز اپنی تکمیل تک نہیں پہنچا تھا رسول اللہ کی زندگی اس معاشرہ کی انتہائی (تکمیل یافتہ) شکل کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ لہذا اس کے پاس کوئی مال و دولت نہیں ہوتا۔ اور وہ کھلے بندوں اعلان کرتا ہے کہ لا نورث ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ یہ چھوٹی موٹی روزمرہ کے استعمال کی چیزیں بھی) جو ہم چھوڑ جاتے ہیں تو وہ عام مسلمانوں کا حق ہوتی ہیں۔ ما ترکنا صدقة۔

یہ مولوی صاحبان: رسولؐ کا اپنے پر قیاس کرتے ہیں جو مال و دولت کے لئے رسول کی وصیت ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ انھیں کون بتائے کہ اتباع سنت کے معنی کیا ہیں اور بتایا نہیں کچھ اور ہیں۔

نوجوانوں کیلئے فکر و نظر کی
نئی راہیں
"سلیم کے نام"
از: پرویز

باب المراسلات

باذن اللہ تحصیل صوابی سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔ کہ سورۂ یونس میں ہے اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ وَمَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ (اے رسول) تو کیا لوگوں کو مجبور کردے گا حتیٰ کہ وہ ایمان لے آئیں (حالانکہ) کوئی شخص بغیر اذن خداوندی ایمان نہیں لاسکتا؟ سو اگر کوئی شخص خدا کے حکم کے بغیر ایمان نہیں لاسکتا۔ تو پھر کافروں کا کیا قصور ہے کہ انھیں جہنم کا عذاب دیا جائے؟ اگر خدا کا حکم ہوتا تو وہ ضرور ایمان لے آتے

طلوع اسلام اس میں شبہ نہیں کہ اگر اس آیت میں اذن کے معنی حکم یا اجازت کے لے جائیں۔ تو اس سے وہی مفہوم پیدا ہوتا ہے جو محترم مستفسر نے بیان کیا ہے اور اس مفہوم پر وہ تمام اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ جن کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے لیکن اذن کے معنی حکم یا اجازت نہیں بلکہ۔ قانون خداوندی کے ہیں۔ اس کی تائید خود قرآن سے ہوتی ہے۔ یہ ہم سب جانتے ہیں کہ بارش اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہوتی ہے سورج کی حرارت سے سمندر کے بخارات اٹھتے ہیں۔ چونکہ یہ بخارات ہوا سے ہلکے ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ اوپر چڑھ جاتے اور آگے کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ پھر جب وہ کسی ایسے خطہ میں پہنچتے ہیں جہاں فضا کی برودت (ٹھنڈک) زیادہ ہوتی ہے تو وہ بخارات دوبارہ پانی بن جاتے ہیں۔ اور پانی چونکہ ہوا سے بھاری ہوتا ہے اس لئے وہ نیچے کی طرف گرتا ہے اسے بارش کہتے ہیں۔ یہ سب ایک ایسے متعین قانون کے مطابق ہوتا ہے کہ آج ہوا کا محکمہ (METEOROLOGICAL DEPT) قبل از وقت بتا دیتا ہے کہ بارش کب اور کہاں ہوگی۔ اگر انسان کے اس اندازے میں کہیں غلطی ہوتی ہے تو وہ ان کی کوتاہی علم کا نتیجہ یا بعض اوقات ایسے غیر متوقع فضائی تغیرات کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جن کے متعلق پہلے اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ بارش خدا کے مقرر کردہ قانون طبعی کے مطابق ہوتی ہے۔ لیکن قرآن میں اس کے لئے اذن کا لفظ آیا ہے۔ سورۂ حج میں ہے وَیُمْسِکُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِہٖ (۲۲/۶۵) اور وہ (خدا) بارش کو روکے رکھتا ہے کہ وہ زمین پر نہ آگرے۔ بجز اس کے اذن کے۔ یعنی خدا کے مقرر کردہ قانون کے بغیر۔

اذن کا یہی مطلب سورہ یونس کی مذکورہ صدر آیت میں ہے۔ پوری آیت یوں ہے وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّھُمْ جَمِیْعًا۔ رسول اللہ کی بڑی آرزو تھی کہ تمام مخالفین ایمان لے آئیں۔ اور اس طرح اپنی غلط روش کی ہلاکت سامانیوں سے بچ جائیں۔ وہ ایک طبیب مشفق کی طرح ان لوگوں کے ایمان نہ لانے پر کڑھا کرتے تھے۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے فرمایا کہ تم اس کے لئے کبیدہ خاطر ہو کہ یہ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ اگر ہم چاہتے کہ تمام لوگ ایک ہی روش پر چلنے لگیں تو ہمارے لئے کیا مشکل تھا کہ ہم سب کو پیدا ہی اس طرح کرتے کہ وہ سب مومن ہوتے۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ ہم نے انسان کو ارادہ اور اختیار دیا ہے کہ وہ جو راست چاہے اختیار کرلے ہم اس کا یہ اختیار و ارادہ سلب نہیں کرنا چاہتے۔ اس لئے دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں۔ جب ہم نے ایسا نہیں کیا تو (اے رسول) تم بھی انھیں زبردستی مومن نہیں بنا سکتے (اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ) اس میں زبردستی کا سوال ہی نہیں۔ کفر اور ایمان کے لئے ہم نے ایک قانون مقرر کر رکھا ہے اور کوئی شخص اس قانون کے بغیر ایمان نہیں لاسکتا (وَمَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ) وہ قانون یہ ہے کہ وَیَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۰۰) جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ ان پر معاملہ مشتبہ رہ جاتا ہے اور وہ التباس و اضطراب میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس لئے ایمان نہیں لاتے۔ اور جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لے کر کائنات اور قرآن پر غور کرتے ہیں وہ ایمان لے آتے ہیں۔ لہٰذا جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ انھیں مار مار کر مسلمان نہیں بنایا جاسکتا ہمارا کام یہ ہے کہ ہم انسان کو صحیح اور غلط راستے واضح طور پر بتا دیں۔ اس کے بعد یہ انسان کے اپنے فیصلے کی چیز ہے کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا (۷۶/۳) ہم نے اسے راستہ دکھا دیا ہے اب اس کا جی چاہے تو اسے اختیار کرے اور جی چاہے تو اس سے انکار کردے اور دوسری راہ پر چل نکلے۔ دوسری جگہ ہے فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ (۱۸/۲۹) جس کا جی چاہے ایمان لے آئے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے ان مقامات (اور قرآن کے دیگر بے شمار مقامات) سے یہ واضح ہے کہ سورۂ یونس کی زیر نظر آیت میں "اذن اللہ" سے مراد یہ نہیں کہ خدا کے حکم یا اجازت کے بغیر کوئی شخص ایمان نہیں لاسکتا۔ خدا نے انسان کو صاحب اختیار پیدا کیا ہے اور کفر و ایمان کا فیصلہ اس کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ البتہ اس کے لئے ایک قانون مقرر کردیا گیا ہے اور وہ قانون یہ ہے کہ جو عقل و بصیرت سے کام لے گا اس پر حقیقت واضح ہوجائیگی۔ جو آنکھیں بند کرلیگا وہ سورج کی روشنی سے محروم رہ جائیگا۔ قرآن کی ساری تعلیم کی بنیاد ہی انسان کے اختیار و ارادہ اور کائنات میں قاعدہ اور قانون کے محکم تصور پر ہے۔ اس لئے اس کی آیات کا صحیح مفہوم اس بنیادی اصول کی روشنی میں متعین ہوگا۔

بین الاقوامی جائزہ

فارموسا کا معاملہ بدستور معلق ہے۔ مگر اس کے لئے بڑی تگ و دو ہو رہی ہے۔ بنڈونگ کانفرنس کے موقع پر سرخ چین کے وزیر اعظم چو این لائی نے امریکہ سے براہ راست گفتگو کی تجویز ہندوستان کی معرفت بھجوانے کی بجائے ہمارے وزیر اعظم کی معرفت امریکہ تک پہنچائی تھی۔ اس خلاف توقع اقدام کی توجیہ بعض حلقوں میں یہ کی جا رہی ہے کہ چین یہ چاہتا ہے کہ مذاکرات ایسے ملک کی وساطت سے کئے جائیں جس کی امریکہ میں اچھی ساکھ ہو۔ ہندوستان یوں پس منظر میں جانا کہاں گوارا کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنا نمائندہ کرشنا مینن پیکنگ بھیجا۔ ادھر پنڈت نہرو نے ماسکو جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اور ساتھ ساتھ یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا گیا کہ ان ملاقاتوں کے بعد ہندوستان ہی چین اور روس کے مزاج کا صحیح اندازہ دان ہوگا۔ اور وہی حتم و یقین سے بات کر سکے گا۔

مسٹر کرشنا مینن پیکنگ سے واپس آ گئے ہیں اور اب وہ انگلستان اور امریکہ جائیں گے۔ کہا گیا ہے کہ وہ کوئی فارمولا تیار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے اور چین اور امریکہ کی براہ راست گفتگو کی بجائے وہ کئی قوموں کی مشترکہ کانفرنس طلب کرنے کے حق میں ہیں۔ نیز وہ یہ چاہتے ہیں کہ نیشنلسٹ چین چھوٹے چھوٹے ساحلی جزائر کو خالی کر دے اور سرخ چین فارموسا کے متعلق جنگ چھیڑنے کی بجائے پرامن فضا پیدا کرے۔ انڈونیشیا کے وزیر اعظم علی ساسترو امی جو جو بھی مفاہمت کے خیال سے پیکنگ پہنچ گئے ہیں قائدین چین سے ابتدائی ملاقاتوں کے بعد انھوں نے نتیجے سے متعلق حسن ظن کا اظہار کیا ہے۔ اس بھاگ دوڑ کا وقتی طور پر یہ فائدہ ضرور پہنچا ہے کہ کشیدگی زیادہ نہیں بڑھی۔

اگر مشرق بعید میں امن کی فضا برقرار نظر آتی ہے تو یورپ میں بھی امن کے لئے کافی دوڑ دھوپ شروع ہو گئی ہے۔ روسی وزیر خارجہ مالوٹوف نے امریکہ، برطانیہ اور فرانس کو باقاعدہ جواب دے دیا ہے اور اعلیٰ کانفرنس پر رضامندی کا اظہار کر دیا ہے۔ انھوں نے یہ زور دیا ہے کہ متوقع ملاقات آسٹریا میں ہو۔ اقوام مغرب اس کے لئے تیار نہیں۔ مقام اور تاریخوں کے متعلق ابھی کچھ طے نہیں ہوا۔ لیکن امریکہ لوزان (سوئٹزرلینڈ) کے مقام پر جولائی کے تیسرے ہفتہ میں اجتماع کا متمنی ہے۔

امن کی اس ظاہری فضا میں ہو سکتا ہے کہ روس اور اقوام مغرب میں کشیدگی کی ایک نئی صورت پیدا ہو جائے آسٹریا کا معاہدہ طے ہو جانے کی وجہ سے اقوام مغرب کی فوجیں وہاں سے واپس آ جائیں گی۔ اٹلی نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ناٹو کی دفاعی ضرورت کے پیش نظر امریکہ اپنی فوجیں اٹلی میں رکھے۔ مغرب کے نقطہ نگاہ سے یہ تجویز مفید ہے اور امریکہ اس پر ضرور عمل درآمد کرنا چاہے گا۔ کیونکہ اس سے آسٹریا کے ہاتھ سے نکل جانے کی تلافی ہو جائے گی۔ لیکن روس بالکل پسند نہیں کرتا کہ امریکی فوجوں کو اس قدر قریب ایک اڈہ مل جائے۔ چنانچہ اس نے اس تجویز کی مخالفت کی ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ اس نے اعلیٰ کانفرنس کی دعوت قبول کرتے ہوئے امریکہ پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ مفاہمت پر آمادہ نہیں بلکہ قوت سے مسائل کو حل چاہتا ہے۔ بہرحال اب عالمی توجہ کا مرکز اعلیٰ کانفرنس ہو گئی ہے۔ اور کانفرنس کے انعقاد تک بین الاقوامی سیاست کا چلن اسی کے مطابق ہوگا۔

ہندوستان نے گوا کے خلاف پھر طوفان کھڑا کرنا شروع کر دیا ہے۔ ایک طرف گوا میں "استبداد اور تشدد" کی داستانوں کا چرچا ہو رہا ہے۔ اور دوسری طرف تیاریاں ہو رہی ہیں کہ رضاکار گوا پر حملہ کریں اور بھاری تعداد میں وہاں جائیں اور ستیہ گرہ کریں۔ پرتگال لامحالہ ایسے رضاکاروں کو گوا کی سرحد میں داخل ہونے سے روکے گا لیکن جب وہ ایسا کرے گا تو اس کے خلاف یہ مہم تیز تر ہو جائے گی کہ وہ پرامن رضاکاروں پر ظلم کر رہا ہے۔ مشرقی پنجاب میں سکھوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ بھی بدستور جاری ہے۔ سرکاری اطلاع کے مطابق گرفتار شدگان کی تعداد چودہ سو ہے۔ یہ سلسلہ دار و گیر اس لئے شروع ہوا ہے کہ سکھوں کو یہ بھی اجازت نہیں کہ وہ پنجابی صوبہ کے حق میں نعرے بلند کر سکیں۔ چنانچہ انھوں نے نعروں کا سلسلہ شروع کیا اور حکومت نے گرفتاریوں کا۔

عالم اسلامی

ٹیونس کی داخلی آزادی کے معاہدے پر دستخط ہو گئے ہیں لیکن اس کی تفصیلات شائع نہیں ہوئیں۔ گو اندرون ملک ایک طبقہ موجود ہے جو اس محدود آزادی کو بہ نظر استحسان نہیں دیکھتا اور مکمل آزادی کا طالب ہے۔ لیکن داخلی آزادی کو بالعموم قبول کیا گیا ہے اور عمومی اطمینان کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اس معاہدے سے ٹیونس کی فضا تو پرامن ہوتی نظر آتی ہے۔ لیکن ہمسایہ علاقوں بالخصوص الجزائر میں صورت حال تشویشناک ہو گئی ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ ٹیونس کی داخلی آزادی الجزائر کے لئے سخت ترغلامی کا پیش خیمہ ثابت ہو جائے گی۔

فرانس ٹیونس سے بے فکر سا ہو کر اپنی توجہ الجزائر پر مرکوز کر رہا ہے۔ جہاں مجاہدین حریت نے جنگ آزادی کو تیز تر کر دیا ہے، ان کا اضطراب بالکل قابل فہم ہے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ فرانس جو مراعات ٹیونس کو دے گا وہی ان کو دے گا۔ لیکن عملاً ہوا یہ ہے کہ ٹیونس سے مذاکرات ختم کرنے کے بعد فرانس نے اپنی افواج کا ہجوم الجزائر میں کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس نے ٹیونس سے فوجیں واپس بلانا شروع کر دی ہیں اور یورپ سے ناٹو کی تحویل سے بھی فوجیں واپس لے کر الجزائر میں بھیج رہا ہے، چنانچہ اب تک اسکی فوجوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ حالانکہ باغی جو اپنے آپ کو خدائی فوج کہلاتے ہیں۔ بمشکل پندرہ سو کی تعداد میں ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ فرانس الجزائر کی تحریک آزادی کو فوجی قوت سے کچل دینے کا تہیہ کر چکا ہے۔ لیکن اس کا نقصان بالآخر فرانس کو پہنچے گا اور اس نقصان کا خمیازہ فرانس کے حلیفوں کو بھی بھگتنا پڑے گا۔

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اقوام مغرب میں فرانس ایک کمزور قوم ہے۔ وہ ہند چینی کی جنگ میں الجھا ہوا تھا تو اسے اتحاد یورپ کے منصوبے میں طرح طرح کے رخنے پڑتے رہے چنانچہ دو سال کی تگ و دو کے بعد اس منصوبہ کو دفن کر دینا پڑا، اب خدا خدا کر کے مغربی یورپ کے نئے اتحاد کی طرح پڑی ہے۔ لیکن اگر فرانس سمندر پار کے علاقوں میں ہند چینی کی طرح الجھا رہا تو وہ مجوزہ اتحاد کی کمزور کڑی ثابت ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ اس کی عملی شکل میں پھر سے مداخلات پیدا ہو جائیں۔ یہ صورت حال روس کے نزدیک خوش آئند ہوگی۔ فرانس کے خلاف مغرب اقصیٰ میں ہی ہیجان و اضطراب نہیں پایا جاتا۔ بلکہ شمال مغربی افریقہ کے علاوہ کیمرون میں بھی اس کے خلاف بغاوت شروع ہو گئی ہے۔ اب اس آگ کے دائماً فرو ہونے کے امکانات کالعدم ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ فرانس وقتی طور پر اس آگ کو دبا دے۔ لیکن انجام کار اس میں وہی خاکستر ہوگا۔ ہند چینی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ فرانس کے حلیفوں کو بڑی سنجیدگی سے اس صورت حال کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اگر شمالی اور شمال مغربی افریقہ میں بدامنی بڑھتی گئی تو امریکہ کی عالمی دفاعی تنظیموں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ اگر امریکہ اس خطرے کو ابھی سے بھانپ لے تو وہ اس کا بروقت تدارک کر سکتا ہے

افغانستان کا مسئلہ بدستور درد سر بنا ہوا ہے گو سعودی عربیہ کے "سفیر مصالحت" مساعد بن عبدالرحمٰن نے اعلان کیا ہے کہ اصولوں پر مفاہمت ہو گئی ہے جب تک اس معاہدہ کی تفاصیل منظر عام پر نہیں آتیں۔ اس وقت تک تبصرہ ممکن نہیں۔ البتہ کابل کی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ حکمران طبقہ کی ذہنیت میں ذرہ بھر تبدیلی نہیں آئی۔ وہ الٹا روس سے اپنی امیدیں وابستہ کر رہا ہے اور اسی کے ذریعہ بیرونی دنیا سے تجارتی روابط استوار کرنے کی جنت الحمقا کے خواب دیکھ رہا ہے۔

گو ہنوز مساعی مصالحت کے نتیجہ کا اعلان نہیں ہوا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر افغانستان ان مساعی کو ٹھکرا دے تو پھر کیا ہوگا؟ پاکستان تو بہرحال اس کے منطقی نتیجے کے مطابق عمل کرے گا۔ لیکن کیا صلح کرانے والوں نے سوچا ہے کہ ان پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ ناکامی کی صورت میں نہ محض پاکستان اور افغانستان کے تعلقات ادر کشیدہ ہو جائیں گے بلکہ افغانستان کھلم کھلا روس کی طرف جھک جائے گا۔ اس میں افغانستان کا جو حشر ہوگا سو ہوگا۔ اس سے عالم اسلامی کے لئے روسی خطرہ زیادہ حقیقی ہو جائے گا۔ اس کا علاج اتحاد باہمی میں ہے جس کی داغ بیل پاکستان، عراق اور ترکی نے ڈال دی ہے۔ اس راز کو نہ سمجھا گیا تو اس کے نتائج بڑے خطرناک ہوں گے۔ مسلمان ممالک نے روس کے خطرے کا ابھی صحیح طور پر اندازہ نہیں لگایا۔ ورنہ وہ افغانستان کے موجودہ رویہ کو محض پاکستان اور افغانستان کا داخلی نزاع سمجھ کر یوں آرام سے نہ بیٹھے رہتے

مطبوعات طلوعِ اسلام

معراجِ انسانیت (از پرویز)
سیرت صاحبِ قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے تقریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد مع گرد پوش۔ قیمت بیس روپے۔

ابلیس و آدم
از پرویز۔ سلسلہ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق، قصۂ آدم ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۷ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستورِ پاکستان
اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت، علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ۲۲۴ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

اسلامی نظام
اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۴۴ صفحات۔ قیمت دو روپے

سلیم کے نام
از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا شگفتہ مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۲۲۵ صفحات
قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے
روزمرہ کی زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ چار سو آٹھ صفحات۔
قیمت چار روپے

اسبابِ زوالِ امت
از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟
۱۴۴ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

جشن نامے
ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دورِ آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات۔
قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاجِ شناسِ رسول
یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول، مزاج شناس کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۰۸ صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے

مقامِ حدیث
حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ جلد اول ۳۰۴ صفحات۔ جلد دوم ۴۱۶ صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے

فردوسِ گم گشتہ
از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۱۶ صفحات
قیمت چھ روپے

نوادرات
از علامہ اسلم جیراجپوری۔
علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات　قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت
(از پرویز) مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینے میں۔ صفحات ۱۹۲
قیمت ڈیڑھ روپے

نظامِ ربوبیت
(از پرویز) انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور، دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب۔ ضخامت، سوا تین سو صفحے۔
قیمت　قسم اول　چھ روپے
　　　قسم دوم　چار روپے

اقبال اور قرآن
(از پرویز) علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ۔ ڈسٹ کور کے ساتھ۔ صفحات ۲۵۶　قیمت دو روپے

نوٹ:- تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ:- ادارہ طلوعِ اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۳۔ کراچی

ذاتی ملکیت

کا اُصول

مُلّا کے نزدیک بڑا مقدس ہے

لیکن

اس کے بارے میں

قرآن کا حکم کیا ہے

اس کی تفصیل

نظامِ ربوبیت

میں دیکھئے۔

طلوعِ اسلام کے

پرانے پرچے

ماہنامہ طلوعِ اسلام کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں۔

۱۹۳۹ء	اگست، ستمبر، نومبر، دسمبر
۱۹۵۰ء	نومبر
۱۹۵۱ء	مارچ تا نومبر
۱۹۵۲ء	اگست تا نومبر
۱۹۵۳ء	جنوری کے علاوہ سب
۱۹۵۴ء	پورے سال کے

یہ پرچے بزم ہائے طلوعِ اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دیدیے جائیں گے

خواہشمند حضرات

اپنی فرمائشیں جلد بھیجیں۔ ورنہ پرچے ختم ہو جانے کا احتمال ہے

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ کراچی

اندرونِ ہند

حیدرآباد (دکن) کی ایک اطلاع سے پتہ چلتا ہے کہ ریاستی جمعیۃ علماء، ماہرینِ معاشیات و منصوبہ بندی کا ایک اجتماع اس غرض کے لئے منعقد کر رہی ہے کہ ریاست حیدرآباد میں مسلمانوں کی بے روزگاری کا کیا مداوا کیا جا سکتا ہے۔ حیدرآباد میں ہندوستان کا فوجی قبضہ ۱۹۴۸ء میں ہوا تھا۔ اس وقت سے کر اب تک مسلمانوں پر منظم طریق پر معیشت کا دائرہ تنگ کیا گیا ہے۔ حیدرآباد کو تو خیر آزادی کا خواب دیکھنے کی سزا ملی ہے۔ ورنہ مسلمانانِ ہند کا ہر جگہ یہی حال ہے۔ جیسا کہ ایک ہندوستانی اخبار نے لکھا ہے

"یہ واقعہ ہے کہ گذشتہ سات سال سے مسلمانانِ ہند اقتصادی میدان سے پسپا ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کی قابلِ ذکر تجارتیں ختم ہو چکی ہیں۔ ان کی گھریلو دستکاریوں پر زوال آ چکا ہے ان کی جائیدادیں صرف نام کی رہ گئی ہیں۔ ان کی وہ قابلیتیں بھی بے وزن ہو چکی ہیں جو سرکاری ملازمتوں میں ان کے لئے خضرِ راہ بن سکیں۔ پورے ملک کا جائزہ لے کر دیکھئے تو پتہ چلے کہ تعمیرات میں مسلمانوں کا حصہ صفر کے برابر رہ گیا ہے۔ ٹھیکوں کی فہرست میں ان کا نام مشکل ہی سے دکھائی دے گا۔ حتیٰ کہ قلیوں اور مزدوروں میں بھی ان کا تناسب برائے نام ہی رہ گیا ہے۔ غرض ہندوستان کے مسلمان اب اس قابل نظر نہیں آتے کہ ملک کی معاشی تحریکات میں اپنا واجبی فرض ادا کر سکیں۔" (الجمعیۃ۔ دہلی)

یہی اخبار آگے چل کر لکھتا ہے کہ کانگریس کے لئے یہ بہترین موقعہ تھا کہ اس کے کارکن مسلمانوں کے گھروں پر پہونچتے اور ان سے رابطہ پیدا کر کے انھیں اپنی طرف مائل کرتے اور کچھ ان کی سنتے اور کچھ اپنی سناتے .... (مگر) غضب یہ ہے کہ خود کانگریسی کارکنوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مسلمان کانگریس کا عہدہ حاصل نہ کر سکے۔" اس شکایت کے بعد کہا گیا ہے کہ "ہم ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند اپنے معاشی مستقبل پر غور و فکر کرنے کے لئے کوئی اجتماعی قدم اٹھائیں۔ اور یہ سوچ کر اٹھائیں کہ جو کچھ کرنا ہے انہی کو کرنا ہے۔"

یہ حقائق بڑے تلخ ہیں۔ اور ان کے پیشِ نظر واقعی ضرورت ہے کہ مسلمان ان کو بدلنے کے لئے مل جل کر کوشش کریں۔

ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں مسلمانوں کی منتشر آبادی کا اپنے لئے جداگانہ معاشی منصوبہ بندی کرنا محال نہیں تو بہت دشوار ضرور ہے بالخصوص اس لئے کہ حکومتِ وقت کی طرف سے ان کی حوصلہ افزائی کرنا تو ایک طرف انھیں طرح طرح سے پریشان کیا جا رہا ہو۔ ان حالات میں یہ غنیمت ہے کہ مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے کہ اپنے مسائل کو انھیں خود ہی حل کرنا ہوگا اگر اس احساس کو عملی شکل دینے کے لئے اجتماعی کوشش کی جائے اور ملکی قوانین کے مطابق حکومت سے اپنے حقوق منوانے کے لئے باقاعدہ جد و جہد کی جائے تو مسلمان اپنے لئے مناسب مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ ابھی تک مسلمانوں کو ایسی قیادت میسر نہیں آسکی جو اس جد و جہد کی علمبردار ہو سکے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ابھی تک ان کے قدم نہیں جم سکے۔

حکومت کی طرف سے مسلمانوں سے کس قسم کا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ تازہ مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔ آسام میں آسام آئل کمپنی کے سینکڑوں مسلمان ملازم بے کار ہو گئے ہیں۔ کیونکہ حکومتِ آسام نے ان کے ویزوں میں توسیع نہیں کی ان کی ملازمت کا سلسلہ کوئی وقتی یا عارضی نہیں تھا بلکہ اکثر و بیشتر مسلمان برسوں سے کمپنی کے ملازم چلے آ رہے تھے۔ یہ واضح رہے کہ آسام سے مسلمانوں کو بے دخل کرنے کی پالیسی ایک عرصے سے یعنی تقسیم سے بہت پہلے سے چل رہی ہے۔ یہ نیا اقدام اس وقت کیا گیا ہے جب ہندوستان والے شور مچا رہے ہیں کہ مشرقی پاکستان سے ہندو بھاگ بھاگ کر آ رہے ہیں۔ یہ پروپیگنڈہ جاری ہے۔ حالانکہ سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان کو وہاں سے زبردستی نکالا نہیں جا رہا۔ (یہ ہندو کیوں آ رہے۔ اس کی تفصیل طلوعِ اسلام میں آ چکی ہے) ہمیں افسوس ہے کہ حکومتِ پاکستان ہندوستانی پروپیگنڈے سے مرعوب ہو کر بڑی نیاز مندی سے ناکردہ گناہ کی تلافی کے لئے تیار ہو جاتی ہے اور ہندوستان کو اس کی آنکھ کا شہتیر تک دکھانے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ ان دنوں جب دونوں ممالک کے درمیان سفر کی آسانیاں پیدا کرنے اور ویزا کی پابندیاں کم کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ حکومتِ آسام کی جس قدر بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ یہ مسئلہ ایسا ہے جسے حکومتی سطح پر حل کرنا چاہیئے۔

بزمِ طلوعِ اسلام

لاہور بزمِ طلوعِ اسلام لاہور ایک عرصے سے قائم ہے۔ اس کے ہفتہ وار اجتماعات ہر جمعہ کو نماز کے بعد جامع القرآن (متصل دیال سنگھ کالج نسبت روڈ) میں منعقد ہوتے ہیں۔ اور ان میں قرآنی پیغام اور حالاتِ حاضرہ پر تبادلۂ خیالات کیا جاتا ہے۔ گذشتہ دو ہفتے موضوعِ بحث تعددِ ازدواج رہا۔ اور اس پر متعدد حضرات نے اظہارِ خیال کیا۔

بزم کی طرف سے طلوعِ اسلام لائبریری بھی قائم کر دی گئی ہے۔ جو ۴۴ نسبت روڈ پر واقع ہے۔ مقامی حضرات ہر قسم کی معلومات کے لئے ڈاکٹر احمد حسن صاحب ۴۴ نسبت روڈ سے رجوع کریں۔

بزم سے طلوعِ اسلام کا پرچہ اور اس کی مطبوعات بھی حاصل کی جا سکتی ہیں۔

گولیمار۔ کراچی محمد الیٰسین صاحب، ترجمان بزمِ طلوعِ اسلام گولیمار اطلاع دیتے ہیں کہ ۱۰ر رمضان کو حلقہ گولیمار کی بزم کا افتتاح ہو گیا ہے۔ بزم کا اجتماع ہر جمعہ کو بعد مغرب عرفان احمد فاروقی صاحب کے مکان نمبر $\frac{122}{3}$ گولیمار کوارٹرز میں ہوا کرے گا۔ اس مکان میں دارالمطالعہ بھی قائم کر دیا گیا ہے اس میں مطبوعاتِ طلوعِ اسلام اور رسائل کے کچھ پرچے مطالعے کے لئے رکھ دیئے گئے ہیں۔

لیاری کوارٹرز کراچی لیاری کوارٹرز میں باہمت قارئین نے بزمِ طلوعِ اسلام قائم کر لی ہے۔ بزم کے ترجمان سید بچل شاہ صاحب ہیں۔ ان سے مجاز ہوٹل نو آباد کراچی نمبر ۲ کے پتہ پر رابطہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بزم مناسب جگہ کی تلاش میں ہے۔ جگہ میسر آنے پر لائبریری کا قیام عمل میں لایا جائے گا اور سرگرمیوں میں توسیع کی جائے گی۔

وزیرِ اعظم سے خطاب

(صفحہ ۶ سے آگے)

بنگال کو اپنا صوبہ کہا تھا اور بڑی ڈھٹائی سے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ بنگالی ہونے کی حیثیت سے مجبور ہیں کہ وہ بنگالیوں کے اس مطالبہ کی تائید کریں کہ پاکستان کی قومی زبان بنگالی بھی ہو خود ایسی ذہنیت رکھتے ہوئے بھی وزیرِ اعظم صاحب تعجب سے پوچھا کرتے ہیں کہ ملک میں صوبائیت کا زہر کیوں پھیلتا جا رہا ہے!

ہم نے محض بطور مشتے نمونہ یہ چند چیزیں مختصراً پیش کی ہیں۔ ہمیں اس سے وزیرِ اعظم کا ذاتی استخفاف منظور نہیں نہ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ صرف وہی غیر محتاط و غیر معتدل باتیں کرتے ہیں۔ ہمارے اربابِ سیاست بالعموم بات کرنے سے پہلے مطلقاً اپنے الفاظ کو نہیں جانچتے۔ وہ منہ آئی کہہ جاتے ہیں اور ملک میں انتشار و پراگندگی پھیلانے کا موجب بنتے ہیں۔ وہ یہ محسوس نہیں کرتے کہ

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

کیا ہم توقع کریں کہ کم از کم ہمارے وزیرِ اعظم محتاط گفتگو کی مثال قائم کریں گے؛ نہ صرف محتاط گفتگو کی بلکہ قرآن کے الفاظ میں قولِ سدید کی۔ یعنی جو بات کہی جائے۔ صاف واضح، غیر مبہم، سیدھی اور دو ٹوک ہونی چاہیئے۔ اگر کوئی راز ایسا ہے۔ جس کا افشا قبل از وقت ہے تو اس کی بابت صاف کہہ دینا چاہیئے کہ یہ بات ابھی صیغۂ راز میں رہے گی۔

نوادرات

علامہ اسلم جیراجپوری کے مضامین کا

نادر مجموعہ

قیمت :- چار روپے

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ہوگا اسی قدر قرانی فکر عام ہوگا اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ہے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا دس روپے* کی ماہانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تا آنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ہوجائے۔ اس طرح — — —

- آپ کی پیشگی رقم سے ہمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں <u>بلا محصول ڈاک</u> خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اب شامل ہوجائیے۔

* پہلے ماہانہ قسط کی رقم کم سے کم پچیس روپے تھی لیکن اب متعدد قارئین کے اصرار پر اسے بدل کر دس روپے کر دیا گیا ہے۔ جو احباب دس روپے سے زیادہ قسطیں دینا چاہیں وہ دے سکتے ہیں۔

معاملہ کی ضروری باتیں

- طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ہی برتاؤ کریگا۔
- حساب میں بعض اوقات غلطی ہوسکتی ہے۔ ایسی غلطی باہمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے۔
- رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
- مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے۔
- پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ہفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ہفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ - کراچی - ۳

روٹی کا مسئلہ

انسان کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی اہمیت ہمیشہ سے رہی ہے اور ہمیشہ تک رہیگی ۔

آج تک انسان نے اس مسئلہ کو کیسے حل کیا؟ اس کا جواب تلاش کیا جائے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائیگی کہ اس نے بدن کو زندہ رکھنے کے لئے اپنی جان کو رہن رکھ دیا ۔

اب سوال یہ ہے

کہ کیا تدبیر اختیار کی جائے کہ انسان کا بدن اور اسکی جان دونوں سلامت رہیں؟ اس کے لئے ہمیں قرآن سے رجوع کرنا ہوگا ۔

قرآن کا حل

✡ نظام ربوبیت ✡

(از - پرویز)

میں ملیگا جو بلا شبہ دور حاضرہ کی عظیم کتاب ہے

قسم اول: کاغذ سفید کرنافلی جلد مضبوط مع گردپوش - چھ روپے

قسم دوم: کاغذ میکانیکل صرف ڈسٹ کور کے ساتھ - چار روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ - کراچی-۳

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Jawed Press, McLeod Road, Karachi. Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1, Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi. Editor: KHURSHID ALAM

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار طلوعِ اسلام کراچی

جلد نمبر ۸ شمارہ ۱۹ | کراچی: ہفتہ ۔ ۱۱ ۔ جون ۱۹۵۵ء | قیمت چار آنہ سالانہ دس روپے

قرآن نے کیا کہا؟

فرقے مٹتے ہیں خالص قران کی اتباع سے ۔ لیکن جو لوگ فرقوں میں بٹ جاتے ہیں انہیں اس بات سے چڑھ ہوجاتی ہے کہ ان کے سامنے صرف خدائے واحد کا نام کیوں لیا جاتا ہے ۔ جن شخصیتوں کو انہوں نے مقدس مان رکھا ہے ان کا نام کیوں نہیں لیا جاتا ۔ سورہ زمر میں ہے واذا ذکراللہ وحدہ اشمازت قلوب الذین لایومنون بالاخرۃ ۔ جب ان لوگوں کے سامنے جو مستقبل کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے، صرف اکیلے خدا کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل میں بڑی کبیدگی پیدا ہوتی ہے واذا ذکرالذین من دونہ اذا ھم یستبشرون (۳۹/۴۰) اور جب خدا کے علاوہ اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں ۔ وہ اسے برداشت ہی نہیں کرسکتے کہ انہیں خالص دین خداوندی کی طرف دعوت دی جائے واذا ذکرت ربک فی القران وحدہ ولو ادبار ھم نفورا (۱۷/۴۶) جب تو قران میں اکیلے خدا کا ذکر کرتا ہے تو یہ لوگ نفرت سے اپنا منہ پھیر کر چل دیتے ہیں ۔ اس لئے کہ اس سے ان کے خود ساختہ خداؤں کا انکار ہوتا ہے ۔

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ....

۱ تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں ۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو خارجی روشنی کی ۔

۲ یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے اس لئے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی ۔

۳ حق اور باطل کا معیار قرآن ہے ۔ جو روایات قرآن کے مطابق ہیں صحیح ہیں جو اسکے خلاف ہیں غلط ہیں ۔

۴ حضور نبی اکرم انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر تھے لیکن عجمی سازشوں نے ہماری تاریخ میں ایسی چیزیں شامل کر رکھی ہیں جن سے حضور کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے ۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں ۔ حضور کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے ۔

۵ قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں ۔ اس برادری کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے ۔

۶ اس عالمگیر نظامِ زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انہیں قانون شریعت کہا جاتا ہے) یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے ۔

۷ اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فردِ معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا (اسے ربوبیتِ عامہ یعنی تمام نوعِ انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے)

۸ ربوبیتِ عامہ کے مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے ۔ اسے "قرآنی نظامِ ربوبیت" کہا جاتا ہے ۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ....

اسلامی پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں قرآنی نظامِ ربوبیت نافذ ہو جائے تاکہ صفاتِ خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی ذاتی مضمر صلاحیتیں کامل نشوونما پا سکیں اور اس طرح "زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"۔

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ تذبیر ★ پارلیمانی احیاء ★ اسیران مارشل لا ★ تاریخی شواھد ★ عورت کا قران
★ اسلام کی سرگزشت ★ مجلس اقبال ★ سنت اور حدیث کی پوزیشن ★ باب المراسلات
★ نقد و نظر ★ بزم طلوع اسلام ★ عالم اسلامی ★ بین الاقوامی جائزہ

سلیم کے نام خطوط

ایک تعلیم یافتہ نوجوان کے دل میں زندگی اور اس کے اہم مسائل کے متعلق جس قدر شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا نہایت اطمینان بخش جواب بالکل اچھوتے انداز میں ۔

صفحات ۴۰۸ قیمت چھ روپے

اسلامی نظام

قیمت -/-/۲ روپے

ابلیس و آدم

سب سے پہلا انسان کس طرح پیدا ہوا تھا؟ آدم کون تھا؟ ابلیس کون؟ جنات کیا ہیں؟ وحی کیا ہے؟ ان سوالات کے قرآنی جواب ۔

ضخامت ۳۷۶ قیمت آٹھ روپے

فردوس گم گشتہ

وہ کتاب جس کی فضاؤں میں نوجوانان ملت اپنا نصیب تلاش کر سکتے ہیں ۔

صفحات ۳۱۲ قیمت چھ روپے

اسباب زوال امت

قیمت -/۸/۱ روپیہ

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ ۔ کراچی ۔ ۳

ہفتہ وار
طلوع اسلام

جلد ۸	۱۱ جون ۱۹۵۵ء	نمبر

تنذیر
(A WARNING)
شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز کا ذکر ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی نکبت وزبوں حالی اپنی انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ بساط سیاست پر تو یہ ایک مدت سے پٹ چکے تھے، اب ان کے مذہب پر بھی دھڑا دھڑ حملے شروع ہو گئے تھے۔ ایک طرف عیسائی مشنریوں کی "صلیبی فوج" تھی جو سیلاب کی طرح امنڈ کر آ گئی تھی۔ دوسری طرف آریوں کے پنڈت تھے جو گلی گلی، کوچے کوچے اسلام کو گالیاں دیتے پھر رہے تھے۔ ان مباحثوں اور مناظروں سے کمزور و ناتواں مسلمان تنگ آ رہا تھا کہ اتنے میں ایک طرف سے آواز آئی کہ اس مصیبت کا علاج یہ ہے کہ ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں ان تمام اعتراضات کا جواب موجود ہو جو ان مشنریوں اور آریوں کی طرف سے اسلام اور حضور نبی اکرمؐ پر وارد کئے جاتے ہیں۔ یہ آواز دینے والے تھے قادیان کے مرزا غلام احمد صاحب اور ان کی مجوزہ کتاب کا نام تھا براہین احمدیہ۔ کم شکستہ اور دل گرفتہ مسلمان نے اس آواز کو پیام سروش سمجھا اور اس کی تائید کے لئے ہر طرف سے جوق در جوق آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ مرزا صاحب نے کتاب بھی مرتب کرنی شروع کی اور اس کے ساتھ ہی ایک جماعت کی بنیاد بھی رکھ دی جس کا مقصد تبلیغ اسلام بتایا گیا۔ لوگوں نے اس تحریک کو اپنے مستقبل کے لئے نیک فال سمجھا اور ہر طرف سے ان کی امداد شروع ہو گئی۔ آہستہ آہستہ مرزا صاحب نے ایسے انداز اختیار کرنے شروع کر دیئے جن سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ مسلمانوں سے الگ ہٹ رہے ہیں لیکن ان کے یہ انداز ابھی تک (حیات و وفات مسیح جیسے) نظری مسائل کی حد تک تھے۔ جو لوگ ان کے ان عقائد سے اختلاف رکھتے تھے انہوں نے ان کی مخالفت شروع کی تو ملک کا ایک اچھا خاصا سنجیدہ طبقہ تھا جس نے ان مخالفت کرنے والوں کو ملامت کی کہ یہ شخص اور اس کی جماعت، تبلیغ اسلام کا اہم کام کر رہی ہے اور تم خواہ مخواہ (اس قسم کے نظری مسائل میں اختلاف کی بنا پر) اس کے کام میں روڑے اٹکا رہے ہو۔ یہ جماعت، تبلیغ کی آڑ میں آگے بڑھتی اور مسلمانوں سے الگ ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ایک دن، مرزا صاحب نے اعلان کر دیا کہ مسلمان صرف وہ اور ان کی جماعت ہے۔ باقی مسلمان، مسلمان ہی نہیں۔ ان میں سے جس نے مسلمان ہونا ہو، وہ ان کے ہاتھ پر تجدید ایمان کرے۔ چنانچہ اُن کے اس شعر

چو دور خسروی آغاز کردند
مسلماں را مسلماں باز کردند

کی تشریح کرتے ہوئے، صاحبزادہ بشیر احمد صاحب لکھتے ہیں:

> اس الہامی شعر میں اللہ تعالیٰ نے مسئلہ کفر و اسلام کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس میں خدا نے غیر احمدیوں کو مسلمان بھی کہا ہے اور پھر ان کے اسلام کا انکار بھی کیا ہے۔ مسلمان تو اس لئے کہا ہے کہ وہ مسلمان کے نام سے پکارے جاتے ہیں اور جب تک یہ لفظ استعمال نہ کیا جائے لوگوں کو پتہ نہیں چلتا کہ کون مراد ہے۔ مگر ان کے اسلام کا اس لئے انکار کیا گیا ہے کہ وہ اب خدا کے نزدیک مسلمان نہیں ہیں۔ بلکہ ضرورت ہے کہ ان کو پھر نئے سرے سے مسلمان کیا جائے۔ (کلمۃ الفصل)

چنانچہ اب حالت یہ ہے کہ یہ جماعت، مسلمانوں کے لئے خار پہلو بلکہ آشوب چشم بن رہی ہے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس آشوب جگر سوز کا علاج کیا کیا جائے۔ اگر سادہ لوح مسلمان شروع ہی سے اس خطرہ کو بھانپ لیتا اور ان کے "تبلیغ اسلام" کے فریب میں نہ آ جاتا تو یہ مستقل مصیبت ان کے گلے کبھی نہ پڑتی۔

بعینہٖ اسی قسم کا ایک اور خطرہ ہے۔ جو دس پندرہ سال ادھر سے برابر اُبھرتا چلا آ رہا ہے۔ اور سادہ لوح مسلمان کچھ نہیں سمجھتا کہ ان مقدس نقابوں کی اوٹ میں اس کے لئے ہلاکت انگیزیوں کی کتنی بڑی قیامت چھپ رہی ہے۔ جب مسلمانوں نے پاکستان کی آواز بلند کی (جس کی بنیاد مسلمانوں کے جداگانہ قومیت کے اصول پر تھی) تو "علمائے کرام" کی طرف سے اس کی مخالفت شروع ہو گئی اور انہوں نے متحدہ قومیت کا نعرہ بلند کیا۔ مفاد پرست ہندو کا روپیہ ان علماء کی جیبوں میں تھا اور پراپیگنڈے کی ساری قوتیں ان کے ساتھ۔ مسلمان کمزور اور غریب تھا اس لئے ان کی مخالفت سے دل گرفتہ۔ اس کے لئے، ہر وہ آواز جو متحدہ قومیت کے خلاف اٹھتی تھی صدائے سروش تھی اور درخور ہزار تحسین و تہنیت۔ عین اس زمانہ میں حیدر آباد (دکن) سے، سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنے رسالہ (ترجمان القرآن) میں، متحدہ قومیت کے خلاف مضامین لکھنے شروع کئے۔ مودودی صاحب جرنلزم کے اسلوب اور ٹیکنک سے خوب واقف ہیں اس لئے ان کے مضامین کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ حیدر آباد میں انہیں معاشی مجبوریاں ستا رہی تھیں۔ اس لئے وہ اس مقبولیت کی پونجی کو ساتھ لے کر سرزمین پنجاب کی طرف منتقل ہو گئے۔ اس سرزمین کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جذباتی بیج بہت جلد برگ و بار لے آتے ہیں۔ "متحدہ قومیت" کی مخالفت کی آڑ میں مودودی صاحب نے مرزا صاحب کی طرح ایک جماعت کی بنیاد رکھ دی جس کا اصل الاصول (مرزائی صاحبان کی طرح) باقی مسلمانوں سے نفرت اور اپنے آپ کو حق اور صالحیت کا علمبردار سمجھنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہاں ایک اور چیز بھی تھی جس سے انہوں نے فائدہ اٹھایا۔ تحریک پاکستان کے دوران میں بالعموم، اور تشکیل پاکستان کے بعد بالخصوص، ہمارے برسر اقتدار طبقہ کی اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل تھی (اور ہے) جو سیرت و کردار کے لحاظ سے بہت پست تھے۔ ذہنی طور پر بالعموم سطحی مغربیت کے دلدادہ اور کیرکٹر کے لحاظ سے ناخوش آیند۔ مودودی صاحب نے اس صورت حالات سے فائدہ اٹھایا۔ اور لوگوں کو اس طبقہ کے خلاف بھڑکا کر اپنی مقبولیت بڑھانا شروع کی۔ چنانچہ انہوں نے پہلے ان تمام جماعتوں کو جنس کاسد قرار دیا جو اس وقت مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ کر رہی تھیں۔ ان میں مسٹر جناح اور ان کی تحریک پاکستان سب سے زیادہ لائق نفرین تھی مودودی صاحب نے لکھا تھا۔

> اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام پر کام کر رہی ہیں اگر فی الواقع اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنس کاسد

نکلیں گی، خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں، یا علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین۔ دونو قسم کے راہ نما اپنے نظریہ اور پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ (سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۳۰)

در رفتہ رفتہ ان کے خیالات پھیلنے لگے۔ ان خیالات کا نقطۂ ماسکہ یہی تھا کہ عوام مسلمان محض "مردم شماری" کے رجسٹر کے مسلمان ہیں۔ اور ان کے خواص افرنگ زدہ، جاہل اور عیاش۔ لہٰذا ان میں مسلمان درحقیقت کوئی بھی نہیں۔

> یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ افراد فی ہزار نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں اور نہ حق و باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔
>
> (سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۱۰۵)

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ ان "نا مسلمان مسلمانوں" کے دوبارہ مسلمان ہونے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ مودودی صاحب کے ہاتھ پر تجدیدِ بیعت کریں۔ چنانچہ انہوں نے واضح الفاظ میں لکھ دیا کہ

> یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد جو شخص اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ و اشھد ان محمد رسول اللّٰہ کہنے کی جرأت کرے صرف وہی اس جماعت میں داخل ہو سکتا ہے خواہ وہ نسلاً غیر مسلم ہو اور ابتداً یہ شہادت ادا کرے یا پیدائشی مسلمان ہو اور پورے فہم اور شعور کے ساتھ اپنے سابق ایمان کی تجدید کرے۔
>
> (ایضاً صفحہ ۱۴۷)

آپ غور فرمایئے کہ اس میں اور جو کچھ میرزا صاحب نے کہا اور کیا تھا، اس میں کچھ بھی فرق ہے؟ چنانچہ جس طرح انہوں نے، انہی مسلمانوں کے اندر سے ایک نئی "مسلمانوں کی جماعت" تراشی تھی، اسی طرح انہوں نے انہی پیدائشی مسلمانوں کے انبوہِ عظیم میں حقیقی مسلمانوں کی جماعت الگ کر لی۔ اس جماعت کا نام جماعتِ اسلامی ہے، جو اپنے آپ کو صالحین سمجھتے اور کہتے ہیں۔ (میرزائی حضرات کی طرح) اس جماعت کی خصوصیتِ کبریٰ یہ ہے کہ انہیں دوسرے مسلمانوں سے سخت نفرت ہوتی ہے۔ یہ اپنے آپ کو سچے اسلام کے حامل اور اقامتِ دین کے علمبردار خیال کرتے ہیں۔ ان کے قلبی تعلقات صرف اپنی جماعت کے لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اب شادی بیاہ کے سلسلہ میں بھی انہوں نے یہ روش اختیار کرنا شروع کر دی ہے کہ وہ بھی اپنی جماعت کے اندر ہو (اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام میں ایک اشتہار بھی نقل کیا جا چکا ہے جس میں رشتہ کے متعلق لکھا گیا تھا کہ لڑکی والوں کے لئے جماعتِ اسلامی کے خیالات کا ہونا ضروری ہے) اس جذبۂ اعتزال و نفرت نے ان کے دل میں کبر و نخوت اور تعصب و تنگ نظری کے جذبات شدت سے پیدا کر رکھے ہیں اور وہ دوسروں کو عجیب قسم کے طنز و استہزاء

تحقیر و تضحیک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف خود مودودی صاحب کو بھی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی جماعت کے ایک اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

> اپنی تقریر ختم کرنے سے پہلے ایک آخری بات کی طرف آپ لوگوں کی توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہمارے حلقۂ رفقاء میں ایک اچھا خاصا گروہ ایسا پایا جاتا ہے جس نے تبلیغ و اصلاح کے کام میں تشدد اور سخت گیری کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ جو سوالات ان کی طرف سے میرے پاس آتے رہتے ہیں ان سے میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ان کے اندر بگڑے ہوئے لوگوں کو سنوارنے کی بیتابی اتنی زیادہ نہیں جتنی اپنے سے کاٹ کر پھینک دینے کی بے تابی ہے۔ دینی حرارت نے ان میں ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ اتنا بلند نہیں کیا جتنا نفرت اور غصہ کا جذبہ ابھار دیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اکثر یہ پوچھتے ہیں کہ جو لوگ ایسے اور ایسے ہیں آخر ہم تعلقات کیوں نہ منقطع کر لیں اور ان کے ساتھ نمازیں کیوں پڑھیں اور ان کو کافر و مشرک کیوں نہ کہیں ..... مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کے فضل اور اپنی خوش قسمتی سے حق کو پایا ہے ان کے اندر اس وجدانِ حق نے شکر کے بجائے کبر کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ اور اس کا اظہار ان شکلوں میں ہو رہا ہے۔
>
> (دعوتِ اسلام اور اس کے مطالبات صفحہ ۴۱)

اس قسم کی جماعت (جو اس تعلیم کا لازمی نتیجہ ہے جو مودودی صاحب ایک مدت سے دیتے چلے آ رہے ہیں) خالص مذہبی دائرہ کے اندر بھی کچھ کم خطرناک نہیں ہوتی لیکن جب وہ سیاسی عزائم لیکر اُٹھے اور آگے بڑھے تو یہ ایک عظیم خطرہ کا موجب بن جاتی ہے مرزائی جماعت نے جب تک اپنے آپ کو صرف مذہبی جماعت بنائے رکھا، وہ قوم کے لئے اتنی خطرناک نہیں تھی۔ لیکن جب اس نے من حیث الجماعت، سیاسی مفاد میں حصہ لینا شروع کیا تو ان کا مسئلہ ملت کے لئے ایک لاینحل مسئلہ بن گیا۔ بات بالکل صاف ہے۔ اگر ایک مسلمان (شومیٔ قسمت سے) عیسائی یا آریہ ہو جاتا ہے تو اس کی پوزیشن بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن جب ایک جماعت مسلمانوں کے اندر رہتے ہوئے اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ سمجھے اور ان سے سخت نفرت کرے، تو اس کا وجود ایک ایسی پھانس بن جاتا ہے جس سے نہ دن کو چین مل سکتا ہے نہ رات کو آرام۔ اس اعتبار سے جماعتِ اسلامی، مرزائیوں کی جماعت سے بھی زیادہ پُرخطر ہے۔ اس لئے کہ اس کی بنیاد ہی حصولِ اقتدار پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب کا یہ اعلان موجود ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت بنانا چاہتے ہیں جو

> اسلام کے اصولوں پر ایک نئے اجتماعی نظام اور ایک نئی تہذیب کا پروگرام لے کر اُٹھے اور عامۂ خلائق کے سامنے اپنے پروگرام کو پیش کر کے زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت فراہم کرے اور بالآخر حکومت کی مشینری پر قابض ہو جائے۔
>
> (ترجمان القرآن - دسمبر ۱۹۳۶ء)

آپ سوچئے کہ جس جماعت کے جذبات وہ ہوں جن کا ذکر آپ خود مودودی صاحب کی زبان سے اوپر سن چکے ہیں۔ اور جس کے عزائم یہ ہوں، وہ جماعت اگر معاشرتی یا سیاسی اقتدار حاصل کر لے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کے بعد یہ دیکھئے کہ اس جماعت کی ٹکنیک کیا ہے؟ انہوں نے پروپیگنڈا کا فن نازیوں سے سیکھا ہے اور جنگ کی حکمت (STRATEGY) کمیونسٹوں سے۔ ان کا عقیدہ اور مسلک (جس کا اظہار ان کے عمل سے ہوتا رہتا ہے) یہ ہے کہ

(۱) کسی اصول پر قائم نہ رہو جس قسم کا موقع اور محل دیکھو اس قسم کی بات کرو۔ چنانچہ آپ کو خود مودودی صاحب کی تحریروں میں اس قدر متضاد باتیں نظر آئیں گی جنہیں دیکھ کر آپ حیران رہ جائیں گے کہ کیا ایک ایسا ذمہ دار شخص اس طرح پینترے بھی بدل سکتا ہے۔

(۲) جھوٹ کو برابر دہراتے جاؤ۔ حتیٰ کہ وہ سچ بن کر دکھائی دینے لگے۔ بات ہمیشہ مبہم اور گول مول کرو تاکہ اس سے جس قسم کا مطلب چاہو نکال لو۔

(۳) اپنے مخالفین کی کسی دلیل کا کبھی جواب نہ دو لیکن ان کے خلاف بہتان تراشتے جاؤ۔ اور ان کا اس طرح پروپیگنڈا کرو کہ ساری فضا اس سے متاثر ہو جائے۔

(۴) عوام کو ہر طرح سے اپنے ساتھ رکھو۔ ان کے جذبات کو برابر ابھارتے رہو۔ اور یہ سب کچھ خدا اور رسول کے نام پر کرو۔

(۵) مولویوں کو اس کا لالچ دو کہ جب شرعی نظام (یعنی اس جماعت کی حکومت) قائم ہو جائے گی تو اس میں ان سب کا حصہ ہوگا۔ اس طرح ہر مسجد کو اپنی تحریک کے پروپیگنڈے کا مرکز بنا لو۔ اور وہاں سے اپنے مخالفین کو برابر گالیاں دلواتے جاؤ۔

(۶) اپنی وضع قطع ایسی رکھو جس سے عوام تمہیں بڑا دیندار سمجھیں۔

انہوں نے پروپیگنڈہ کا فن ہی نہیں بلکہ تنظیم کا طریقہ بھی فاسشٹوں سے سیکھا ہے۔ چنانچہ کچھ مرکز تو ایسے ہیں جو کھلے طور پر جماعتِ اسلامی کا لیبل اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ لیکن بے شمار مراکز ایسے ہیں جو علانیہ طور پر اپنے آپ کو اس جماعت کے ساتھ منسلک نہیں قرار دیتے نہ اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن جو درحقیقت اس تحریک کے مبلغ ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس تمام تنظیم و تحریک کے لئے بہت بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوگی اس کے لئے انہوں نے نہایت اطمینان بخش انتظام کر رکھا ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اب زمانے کے تقاضے ایسے ہیں جن میں سرمایہ دار طبقہ اپنے آپ کو محفوظ نہیں پاتا۔ زمیندار، جاگیردار، کارخانہ دار، بڑے بڑے صاحبانِ جائداد، اور تجار ہر ایک کا دل دھڑکتا رہتا ہے کہ نہ معلوم ہم پر کب اور کس طرف سے کوئی آفت آ جائے۔ اس جماعت نے ان کی اس قلبی

کیفیت کو بھانپ رکھا ہے اور اس سے خوب فائدہ اٹھا رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے جو اسلام پیش کیا ہے اس کی رو سے بتایا ہے کہ شریعت ذاتی املاک پر کوئی حد عائد نہیں کرتی۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ "بے حد و نہایت" جائیداد اپنی ملکیت میں رکھے۔ لہذا کوئی حکومت ان کی اس ملکیت کو ان سے چھین نہیں سکتی۔ "یہ خدا و رسول کی طرف سے دیا ہوا حق ہے۔ جسے کوئی غصب نہیں کر سکتا۔ جو ایسا کریگا وہ مداخلت فی الدین کے جرم کا مرتکب ہوگا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے مودودی صاحب کی کتاب "ملکیت زمین کا مسئلہ)۔ اس سے اس جماعت نے اپنے لئے وہ مقام حاصل کر لیا ہے کہ سرمایہ دار طبقہ اسے اپنا محافظ و نگران سمجھتا ہے اور چونکہ سرمایہ دار کا عقیدہ یہ ہے کہ "جب سارا دھن دیکھئے جاتا آدھا دیجئے لٹا" اس لئے اس نے ان کے لئے اپنی تجوریوں کے منہ کھول رکھے ہیں۔ چنانچہ اگلے دنوں جب لاہور کے سوداگروں نے جب مودودی صاحب کو دس ہزار تین سو روپے کی تھیلی پیش کی تو مودودی صاحب نے جواب میں کہا کہ لوگ ہمیں طعن کرتے ہیں کہ ہم باہر سے (امریکہ سے) مدد لیتے ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ جب ہمیں خود اپنی قوم سے اس قدر ملتا ہے تو ہمیں باہر سے امداد حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی سرمایہ کے زور پر انہوں نے تنخواہ دار کارکن رکھے ہوئے ہیں جو اپنے امیر (مودودی صاحب) کی کسی بات پر تنقید کرنے کی جرأت ہی نہیں رکھتے۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کریں تو روٹی کہاں سے کھائیں!

بہرحال یہ ہے وہ جماعت جو اس وقت نظام شریعت کی آڑ میں حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اگر اس جماعت کو اقتدار حاصل ہو گیا تو وہ جس قسم کی حکومت یہاں قائم کرے گی ان کے متعلق خود انہی کی زبان سے سنئے۔ مودودی صاحب اپنے تصور کی اسٹیٹ کے متعلق فرماتے ہیں۔

> اس قسم کا اسٹیٹ ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتا۔ یہ ہمہ گیر اور کلی اسٹیٹ ہے .... اس کے مقابلے میں کوئی شخص اپنے کسی معاملے کو پرائیویٹ اور شخصی PERSONAL نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت رکھتا ہے۔
>
> (اسلام کا نظریہ سیاسی صفحہ ۳۴)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "یہ ایک خاص مسلک رکھنے والی پارٹی کا اسٹیٹ ہے جو اس پارٹی کے مسلک کو قبول نہیں کرے گا وہ اسٹیٹ کے حدود میں ذمی کی حیثیت سے رہ سکتا ہے" (ایضاً ۳۵) لیکن ذمی کی حیثیت سے صرف غیر مسلم رہ سکے گا۔ جو مسلمان اس پارٹی کے مسلک کو قبول نہیں کرے گا وہ مرتد قرار دیا جائے گا اور مرتد کے متعلق مودودی صاحب کا فیصلہ ہے کہ اس کی سزا موت ہوگی۔ (دیکھئے مودودی صاحب کا پمفلٹ "مرتد کی سزا")۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، مودودی صاحب کے نزدیک مسلمان وہی ہے جو ان کے ہاتھ پر اپنے ایمان کی تجدید کرے اور اس طرح ان کی پارٹی میں شامل ہو جائے۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ ان کے الفاظ میں "مردم شماری کے رجسٹر" کا مسلمان ہے، جس کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ اس لئے ان کے تصور کی اسلامی اسٹیٹ، درحقیقت ان کی اپنی پارٹی کی اسٹیٹ ہوگی۔ یہ تو رہا مملکت پاکستان کے اندر بسنے والوں کے متعلق۔ دوسری اقوام کے متعلق ان کا ارشاد ہے کہ اگر ان سے جنگ ہوئی تو جنگ کے قیدی غلام بنائے جائیں گے اور ان کی عورتیں لونڈیوں کی حیثیت سے گھروں میں داخل کر لی جائیں گی جن سے بلا لحاظ تعداد جنسی لذت اندوزی حاصل کی جائے گی اور جب جی چاہے فروخت کر دیا جا سکے گا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے، تین اہم مسائل۔ شائع کردہ طلوع اسلام)

ہم نے جو کچھ اوپر لکھا ہے ان میں سے بعض باتیں شاید ان لوگوں کے نزدیک تعجب انگیز ہوں جو جماعت اسلامی کے لٹریچر سے ناآشنا ہیں۔ ان کی اطلاع کے لئے ہم اتنا لکھ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے، اپنی پوری ذمہ داری سے لکھا ہے۔ اور ہمارے پاس ہر بات کی سند موجود ہے۔

یہ ہے وہ جماعت اسلامی جس کی مخالفت میں طلوع اسلام مسلسل و متواتر لکھتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس نہایت ہوشیار جماعت نے لوگوں میں مشہور یہ کر رکھا ہے کہ اصل بات یہ ہے کہ طلوع اسلام حدیث کا منکر ہے اور جماعت اسلامی سنت رسول اللہ کی سب سے بڑی حامی ہے اس لئے طلوع اسلام ان کی مخالفت کرتا ہے۔ اس پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ ہے کہ عام طور پر سمجھا یہی جاتا ہے کہ "طلوع اسلام اور جماعت اسلامی میں مابہ النزاع مسئلہ "حدیث و سنت" کا نظری سوال ہے۔ اسے عملی زندگی سے کچھ تعلق نہیں۔ جماعت اسلامی نظام شریعت رائج کرنے کی جد و جہد میں مصروف ہے۔ اس لئے اس کی تائید ضروری ہے" ہم قوم کو کھلے کھلے الفاظ میں بتا دینا چاہتے ہیں کہ یہ سوال "حدیث و سنت" کے اختلاف کا نہیں۔ یہ لوگ سادہ لوح مسلمان کو دھوکے میں رکھ رہے ہیں تاکہ ان کی توجہ اسی طرف مبذول رہے اور وہ ان کے حقیقی عزائم سے بے خبر رہیں۔ طلوع اسلام اس لئے ان کی مخالفت کرتا ہے کہ اس کے نزدیک یہ جماعت پاکستان اور اسلام دونوں کے لئے سخت خطرہ کا باعث ہے۔ اگر (خدا نکردہ) انہیں اقتدار حاصل ہو گیا تو یہ اس قسم کا مستبد نظام قائم کریں گے جس سے مسولینی، ہٹلر اور اسٹالن کی روحیں بھی شرما جائیں۔ آپ نے تاریخ میں عیسائیت کے احتساب (Inquisition) کی لرزہ انگیز داستانیں پڑھی ہوں گی۔ یہ اس کی یاد تازہ کرائیں گے۔ تاریخ انسانیت اس پر شاہد ہے، کہ دنیا میں بدترین قسم کا ظلم "خدا کے نام" پر برپا کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ جس ظلم کو حصول جنت کا ذریعہ قرار دے لیا جائے اس میں انسان جس قدر آگے بڑھتا جائے گا، خوش ہوتا چلا جائے گا۔ ممکن ہے آج یہ باتیں آپ کو کچھ زیادہ اپیل نہ کریں لیکن ہم گذشتہ پندرہ بیس سال سے ان حضرات کے خیالات، نفسیات، عزائم اور مقاصد کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کرتے چلے آ رہے ہیں اور اس کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ اور اس نتیجہ کے لئے اپنے پاس دلائل رکھتے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ طلوع اسلام کو اس جماعت سے کوئی ذاتی مخاصمت نہیں ذاتی مخاصمت، ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ سے ہوتی ہے۔ طلوع اسلام کا تعلق کسی فرقے سے نہیں۔ یا ایک پارٹی کو دوسری پارٹی سے ہوتی ہے۔ طلوع اسلام کی کوئی پارٹی نہیں۔ طلوع اسلام نہ مذہبی تقدس کا خواہاں ہے۔ نہ سیاسی اقتدار کا متمنی۔ اس کے سامنے مقصد فقط یہ ہے کہ اس خطہ زمین میں قرآن کے خطوط پر معاشرہ قائم ہو جائے تاکہ مسلمان ازمنہ مظلمہ کے رجعت پسندانہ مسلک سے نجات پا کر سرفرازی و سربلندی اور حریت و عزیمت کی زندگی بسر کر سکے، اور اس کے بعد باقی دنیا بھی قرآن سے قریب تر ہوتی چلی جائے۔ اس مقصد کے لئے طلوع اسلام کسی ہنگامی تحریک کا نہ قائل ہے نہ داعی۔ وہ صرف فکری انقلاب کے لئے کوشاں ہے۔ جس میں کسی قسم کے اکراہ و استبداد کا کوئی دخل نہیں۔ لہذا اس کی کسی پارٹی یا کسی فرقہ سے کوئی ذاتی مخاصمت نہیں۔ بنا بریں وہ جماعت اسلامی کے خلاف بھی جو کچھ کہتا ہے، ملک اور قوم کو ایک شدید خطرہ سے بچانے کے لئے کہتا ہے۔ ہمیں تو بلکہ اس کا سخت رنج ہے کہ تقسیم سے پہلے طلوع اسلام کی بیشتر مساعی "متحدہ قومیت" کے داعی "علمائے کرام" کی نامراد کوششوں کی مدافعت میں صرف ہو گئیں۔ اور اب تقسیم کے بعد، اس کی توانائیوں کا بیشتر حصہ اس تخریبی کی روک تھام میں صرف ہو رہا ہے جو جماعت اسلامی کے ہاتھوں پیدا ہو رہی ہے۔ لیکن اسے یہ کچھ بمجبوری کرنا پڑتا ہے اس لئے کہ ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ یہ خطرہ کس قدر مہیب ہے۔

ہم قوم کے ہوشمند طبقہ سے با ادب گذارش کریں گے کہ وہ مندرجہ صدر معروضات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور سوچیں کہ انہوں نے اور ان کی آنے والی نسلوں نے اس ملک میں رہنا ہے۔ اگر یہاں اس قسم کی ذہنیت کو جسے جماعت اسلامی پیدا اور بیدار کر رہی ہے، فروغ و اقتدار حاصل ہو گیا تو کیا اس ملک میں کوئی شخص اطمینان کا سانس لے سکے گا۔

"مذہبی دیوانگی" (FANATICISM) نے انسانیت کے ساتھ کیا سلوک کیا کرتی ہے اس پر دنیائے مذاہب کی تاریخ شاہد ہے۔ خود مسلمانوں کی تاریخ میں بھی دیکھئے مذہب کے نام پر سادہ لوح عوام کے جذبات نفرت و انتقام کو بھڑکا کر کیا کچھ نہیں کیا گیا۔ جو کچھ اس سے پہلے مفاد پرست گروہ مذہب کے نقاب میں کر چکے ہیں وہی کچھ جماعت اسلامی کے پیش نظر ہے۔ لہذا یہاں بھی وہی کچھ ہوگا جو اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ ہم نے اس تنذیر کو اس لئے کھلے کھلے الفاظ میں صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر دیا ہے کہ اگر کوئی صاحب بصیرت اس سے اس وقت نصیحت حاصل کرنا چاہے تو کر لے۔ اور اگر کوئی بھی اس سے نصیحت حاصل نہ کرے تو کم از کم آنے والا مورخ اتنا تو دیکھ سکے کہ اس شوریدہ بخت قوم کو کسی نے بروقت متنبہ کر دیا تھا لیکن اس نے اس کی بات پر کان نہ دھرا اور تباہی کے جہنم میں گر گئی۔

کوئی ہے جو ان حقائق پر ٹھنڈے دل سے غور کرکے ملک اور قوم کو اس تباہی سے بچانے کی فکر کرے؟

اے عقل چہ می گوئی اے عشق چہ فرمائی؟

۳ر جون کو وزیر اعظم محمد علی صاحب نے ڈھاکہ سے مشرقی پاکستان میں پارلیمانی احیاء کا اعلان کر کے سارے ملک کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ دفعہ ۹۲۔ الف کا خاتمہ تو ایک دن ہونا تھا۔ اور اگر وزیر اعظم حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا وقت آ پہنچا ہے تو ہم ان سے اس بارے میں نہیں الجھتے۔ لیکن انہوں نے جس طریق سے صوبے کو مولوی فضل الحق کے قدموں میں ڈال دیا ہے۔ اس سے گستاخی معاف یہ مترشح ہوتا ہے کہ انہیں نہ صوبے کا مفاد عزیز ہے نہ ملک کے مفاد کا پاس۔ ایسا نظر آتا ہے کہ وزیر اعظم صاحب یہ تہیہ کر کے ڈھاکہ پہنچے تھے کہ اب کے بار نتائج و عواقب سے بے پروا ہو کر مشرقی پاکستان کی جاگیر مولوی صاحب کو بخش دیں گے۔

یہ مولوی فضل الحق صاحب کون ہیں؟ ہم ان کے متعلق ذاتی معلومات کی بنا پر کچھ نہیں کہتے۔ گذشتہ سال ہمارے وزیر اعظم صاحب نے قائد اعظم کے فرمودات کے حوالے دے کر ثابت کیا تھا کہ مولوی صاحب "غدار" ہیں اور وہ اس قابل نہیں کہ انہیں وزیر اعلیٰ رہنے دیا جائے۔ اس وقت سے لے کر اب تک یعنی پورے ایک سال تک ملک بھر میں انتظار رہا کہ مولوی صاحب کے خلاف جو الزامات ہیں ان کی تحقیق و تفتیش ہوگی اور اگر ان کا جرم ثابت ہوا تو انہیں قرار واقعی سزا دی جائے گی۔ واضح رہے کہ کسی مملکت میں غداری سے بڑھ کر اور کوئی جرم نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ یہی نہیں بلکہ مولوی صاحب نے بھی نہ اس کے لئے معافی مانگی اور نہ کسی قسم کی توبہ کی۔ اب تک ہمیں بتایا یہ جاتا رہا کہ اگر مولوی صاحب راستے سے ہٹ جائیں تو وزارت بنا دینے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہ جاتی۔ یہ بات قابل فہم تھی کیونکہ جسے اس قدر علانیہ طور پر "غدار" کہا گیا تھا۔ اسے صوبہ کا اقتدار کیسے سونپا جا سکتا تھا؟

لیکن اب یہ اچانک کیا ہو گیا کہ وزیر اعظم نے صوبہ بھر کی نہیں ملک بھر کی قسمت کا سودا انہی مولوی صاحب سے کر لیا! آپ فرماتے ہیں کہ یوں تو متحدہ محاذ کے لیڈر مولوی فضل الحق ہی کو اسمبلی میں اکثریت کا مالک ہونے کی حیثیت سے وزارت سازی کی دعوت دی جاتی۔ لیکن مجلس دستور ساز کے انتخابات نے ملک کے سامنے جو چند در چند مسائل پیدا کر دیئے ہیں، ان کے پیش نظر انہوں نے اپنا یہ حق ایک نامزد کو تفویض کر دیا ہے اور اپنے آپ کو آزاد کر لیا ہے تاکہ اپنا وقت اور قوت یکسوئی سے ان مسائل پر صرف کر سکیں۔

ذرا اندازہ لگائیے کہ اس مختصر سے اعلان میں کتنی باتیں جمع ہو گئی ہیں۔

(۱) مولوی صاحب کو متحدہ محاذ کا لیڈر کہا گیا ہے مولوی صاحب متحدہ محاذ کے لیڈر تھے۔ لیکن ۱۰ر فروری ۱۹۵۵ء کو متحدہ محاذ کا جو جلسہ ہوا اس میں ایسی ہڑبونگ مچی کہ کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ اس میں کیا کارروائی ہوئی۔ جلسہ کے بعد مولوی صاحب نے اعلان کیا کہ وہ متحدہ محاذ کے لیڈر از سر نو منتخب ہو گئے ہیں، دوسرا اعلان شیخ عطاء الرحمن سکرٹری عوامی لیگ کی طرف سے شائع ہوا اس میں دعویٰ کیا گیا کہ شیخ صاحب لیڈر منتخب ہوئے ہیں۔ انہی دنوں وزیر اعظم مطالعہ حالات کے لئے ایک بار پھر ڈھاکے تشریف لے گئے۔ آپ نے اپنے تاثرات یکم مارچ کی نشری تقریر میں بیان کئے۔ آپ نے فرمایا کہ مرکز نے دفعہ ۹۲۔ الف کے خاتمے کا تقریباً فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن متحدہ محاذ میں جو خانہ جنگی مچی ہوئی ہے اس کے پیش نظر حکومت مجبور ہے کہ ایسا قدم نہ اٹھائے۔ انہوں نے اسے جنگ اقتدار بھی کہا۔ جو حالت ۱۰ر فروری کے جلسے سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ بدستور قائم ہے۔ لیکن وزیر اعظم اس وقت تو مطالعہ حالات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس خانہ جنگی میں پارلیمانی احیاء خارج از بحث ہے۔ لیکن آج وہ مولوی صاحب کو متحدہ محاذ کا لیڈر قرار دے رہے ہیں۔ کیا وزیر اعظم ہمیں بتائیں گے کہ مولوی صاحب کب متحدہ محاذ کے لیڈر منتخب ہوئے؟ یا یہ کہ شیخ عطاء الرحمن صاحب نے لیڈری کا جو دعویٰ اس وقت کیا تھا وہ اب اس سے دستبردار ہو گئے ہیں؟

(۲) مولوی فضل الحق کو وزیر اعلیٰ تو نہیں بننے دیا گیا۔ لیکن وزیر اعلیٰ سے اونچا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اب وہ بادشاہ نہیں بلکہ بادشاہ گر بن گئے ہیں۔ ان پر وزیر اعظم نے "غداری" کا جو الزام لگایا تھا اگر وہ صحیح تھا تو ایک غدار کے نامزد کو "غدار" نہیں کہا جائے گا تو اور کیا کہا جائے گا۔ وزیر اعظم فرماتے ہیں کہ مولوی صاحب کے ساتھ اسمبلی کی اکثریت ہے۔ اس توجیہ کا ذرا تجزیہ کر کے دیکھیے کہ بات کیا نکلتی ہے! اگر مولوی صاحب غداری کے الزام میں عدالت میں کھڑے ہوتے اور یہ کہہ دیا جاتا کہ ان کے ساتھ اور بہت سے آدمی ہیں تو اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ یہ شخص تنہا نہیں بلکہ ایک گروہ GANG کا سرغنہ ہے۔ لہٰذا اس گروہ کا بھی سراغ لگایا جائے۔ کیونکہ ایک "غدار" کے ساتھی بھی بہرحال غدار ہوں گے۔

(۳) اسی پر اکتفا نہیں کہ مولوی صاحب کو وزیر اعلیٰ نامزد کرنے کا منصب عطا کیا گیا ہے۔ بلکہ ان کا مقام یہ بتایا گیا ہے کہ اب وہ اپنا تمام وقت اور پوری قوت ان مسائل پر مرکوز کریں گے جو مجلس دستور ساز کے انتخاب کی وجہ سے ملک کے سامنے آ گئے ہیں۔ یہ مولوی صاحب وہی بزرگ ہیں جنہوں نے گذشتہ سال بہت بڑی اکثریت کے باوجود تین وزراء کی وزارت مرتب کی تھی۔ ان میں سے ایک وہ خود تھے۔ ایک ان کے رشتہ دار اور ایک صاحب اور۔ یہ وزارت ساٹھ دن کی مدت حیات میں مکمل نہیں ہو سکی تھی۔ لیکن اس قلیل مدت میں کم از کم تین ایسے خونین فسادات کی ذمہ داری تھی جنہوں نے سارے پاکستان کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ اب یہی "غدار" ملک بھر کے لئے وہ حیثیت اختیار کر جائیں گے جو ہندوستان میں مہاتما گاندھی کی تھی۔ اور وزیر اعظم اس پر صاد کر رہے ہیں!

اگر وزیر اعظم نے اپنی ذاتی جاگیر کے متعلق اس قسم کے فیصلے کئے ہوتے تو ہم اس کے لئے لب کشائی بھی نہ کرتے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ پاکستان کسی کی جاگیر نہیں۔ اور کسی کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اسے جسے جی چاہے یونہی بخش دے، خواہ وہ غدار ہی کیوں نہ ہو۔ ہم وزیر اعظم صاحب سے استدعا کریں گے کہ اگر انہیں ان سیاسی روباہ بازیوں سے کبھی فرصت ملے تو وہ ذرا خلوت میں بیٹھ کر سوچیں کہ ان کے فیصلے کے نشتر کی زد کہاں تک پہونچتی ہے۔ یہ پارلیمانی احیاء نہیں بلکہ ملک کی بربادی کے سامان ہیں۔ ....

...... اس ملک کی تباہی کے سامان جس کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ اسے جس کے سپرد جی چاہے کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ ایک نخاس میں بکنے والے غلام کی طرح ساکت و صامت اور بے کس و بے بس مجبور کھڑا ہے۔ اور ایک حرف بھی زبان پر نہیں لا سکتا۔

تقاضائے انصاف

تین سال قبل جب مارشل لا کے سلسلہ میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو سزا دی گئی تھی تو طلوع اسلام نے تفصیل سے لکھا تھا کہ اس طرح حکومت نے غیر دانشمندانہ رازداری سے کام لیتے ہوئے جماعت اسلامی کو یہ موقعہ دیا کہ وہ عوام کے دل میں یہ بات بٹھا دے کہ مودودی صاحب کا جرم کچھ نہیں اور انہیں یونہی سزا دی جا رہی ہے۔ ادھر یہ فضا پیدا کی جا رہی تھی۔ ادھر حکومت نے اپنی اس غلطی کو چھپانے یا اس کا ازالہ کرنے کے لئے دوسری غلطی کی۔ یعنی مودودی صاحب کی سزا پھانسی سے کم کر کے چودہ سال میں تبدیل کر دی۔ پھر تین سال تک کر دی۔ اس تخفیف در تخفیف سے جماعت اسلامی نے یہ نتیجہ نکالا کہ حکومت نے ان کے دباؤ میں آ کر ایسا کیا۔ چنانچہ جب عدالت نے مودودی صاحب کو ضمانت پر رہا کیا تو ان کی جماعت نے یہ تحریک شروع کر دی کہ حکومت انہیں پھر سے جیل میں بھیجنے کی غلطی نہ کرے۔ یہ مہم شروع ہوئی تو حکومت نے اچانک یہ اعلان کر دیا کہ جن اسیران مارشل لا کی سزا تین سال تک ہے ان کی بقایا سزا منسوخ سمجھی جائے۔ حکومت نے یہ نہیں بتایا کہ اس وقت سزا کی تنسیخ کیوں عمل میں لائی جا رہی ہے اور صرف انہی قیدیوں کی سزا منسوخ کیوں کی جا رہی ہے جن کی مدت سزا تین سال کی تھی۔ حکومت کی خاموشی کا یہی مفہوم لیا جا سکتا ہے کہ تین سال کی مدت محض اسی لئے مقرر کی گئی کہ جماعت اسلامی مودودی صاحب کی رہائی کا مطالبہ کر رہی تھی اور ان کی سزا تین سال کی تھی۔ اگر ان کی سزا چودہ سال کی ہوتی تو پھر چودہ سال کی سزا والے قیدی رہا کئے جاتے۔

جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی کئی بار لکھ چکے ہیں کہ ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ کس کو کس وقت حوالۂ قید و بند کیا جاتا ہے اور اسے کب رہا کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک اہم اور بنیادی سوال یہ ہے کہ سزا صرف اسی کو ملنی چاہیئے جس نے جرم کیا ہے۔ جس نے جرم نہیں کیا، اسے چودہ سال یا تین سال بند رکھنا تو ایک طرف تین منٹ کے لئے بھی بند رکھنا حبس بیجا ہے جو میزان عدل میں ظلم و استبداد ہے۔ ہم حکومت سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ جن قیدیوں کی سزا کو اب منسوخ کیا گیا ہے کیا انہیں یہ سزا عدل و انصاف کے مطابق (ان کے کسی جرم کی پاداش میں) ملی تھی یا انہیں یونہی دھاندلی سے قید کر دیا گیا تھا۔ اگر انہیں قانون کی رو سے (جرم ثابت ہو جانے کے بعد) سزا ملی تھی تو بغیر کسی معقول وجہ کے اس سزا کے ما بقیہ حصہ کی منسوخی کے کیا معنی ہیں؟ اور اگر یہ سزا بغیر کسی جرم کے دی گئی تو انہیں اتنا عرصہ جیل میں کیوں رکھا گیا؟ اور دوسری بات جو ہم حکومت سے پوچھنا چاہتے ہیں۔ یہ ہے کہ باقیماندہ کم و بیش

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

تاریخی شواہد

(۱۸)

اوچھے ہتھیار

جب مجادلہ و مباحثہ سے کام نہ چلا تو قوم ان حربوں کو لے کر مقابلہ میں آگئی جو ارباب قوت و استبداد کا آخری جواب ہوتا ہے۔ لیکن جو پیغاماتِ الٰہیہ کا مبلغ اور حقیقت کا مبصر ہو۔ وہ بھلا اس تخویف و ترہیب سے کس طرح گھبرائے؟ حضرت ہودؑ نے فرمایا۔

فَكِيدُونِي جَمِيعًا ثُمَّ لَا تُنظِرُونِ ...... إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ (۱۱/۵۵-۵۷)

تم سب میرے خلاف مل کر جو تدبیریں کر سکتے ہو، ضرور کرو، اور مجھے (ذرا بھی) مہلت نہ دو (پھر دیکھ لو، نتیجہ کیا نکلتا ہے؟) میرا بھروسہ اللہ پر ہے۔ جو میرا بھی پروردگار ہے۔ اور تمہارا بھی۔ کوئی حرکت کرنے والی ہستی نہیں جو اس کے قبضے سے باہر ہو۔ میرا پروردگار (حق و عدل کی) سیدھی راہ پر ہے (یعنی اس کی راہ ظلم کی راہ نہیں ہو سکتی) پھر اگر (اس پر بھی) تم نے روگردانی کی تو جس بات کے لئے میں بھیجا گیا تھا، وہ میں نے پہنچا دی (اس سے زیادہ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے) اور (مجھے تو نظر آرہا ہے کہ) میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ دے دیگا۔ اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ یقیناً میرا پروردگار ہر چیز کا نگران حال ہے۔

ظہورِ نتائج کا وقت

حجت کا اتمام ہو گیا۔ قانونِ مکافات کے مطابق وہ وقت آپہنچا جب اعمال کی کھیتی پک جاتی اور اس کے نتائج نمودار ہو جاتے ہیں۔

فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ أَوْدِيَتِهِمْ قَالُوا هَٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۚ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُم بِهِ ۖ رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ (۴۶/۲۴-۲۵)

پھر جب انھوں نے آنے والی تباہی کو ایک بادل کی شکل میں اپنی وادیوں کا رخ کرتے ہوئے دیکھا، (تو خوش ہو کر) کہنے لگے کہ یہ تو ہم پر برسنے والا بادل ہے (تو ان کے اعمال کے نتائج نے جواب میں کہا" نہیں۔ یہ برسنے والا بادل نہیں!) بلکہ وہی عذابِ الٰہی ہے۔ جس کی تم جلدی کیا کرتے تھے۔ یہ تو آندھی ہے جس میں ایک بہت دردناک عذاب ہے۔ جو اپنے پروردگار کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر ڈالے گی۔" چنانچہ (وہی ہوا کہ) وہ ایسے (برباد ہو کر) رہ گئے کہ اُن کے مکانات (کے کھنڈروں) کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا (دیکھو) مجرم قوموں کو ہم ان کے اعمال کا بدلا اس طرح دیا کرتے ہیں۔

سورۂ حٰم میں ہے:۔

فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۖ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۖ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَخْزَىٰ ۖ وَهُمْ لَا يُنصَرُونَ (۴۱/۱۵-۱۶)

چنانچہ دیکھو، قوم عاد نے ملک میں بلاوجہ سرکشی اختیار کی اور کہنے لگے کہ ہم سے بڑھ کر قوت والا اور کون ہو سکتا ہے! کیا انھوں نے اتنا بھی نہ دیکھا کہ وہ خدا جس نے انھیں پیدا کیا ہے۔ وہ ان سے بھی بڑھ کر قوت والا ہے (یہ لوگ غرور و سرکشی میں اتنا حد سے بڑھ گئے تھے کہ) وہ عناداً ہمارے قوانین کا انکار کیا کرتے تھے۔ چنانچہ پھر (ایسا ہوا کہ) ہم نے ان پر ایک سخت آندھی ایسے دنوں میں بھیجدی جو (ان کے حق میں) بڑے مصیبتوں کے دن تھے۔ تاکہ ہم انھیں دنیوی زندگی میں رسوائی اور ذلت کا عذاب چکھائیں اور (یہ تو کچھ بھی نہیں) آخرت کا عذاب تو بہت ہی رسوا کن ہوگا اور وہ وہاں (کسی قسم کی) امداد نہیں کئے جائیں گے۔

بربادی

وہی بادِ تند و تیز (آندھی اور جھکڑ) جس سے ریت کے تودے بستیوں اور آبادیوں کو قبرستانوں میں منتقل کر دیتے ہیں۔ اسی کو دوسری جگہ الرِّيحَ الْعَقِيمَ کہا گیا ہے۔

وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ ۝ مَا تَذَرُ مِن شَيْءٍ أَتَتْ عَلَيْهِ إِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيمِ ۝ (۵۱/۴۱-۴۲)

اور دیکھو، قوم عاد پر ہم نے تباہ کن ہوا (آندھی) بھیجی جو جس چیز پر بھی گذرتی تھی اسے گلی ہوئی (ریزہ ریزہ شدہ) ہڈی کی طرح کئے بغیر نہیں چھوڑتی تھی۔

آندھی کا وہ طوفان جو مسلسل آٹھ دن اور سات راتوں تک جاری رہا۔

وَأَمَّا عَادٌ فَأُهْلِكُوا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَثَمَانِيَةَ أَيَّامٍ حُسُومًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَىٰ ۙ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝ فَهَلْ تَرَىٰ لَهُم مِّن بَاقِيَةٍ (۶۹/۶-۸)

اور دیکھو قوم عاد، ایک حد سے بڑھی ہوئی تیز و تند آندھی سے ہلاک کر دی گئی جو ان پر سات راتوں اور آٹھ دنوں تک برابر مسلط رہی (وہ آندھی کوئی معمولی آندھی نہ تھی) وہ جڑیں کاٹ ڈالنے والی آندھی تھی (اگر تم وہاں موجود ہوتے تو) تم انھیں اس طرح پچھڑا ہوا دیکھتے جیسے گرے ہوئے کھجور کے کھوکھلے تنے۔ تو کیا تم (آج) ان کا کوئی باقی رہنے والا نشان بھی دیکھتے ہو۔؟

اور اس طرح وہ قوم جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر نشانات نصب کرتی۔ بڑے بڑے ستونوں پر عمارات قائم کرتی، اور اپنے سے بڑھ کر کسی کو طاقتور نہ سمجھتی تھی۔ ایک آندھی (CYCLONE) کا مقابلہ نہ کر سکی اور ہلاک ہو گئی۔

فَكَذَّبُوهُ فَأَهْلَكْنَاهُمْ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝ (۲۶/۱۳۹-۱۴۰)

تو (دیکھو) قوم عاد نے ہودؑ کی تکذیب کی تو ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ بلاشبہ اس واقعہ میں (نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے) ایک (عبرت کی) نشانی ہے۔ اور (اس کی وجہ یہی تھی کہ) ان کی اکثریت صاحبِ ایمان نہیں تھی۔ اور یقیناً تیرا پروردگار (تمام امور پر) غالب ہے۔ اور سرکشوں کو تباہ کر دیتا ہے تاکہ نوعِ انسان کی روش باقاعدہ ہو سکے۔

ایسی ہلاکت کہ اللہ نے ان کی جڑ تک کاٹ دی۔

وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۖ وَمَا كَانُوا مُؤْمِنِينَ ۝ (۷/۷۲)

اور جنھوں نے ہمارے قانون کو جھٹلایا تھا، ہم نے ان کی بیخ و بنیاد تک اکھاڑ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی ایمان لانے والے نہیں تھے۔

وہ حال اور مستقبل دونوں میں زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہو گئے۔

وَتِلْكَ عَادٌ ۖ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ۝ وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ أَلَا إِنَّ عَادًا كَفَرُوا رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُودٍ (۱۱/۵۹-۶۰)

یہ ہے سرگزشت عاد کی۔ انھوں نے اپنے پروردگار کے قوانین (ہٹ دھرمی اور سرکشی کرتے ہوئے) جھٹلائے اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی۔ اور ہر متکبر و سرکش کے حکم کی پیروی کی اور ایسا ہوا کہ دنیا میں بھی زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہو گئے، اور قیامت کے دن بھی۔ تو سن رکھو کہ قوم عاد نے اپنے پروردگار کے قوانین سے انکار کیا! اور سن رکھو کہ عاد کے لئے محرومی کا اعلان ہوا جو ہودؑ کی قوم تھی!

اسلام کی سرگزشت

گذشتہ اشاعتوں میں عربوں کے قومی خصائص و امتیازات کے ضمن میں علمائے عمرانیات اور جاحظ، ابن خلدون اور اولیری کی آراء کا خلاصہ پیش کرکے ڈاکٹر احمد امین صاحب کا ان آراء پر تبصرہ اور ان کی اپنی رائے پیش کی گئی تھی۔ اس کے بعد زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی حیاتِ عقلیہ پر بھی بحث کی گئی تھی۔ آج کی فرصت میں اسی موضوع پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جا رہی ہے۔

ایسی ہی ایک اور کہانی سن لیجئے۔ وہ کہتے ہیں کہ خورنق (عرب کا ایک مشہور و معروف محل) کو نعمان ابن امرئ القیس نے بنوایا تھا۔ اس کی تعمیر نعمان کیلئے ایک رومی شخص نے کی تھی۔ جس کا نام سنمار تھا۔ جب وہ تعمیر کو مکمل کر چکا تو کہیں اس کے منہ سے نکل گیا کہ مجھے اس ایک اینٹ کی جگہ معلوم ہے جو اگر اپنی جگہ سے ہٹ گئی تو پورا محل دھڑام سے گر پڑے گا۔ نعمان نے سنمار سے پوچھا کہ اس اینٹ کی جگہ تمہارے سوا بھی کسی کو معلوم ہے؟ سنمار نے بتایا کہ نہیں کسی اور کو معلوم نہیں ہے۔ نعمان نے کہا کہ اب تو ضروری ہو گیا ہے کہ ہم اسے اس حالت میں چھوڑیں کہ کسی کو بھی اس اینٹ کا پتہ معلوم نہ رہے۔ چنانچہ نعمان نے حکم دیا۔ اور سنمار کو محل کے اوپر سے نیچے پھینک دیا گیا۔ جس سے اس کا بدن ریزہ ریزہ ہو گیا۔ چنانچہ یہ واقعہ ضرب المثل بن گیا۔ ان لوگوں نے اس خرافات پر یقین بھی کر لیا۔ حالانکہ یہ بات کس قدر محال ہے کہ پورا کا پورا محل ایک اینٹ پر مرکوز ہو جائے۔ اگر ہم اس قسم کی باتوں کو گننا شروع کر دیں، جو عربوں کی نگاہوں میں حادثات و واقعات سے تعلق رکھتی تھیں اور جن سے ادب اور تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں تو بات بڑی ہی لمبی ہو جائے گی۔ خصوصاً ان حوادث سے متعلق تفصیلات جن کا تعلق ان قبائل سے تھا۔ جو ختم ہو چکے تھے۔ مثلاً عاد، طسم اور جدیس وغیرہ یا وہ حوادث جو زمانۂ ہجرت سے دور دراز تاریخوں میں واقع ہوئے تھے۔ جیسے جذیمہ اور زباء کے حادثات۔ ان تمام واقعات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان لوگوں میں حادثات کی تعلیل کا سلیقہ ہی نہیں تھا۔ اور وہ مسببات اور اسباب کے مابین کوئی محکم رابطہ پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ تنہا عربوں ہی کا حال نہیں تھا۔ بلکہ اس خصوصیت میں وہ تمام دوسری قومیں بھی ان کی شریک ہیں، جو اس جیسے دور میں سے گذری ہیں۔ جس میں سے عرب گذر رہے تھے جیسے خود یونان وغیرہ۔ اس قسم کی باتیں آج ایک مستقل فن کا موضوع بن چکی ہیں جسے "علم متھولوجیا" کہتے ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ گذشتہ اور آئندہ حادثات کا پتہ لگانے کے لئے کہانت، عرافت، پرندے اڑانے اور فال لینے کی طرف کیوں متوجہ ہوتے تھے — حالانکہ یہ سب کے سب ایسے امور ہیں، جو علت و معلول اور سبب و مسبب کا پتہ لگانے میں کوئی منطقی حیثیت نہیں رکھتے۔

یہ صحیح ہے کہ ہر قوم میں — وہ کتنی ہی ترقی یافتہ اور فلسفی کیوں نہ بن چکی ہو — ایسی خرافات پر عقیدہ رکھنے والے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ لیکن ادب عربی کی کتابوں کے مطالعے سے ایسا نظر آتا ہے کہ یہ عقائد عموماً ساری قوم ہی کے عقائد تھے نہ کہ شاذ و نادر چند افراد کے۔ کہانت جیسی چیزیں تو ہر قبیلہ کا ایک ثابت شدہ نظام ہی بن چکی تھیں

کبھی کبھی کسی جاہلی شعر، کسی ضرب المثل یا کسی قصہ اور کہانی میں ہمیں ایک ترقی یافتہ فکر نظر آ جاتی ہے۔ جہاں اسباب اور مسببات میں ایک طرح کا ربط نظر آتا ہے۔ لیکن ان میں بھی بمشکل ہی فکر کی گہرائی نظر آتی ہے جسے تشریح و تعلیل کے ساتھ ثابت کرنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ ثقیف کے ایک قبیلہ نے دمدار ستاروں کے پے در پے ٹوٹنے سے گھبراہٹ سی محسوس کی۔ یہ لوگ ایک آدمی کے پاس گئے، جس کا نام عمرو بن امیہ تھا۔ وہ قبیلہ علاج کا ایک آدمی تھا۔ یہ شخص عربوں میں بڑا ہی چالاک اور نہایت عقلمند مشہور تھا — ان لوگوں نے اس سے پوچھا۔ "تم دیکھ رہے ہو کہ یہ آسمان پر کیا ہو رہا ہے؟ ستارے پھینکے جا رہے ہیں"۔ اس نے جواب دیا کہ ہاں دیکھ رہا ہوں۔ مگر ذرا پتہ لگاؤ جو ستارے ٹوٹ رہے ہیں۔ یہ وہ ستارے تو نہیں جن سے خشکی اور سمندر میں راستہ معلوم کیا جاتا ہے اور جن سے سردی اور گرمی نیز بارش وغیرہ کی پیشگوئی کی جاتی ہے۔ یا جن سے دوسری انسانی مصلحتوں کا کام لیا جاتا ہے۔ اگر یہ وہی ستارے ہیں تو خدا کی قسم یہ دنیا کے سمٹ جانے اور اس مخلوق کے تباہ ہو جانے کا وقت آ چکا ہے۔ اور اگر وہ تمام ستارے اپنی جگہ اور اپنے حال پر موجود ہیں۔ تو پھر یہ کوئی دوسری بات ہے جو خدا اس مخلوق میں کرنا چاہتا ہے۔ لیکن یہ ہم نہیں جان سکتے کہ وہ کیا ہے؟

ذرا غور کیجئے عمرو بن امیہ کی نظر میں کس قدر باریکی اور دقت نظر آتی ہے کہ اس نے ان ستاروں میں جن کے بقا پر اس دنیا کا نظام قائم ہے۔ اور ان دوسرے ستاروں میں جن کی اہمیت یہ نہیں ہے — یعنی شہاب ثاقب — کس قدر باریک فرق کیا ہے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو نجوم اور شہاب میں فلسفی تشریح کہی جا سکتی ہو۔ یا کوئی واضح اور ظاہر تعلیل کہی جا سکتی ہو یا جو سبب اور مسبب کے درمیان کوئی ارتباط کہلا سکتی ہو۔

بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ عقل عربی طبعاً مختلف اشیاء کی طرف اس نگاہ سے نہیں دیکھتی جسے عمومیت اور احاطہ کے ساتھ دیکھنا کہا جا سکتا ہو۔ یہ چیز اس کی استطاعت میں تھی ہی نہیں یہ چیز بعض قدیم مسلمان مؤرخین نے بھی محسوس کی ہے۔ چنانچہ "الملل والنحل" میں شہرستانی نے حکماء پر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے

"دوسری قسم حکمائے عرب کی تھی جو بہت تھوڑی سی جماعت تھی۔ ان کی حکمت زیادہ تر طبیعت و فکر کے وہ شاہکار ہوتے تھے۔ جو یکبارگی ان کے ذہنوں اور دماغوں میں کوند جاتے تھے۔"

شہرستانی دوسرے مقام پر کہتے ہیں کہ "عرب اور ہندوستانی قریب قریب ایک ہی طریقہ پر ہیں۔ دونوں قوموں کے درمیان قربت و یگانگت اس معنی میں تھی کہ دونوں قومیں خواص اشیاء کا لحاظ رکھتی تھیں اور حقائق اشیاء کا فیصلہ کرتی تھیں۔ مگر دونوں پر فطرت اور طبیعت کا غلبہ تھا۔ ان کے برعکس رومی اور ایرانی ایک ہی طریقہ پر قریب قریب چلتے تھے۔ ان کے ہاں قربت اور یگانگت اس معنی میں تھی کہ وہ کیفیت اشیاء کا لحاظ کرتی تھیں۔ اور طبیعتوں کے احکام کا فیصلہ کرتے تھے۔ ان دونوں قوموں پر اکتساب اور علمی و تحقیقی کوشش کا غلبہ تھا۔"

ایک عربی آدمی، دنیا کی طرف اجتماعی نظر سے غور نہیں کرتا جیسا کہ مثلاً ایک یونانی کرتا ہے۔ ایک یونانی — جونہی فلسفی بنتا ہے — دنیا پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالتا ہے۔ وہ اپنے دل سے پوچھتا ہے یہ دنیا کس طرح وجود میں آ گئی؟ میں دیکھتا ہوں کہ اس دنیا میں ہر قسم کے تغیرات اور انقلابات ہوتے رہتے ہیں۔ کیا ان تغیرات کی پشت پر کوئی ایسی بنیاد موجود نہیں ہے جو اپنی جگہ پر ثابت ہو؟ اگر ایسی کوئی بنیاد موجود ہے تو وہ کیا ہے؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ ساری دنیا ایک شے واحد کی طرح ہے۔ جس میں ہر ایک چیز دوسری چیزوں سے وابستہ ہے۔ اور وہ چند محکم اور ثابت قوانین کے تابع چل رہی ہے۔ تو آخر وہ نظام کونسا ہے اور وہ کیونکر پیدا ہوا اور کس چیز سے پیدا ہوا تھا؟

ایک یونانی اس قسم کے سوالات اپنے دل سے کرتا ہے اور یہ سوالات ہی اس کے فلسفہ کی بنیاد بنتے ہیں۔ جو اس کی ہمہ گیری پر مبنی ہوتی ہے۔ ایک عربی شخص کی طبیعت ان سوالات کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ اسلام کے بعد بھی اس نے کبھی ان امور کی طرف توجہ نہیں کی۔ وہ اپنے ماحول کے گرد گھومتا ہے جب اسے کوئی خاص منظر نظر آتا ہے۔ جو اسے پسند بھی آ جائے۔ تو وہ بے اختیار جھوم اٹھتا ہے۔ اور اس کے سینہ میں کوئی شعر یا مجموعہ اشعار، یا کوئی حکمت کی بات، یا کوئی ضرب المثل انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔ مثلاً وہ پکار اٹھتا ہے —

"آفتاب کی تبدیلیوں نے اس کے روزانہ وہاں سے طلوع ہونے نے جہاں سے وہ شام کو غروب ہوتا ہے۔ وہ اس کے صاف اور سفید ہو کر نکلنے نے اور زعفران کی طرح زرد ہو کر غروب ہونے نے زندگی کو روک رکھا ہے۔ وہ آسمان کے جگر پر ایسے چل رہا ہے جیسے موت کا پرندہ نفسِ انسانی میں گردش کرتا رہتا ہو۔ میں جانتا ہوں کہ آج وہ کیا لے کر آئے گا۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کل کن قضیوں کا فیصلہ کر کے وہ گذر چکا ہے۔"

اقبال پر اپنی قسم کی پہلی کتاب
اقبال اور قرآن
قیمت دو روپے

مجلسِ اقبال

مثنوی اسرارِ خودی

(تمہید)

اپنی فکر کے سرچشمہ، اپنے پیغام کے ماحصل، اور اپنے مخاطب طبقہ کے احوال وظروف کے متعلق اس قدر تفصیلی گفتگو کے بعد اقبالؒ (مثنویوں کے عام انداز کے مطابق) "ساقی" سے خطاب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

ساقیا برخیز و مے در جام کن ۔۔۔ محو از دل کاوشِ ایام کن!

اقبالؒ کا "ساقی" خود خدا ہے۔ خدا کا رسول ہے۔ اس کا پیغام جاں نواز ہے۔ وہ اس سے وہ شراب مانگتا ہے۔ جو خمکدۂ ازل سے سربمہر آبگینوں میں آئی تھی اور جو ساری دنیا کے افکار و آلام کو دور کرنے کے لئے آبِ حیات ہے۔ وہ شراب جس کے متعلق کہا ہے کہ

شعلۂ آبے کہ اصلش زمزم است ۔۔۔ گر گدا باشد پرستارش، جم است

وہ آتشِ سیال، وہ پانی کا لپکتا ہوا شعلہ، جس کی اصل "زمزم" ہے۔ جو کعبہ کی بھٹی میں کھنچتی ہے اور جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا پرستار اگر فقیر بے نوا ہے تو وہ اسے شاہنشاہ بنا دیتی ہے دنیا کی شراب بادشاہوں کو گدا بنا دیتی ہے۔ لیکن یہ قرآنی شراب گداگروں کو شاہنشاہ بنا دیتی ہے اور

می کند اندیشہ را ہشیار تر ۔۔۔ دیدۂ بیدار را بیدار تر

عام شراب عقل پر پردے ڈال دیتی ہے۔ لیکن اس شراب کی کیفیت یہ ہے کہ یہ فکرِ انسانی کو تیز تر کر دیتی ہے۔ اور چشمِ بیدار کو وہ بصیرت عطا کرتی ہے جس سے وہ مستور حقائق کو بے نقاب دیکھ لیتی ہے۔ مذہب کے متعلق عام طور پر مشہور ہے کہ مذہب میں عقل کو دخل نہیں ہوتا۔ لیکن قرآن کا خطاب ہی عقلِ انسانی سے ہے۔ وہ قدم قدم پر انسانی فکر و بصیرت کو دعوت دیتا ہے۔ اور جو تفکر و تدبر سے کام نہیں لیتا، اسے سیدھا جہنم رسید کر دیتا ہے۔ قرآن کی "شرابِ آسمانی" کی یہی خصوصیت ہے جس سے چشمِ مومن بیدار سے بیدار تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

پھر عام شراب کی کیفیت یہ ہے کہ اس سے انسان کے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اور اعصاب پر افسردگی و پژمردگی چھا جاتی ہے۔ لیکن قرآنی شراب کی کیفیت یہ ہے کہ

اعتبارِ کوہ بخشد کاہ را ۔۔۔ قوتِ شیراں دہد روباہ را

یہ ایک کمزور سے تنکے میں پہاڑ کی سی خود اعتمادی پیدا کر دیتی ہے۔ اور بے حوصلہ لومڑی کو شیروں کی عملی قوت عطا کر دیتی ہے۔ دنیا کا ہر مذہب عاجزی، ناتوانی، بیکسی بے چارگی، انکساری، مفلوک الحالی سکھاتا ہے۔ لیکن قرآن کا دین، انسان کو اشداء علی الکفار بنا دیتا ہے۔ وہ پوری قوت و سطوت سے باطل کا مقابلہ کرنا سکھاتا ہے۔ اور جماعت مومنین کو بنیان مرصوص (سیسہ پلائی ہوئی دیوار) بنا دیتا ہے۔

خاک را اوجِ ثریا می دہد ۔۔۔ قطرہ را پہنائے دریا می دہد

یہ شرابِ توحید خاک کی پستیوں میں گرے ہوئے انسانوں کو آسمان کی بلندیاں عطا کر دیتی ہے یہ ایک قطرۂ ناچیز کو دریا کی وسعتیں بخش دیتی ہے۔

اس دوسرے مصرعہ میں اقبالؒ نے اپنے فلسفۂ خودی کے بنیادی تصور کو نہایت حسنِ ایجاز سے بیان کر دیا ہے۔ تصوف کی رُو سے (جو درحقیقت نو افلاطونی فلسفہ کے ہندی ایڈیشن ویدانت کا چربہ ہے)

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

انسانی ذات کا معراجِ کمال یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذاتِ کل (خدائے اَنام) میں جذب اور فنا کر دے۔ لیکن اقبالؒ کا تصورِ خودی یہ ہے کہ انسانی ذات کا قطرۂ ناچیز اپنے اندر دریا کی وسعتیں پیدا کر کے بے کنار ہو جائے۔ انسانی ذات صفاتِ خداوندی کو اس طرح اپنے اندر جذب کرتی چلی جائے کہ اس میں (علیٰ حدِ بشریت) خدائی اور کبریائی کی خصوصیات جھلکنے لگ جائیں۔ اور وہ اس طرح حدود فراموش ہو کر تغیر و فنا کی زد سے آگے چلی جائے۔ اس کو استحکامِ خودی یا حیاتِ جاودانی کہا جاتا ہے۔ اس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

قطرہ را پہنائے دریا می دہد

اور صرف دریا کی پہنائیاں (وسعتیں) ہی نہیں بلکہ شور انگیزیاں اور تلاطم خیزیاں بھی۔

خامشی را شورشِ محشر کند ۔۔۔ پائے کبک از خونِ باز احمر کند

وہ شراب، اپنی بے پناہ قوتوں سے خاموشی کو شورِ محشر میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اور ایک کمزور و ناتواں چکور کے پنجوں میں وہ قوت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ باز کا شکار کر لیتا ہے۔ یہ ہے وہ شرابِ زمزمی جس کے لئے وہ ساقی سے استدعا کرتا ہے کہ

خیز و در جامم شرابِ ناب ریز ۔۔۔ بر شبِ اندیشہ ام مہتاب ریز

اٹھ اور میرے پیالہ میں اسی شرابِ ناب کو انڈیل دے۔ اور اس طرح میری فکر کی شبِ تاریک کو رشکِ صد مہتاب بنا دے۔ تو نور السمٰوٰت والارض ہے۔ تو سراجاً منیراً ہے۔ تو میرے دل و دماغ کی تاریکیوں کو تابناک و درخشندہ بنا دے۔

تا سوئے منزل کشم آوارہ را ۔۔۔ ذوقِ بیتابی دہم نظارہ را

تاکہ میں اس روشنی سے راہ گم کردہ انسانیت، بھٹکی ہوئی ملت کو پھر سے منزل کی طرف لے آؤں اور خود نظارہ کو ذوقِ بیتابی عطا کر دوں۔ اسے ایسا بنا دوں کہ وہ مستور پردوں سے بے تابانہ باہر آ کر مصروفِ تماشا ہو جائے۔ اور دنیا ایک بار پھر اس حقیقتِ منتظر کو لباسِ مجازی میں جلوہ بار دیکھ لے

اقبالؒ نے اپنی "شاعری" کا مقصودِ منتہیٰ ہی یہ بتایا ہے کہ

نغمہ کجا و من کجا، سازِ سخن بہانہ ایست ۔۔۔ سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

منتشر و آوارہ کاروانِ ملت کو پھر سے سوئے منزل لے چلنا۔ یہ تھا اقبالؒ کا مقصود۔

بزمِ طلوعِ اسلام

ادارہ نے "جہان نو" کے عنوان سے ایک ۱۶ صفحات کا پمفلٹ چھپوایا ہے۔ جس میں مطبوعات طلوعِ اسلام کا اجمالی تعارف ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اسے عام تقسیم کیا جائے۔ اور اس طرح زیادہ سے زیادہ لوگوں کو طلوعِ اسلام کے شائع کردہ قرآنی لٹریچر سے روشناس کر دیا جائے۔ بزمہائے طلوعِ اسلام کو چاہیئے کہ وہ مناسب مقدار میں یہ پمفلٹ ہم سے مفت طلب کریں۔ اور اپنے حلقہ میں ہر اس شخص تک پہنچا دیں، جو اس فکر کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جہاں بزمیں قائم نہیں ہوئیں۔ وہاں دیگر قارئین حسبِ ضرورت پمفلٹ منگوا سکتے ہیں۔ پمفلٹ کی قیمت کچھ نہیں اور یہ مفت تقسیم کے لئے ہے۔

ملتان — اختر علی صاحب (معرفت ایم شاہ محمد اینڈ سنز، بیرون پاک دروازہ، ملتان) اطلاع دیتے ہیں کہ ملتان میں بزمِ طلوعِ اسلام قائم کر لی گئی ہے، رکن سازی کا کام جاری ہے۔ آئندہ اجلاس ۔ر جون کو ہوگا۔ جو مقامی قارئین ابھی تک بزم کے رکن نہیں بنے۔ وہ جلد از جلد اختر علی صاحب سے رابطہ پیدا کریں۔

ایبٹ آباد — اطلاع ملی ہے کہ ڈاکٹر سمیع اللہ خاں صاحب کے مکان پر ۵ر جون کو مقامی قارئین کا اجتماع ہو رہا ہے۔ تاکہ بزم کی تشکیل پر غور و خوض کیا جا سکے قارئین ڈاکٹر سمیع اللہ خاں صاحب سے رابطہ پیدا کریں۔

پشاور — مرزا نصیر الدین صاحب ۲۷۷۲ گندان سٹریٹ (نزد جوگن شاہ) اندرون ڈبگری گیٹ، پشاور شہر اطلاع دیتے ہیں کہ وہ تشکیل بزم کے لئے کوشاں ہیں لہٰذا مقامی قارئین سے گذارش ہے کہ وہ ان سے رابطہ پیدا کریں۔ مرزا صاحب طلوعِ اسلام کا شائع کردہ لٹریچر بھی شائقین کو عاریتاً دیتے ہیں۔

عَورت کا قُرآن

(۱۶)

"قرآن مجید" خدا کی طرف سے آئے ہوئے آخری "دین" کی آخری کتاب ہے۔ جو انسانوں کو دی گئی ہے۔ اب غور کیجئے کہ چھٹی صدی عیسوی سے کہ جب کہ قرآن مجید نازل ہوا۔ قیامت تک کس قدر مختلف زمانے آئیں گے۔ اور ان زمانوں میں کس قدر مختلف طبقات کے لوگ ہوں گے قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے۔ تمام زمانوں کے لئے، خدا کی حکومت کا جامع ضابطۂ قوانین ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف زمانوں میں انسانوں کی تمدنی زندگی کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ ہر زمانے میں انسانوں کی بود وماند اور اسلوب معاشی و معاشرت بدلتے رہتے ہیں۔ آج وسائل آمد و رفت کی وسعتوں سے ساری دنیا کی طنابیں کھنچ گئی ہیں۔ جس سے انسانوں کے بین الاقوامی روابط و معاملات اس انداز کے ہو گئے ہیں کہ ہزار برس پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا آج دنیا کی کوئی قوم الگ تھلگ اور دوسری قوموں سے بے نیاز و مستغنی نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ زمانہ حاضر کے "تمدنی تقاضے" زمانہ سابق کے تقاضوں سے مختلف ہوں گے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی زندگی کے جو "بنیادی تقاضے" ہیں۔ وہ ماحول سے متاثر نہیں ہوتے لہٰذا ان میں مرورِ زمانہ سے تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً یوں سمجھئے کہ پہلے انسان بیل گاڑیوں پر سفر کرتا تھا۔ یا دریاؤں میں کشتیوں پر چلتا تھا۔ اب "تمدنی تقاضے" بدل گئے ہیں، اب ریل، ہوائی جہاز ہیں۔ اس وقت آپ سفر بیل گاڑیوں سے طے نہیں کر سکتے۔ دریاؤں میں تجارتی جہاز چلنے لگے ہیں۔ آپ کشتیوں سے کام نہیں چلا سکتے۔ یہ تمدنی تقاضے ہیں جو زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتے رہیں گے۔ مگر جو "بنیادی تقاضے" ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں۔ جس طرح پہلے انسان کی پیاس پانی سے بجھتی تھی۔ اسی طرح آج بھی پیاس کی تسکین پانی ہی سے ہوتی ہے۔ اور قیامت تک ہوتی رہے گی۔ خوشبو جس طرح پہلے انسانی دماغ کے لئے فرحت بخش تھی۔ آج بھی ہے۔ اور برابر رہے گی جس طرح صداقت و شرافت ہزار برس پہلے انسان کے لئے باعثِ فخر تھی۔ اسی طرح آج بھی وجہ تکریم و تفضیل ہے۔ اور ہمیشہ رہے گی۔ ان چیزوں پر زمانہ کی تبدیلی کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اور نہیں پڑے گا لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ:-

۱۔ انسانی زندگی کے "بنیادی تقاضے" ایسے ہیں جو ماحول اور زمانہ سے متاثر نہیں ہوتے اور مرورِ وقت سے ان میں کوئی تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اور کبھی نہیں پڑے گی

۲۔ لیکن انسان کی معاشرتی اور تمدنی زندگی کے تقاضے ایسے ہیں۔ جو زمانہ اور اس کی ضروریات و ترقیات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور ہمیشہ بدلتے رہیں گے۔

جب ایسا ہے تو لامحالہ جس ضابطہ قوانین یا زندگی کے جس دستور العمل کو تمام انسانوں کے لئے اور تمام زمانوں کے لئے نظامِ زندگی بننا ہو۔ اس کے لئے یہ لازمی اور ضروری ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ان دونوں تقاضوں کی تسکین کا سامان اپنے اندر رکھے؟ اور اگر ایسا نہیں ہوگا۔ تو وہ صرف ایک خاص وقت ہی کے لئے بکار آمد ہو سکے گا۔ دوسرے زمانہ کے لئے نہیں۔ چونکہ قرآن مجید ایک ایسا نظامِ حیات پیش کرتا ہے۔ جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ اور زمانہ: ملک، اور قومیت سے ماورا۔ اس لئے اس میں انسانی زندگی کے ان تمام بنیادی اصولوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یعنی:-

۱۔ قرآن مجید میں بعض "اصول" تو ایسے ہیں۔ جن کی جزئیات و تفصیلات بھی متعین کر دی گئی ہیں۔ یہ وہ احکام و قوانین ہیں جن پر مرورِ زمانہ اور ماحول کا کبھی کچھ اثر نہ ہوگا۔ اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناقابل تغیر و تبدل ہوں گے۔ ایسے احکام بہت ہی کم ہیں۔

۲۔ باقی "اصول" ایسے ہیں۔ جن کی صرف حدود متعین کر دی گئی ہیں۔ جزئیات و تفصیلات متعین نہیں کی گئی ہیں۔ ان کی جزئیات و تفصیلات ہر زمانہ کے انسان اپنی اپنی ضروریات اور اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق خود متعین کریں گے۔ البتہ یہ ضرور انہیں دیکھنا ہوگا۔ کہ اصولاً اس کی جو حد مقرر کی گئی ہے۔ اس سے باہر نہ ہو جائے۔ ایسے اصولوں کی تعداد زیادہ ہے۔

مثلاً نظامِ صلوٰۃ کے سلسلہ میں صلوٰۃ کے بعض وقتی اجتماعات کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے لیکن ان کی تفصیلات نہیں بتائیں۔ اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا کہ فلاں صلوٰۃ کی رکعتیں کتنی ہوں گی۔ ان رکعتوں میں کیا کچھ کرنا ہوگا۔ قرآن پڑھنا ہوگا تو قرآن کی کونسی سورت پڑھنی ہوگی کھڑے ہوں گے تو ہاتھ باندھے ہوں گے یا چھوڑے ہوں گے۔ ان چیزوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حالات میں (جہاں تک روایات سے معلوم ہوتا ہے) مختلف طور پر متعین فرمایا تھا۔ کبھی آپ نے ہاتھ باندھ کر نماز پڑھی اور کبھی ہاتھ چھوڑ کر۔ کبھی آپ نے رکوع میں جاتے ہوئے اور سجدہ میں جاتے ہوئے رفع یدین کیا۔ اور کبھی نہیں کیا۔ کبھی آمین زور سے کہی اور کبھی آہستہ کہی۔ ایک عرصہ تک ہر نماز کی دو دو رکعتیں ہوتی رہیں۔ اور پھر ان میں تبدیلیاں کر دی گئیں۔ وغیر ذلک۔ لہٰذا ان میں سے جو چیزیں قرآن نے متعین کر دی ہیں۔ ان میں کبھی بھی کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن جن چیزوں کو قرآن نے متعین نہیں کیا۔ اور رسول اللہ صلعم نے ان کو متعین فرمایا۔ اور جن میں وہ تبدیلیاں بھی فرماتے رہے۔ ان میں آئندہ کے حالات اور تقاضوں کے مطابق آئندہ بھی تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں۔

زانی اور چور کی سزا بھی مقرر کر دی۔ اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ مگر شرابِ خمر کی سزا مقرر نہیں کی۔ یہ زمانہ کے مطابق سزا ہوگی۔ محاصل حکومت و گورنمنٹ ریونیو کے سلسلہ میں "زکوٰۃ" کا ذکر بار بار کیا گیا ہے۔ یعنی یہ ہر زمانہ اور ہر حالت میں عوام کو ادا کرنا ہوگا۔ مگر اس کی شرح (ریٹ RATE) مقرر نہیں کی گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ شرح مختلف زمانوں میں زمانہ اور حکومت کی ضروریات کے مطابق بدلتی رہے گی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا ذکر کر دینے میں کوئی دقت نہ تھی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کی تفصیلات زمانہ، ضرورت اور ماحول کے مطابق قرآنی حکومت کی طرف سے طے ہونا مناسب ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس کی تفصیل کو خود طے نہ کیا۔ مگر جو طے شدہ امر ہے جیسے "ترکہ" اس کا اللہ تعالیٰ نے تفصیلی ذکر کر دیا ہے اور جزئیات و تفصیلات بھی طے کر دی ہیں

مگر آج کل زمانہ "قرآن" کو ناکافی سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اسلام چند جگہ ہے:-

۱۔ کچھ "قرآن" میں: جو ایک مختصر سا سرمایہ ہے۔ جس کو خدا نے نازل کیا۔ جس کو رسول اللہ نے مرتب و مدون کر کے مسلمانوں کو دیا۔ اور جس کی حفاظت کا خود خدا ذمہ دار بنا ہے۔

۲۔ کچھ "احادیث" میں: جس کو رسول اللہ کی وفات کے "ڈھائی" سو برس کے بعد سے پانچویں صدی تک رسولؐ اور صحابہ، خلفاء اور ائمہ کا قول بتا کر مکہ اور مدینہ کے باہر کے انسانوں نے جمع کیا۔ اور جو کئی اونٹوں پر لادا جانے والا مختلف فیہ اور باہم متضاد و متخالف سرمایہ ہے

۳۔ کچھ "فقہ" میں: جنہیں رسول اللہ کی وفات کے بعد ہر ہر جماعت کے لوگوں نے خود مرتب اور مدون کیا۔ اور جن میں سخت اختلاف ہے۔ اور جس میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

ذرا غور فرمایئے کہ "اسلام" کیا تھا اور کیا ہو گیا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ؎

یہ صندوقِ کتب مجھ سے تو یارب اٹھ نہیں سکتا
یہ "مذہب" ہے "تو مجھ سے بارِ مذہب اٹھ نہیں سکتا

(اکبر الٰہ آبادی)

"صندوقِ کتب" کا بار کچھ اتنا ہے کہ آدمی اٹھائے! وہ تو ہاتھیوں سے بھی نہ اٹھ سکے گا۔ پھر ظاہر ہے کہ یہ ہمارا خود ساختہ اسلام تو مسلمانوں کے لئے باعثِ فوز و فلاح ہو نہیں سکتا۔ چنانچہ مسلمانوں کی حالت دیکھئے۔ سمجھئے کہ ان کا شیرازہ کس طرح بکھرا ہوا اور حالت کس قدر ابتر ہے قرآن نے نازل ہو کر تمام مختلف قبیلوں کو ایک رسی میں باندھ دیا تھا۔ احادیث نے مسلمانوں کو دو مختلف ٹولیوں میں بانٹ دیا۔ اور فقہ نے تو ان کے پرخچے ہی اڑا دیئے۔

اسلامی معاشرت
صفحات ۱۹۲
قیمت:- دو روپے

سنّت اور حدیث کی پوزیشن

ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی وضاحت

قارئین طلوع اسلام کو یاد ہوگا کہ ہم نے ۱۶ر اپریل کی اشاعت میں "سنت رسول اللہ" کے عنوان سے ایک بسیط مقالہ افتتاحیہ لکھکر جماعت اسلامی سے بالخصوص درخواست کی تھی کہ فرمائیے کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ اور اگر غلط ہے تو کس مقام پر تاکہ ہم اپنی اصلاح کر سکیں بس کے بعد ہم نے اپنی متعدد اشاعات (اور نجی خطوط) کے ذریعے ارباب جماعت اسلامی کی توجہ اس طرف منتقل کرائی لیکن ان کی طرف سے ایک لفظ بھی اس کے جواب میں موصول نہ ہوا۔ لیکن محترم مودودی صاحب نے جیل سے رہائی کے بعد اپنی متعدد تقاریر میں اس موضوع کو مرکز سخن بنایا ہے۔ ان میں سے ان کی پندرہ مئی کی تقریر (جو ۱۸ر مئی کے اخبار تسنیم میں شائع ہے) خاص طور پر ان تفاصیل کو لئے ہے ان کی یہی تقریر اس وقت ہمارے زیر تبصرہ ہے۔

حکومت کی سرپرستی جس طرح انگریزوں کے زمانہ میں کانگریسی حضرات نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ جہاں کسی نے ان کے خلاف کچھ کہا انھوں نے جھٹ سے کہدیا کہ "یہ ٹوڈی ہے۔ سرکار کا پٹھو ہے" اور اس غوغا میں اصل بات کو گم کر کے صاف نکل گئے۔ یہی انداز جماعت اسلامی کا ہے۔ یہ بھی فریق مقابل کی کسی بات کا جواب دلیل و برہان سے نہیں دیتے بلکہ اس کیخلاف ایک اتہام تراش کر شور مچا دیتے ہیں اور اسطرح عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے خود صاف بچکر نکل جاتے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ بات بالکل دینی اور علمی تھی کہ سنت رسول اللہ کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔ لیکن مودودی صاحب بات اس طرح چھیڑتے ہیں کہ

> انکار حدیث کا فتنہ حکومت کی سرپرستی میں پھیلایا جا رہا ہے اور حکومت نے اس معاملہ میں ایک فریق کی حیثیت اختیار کرلی۔

چونکہ مودودی صاحب کی اپنے عقیدتمندوں کے حلقہ میں پیروں کی سی پرستش ہوتی ہے اس لئے انھیں اپنی کسی بات کے ثبوت میں نہ سند پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے نہ دلیل دینے کی۔ انھوں نے جو جی میں آیا فرما دیا۔ عقیدتمندوں نے احسنت و مرحبا کہکر سر ہلا دیا۔ ورنہ وہیں پوچھا جا سکتا تھا کہ آپ کے پاس اس کی سند کیا ہے؟

بہرحال ہم نے ۲۸ر مئی کے طلوع اسلام میں مودودی صاحب کو چیلنج دیا ہے کہ جہانتک طلوع اسلام کا تعلق ہے وہ اس الزام کو ثابت کریں۔

اسلام خطرے میں ہے نالائق ارباب حکومت کا قاعدہ ہوتا ہے کہ جونہی انھیں اس کا احساس پیدا ہو کہ لوگ ان سے خاص معاملہ میں بازپرس کریں گے۔ انھوں نے "اسلام خطرے میں ہے" کی گھنٹی بجا دی۔ قوم اس میں الجھ گئی اور وہ صاحب چپکے سے نکل گئے یہی انداز جماعت اسلامی کا ہے۔ ان سے ہم نے دلائل و براہین کی بنا پر بات کا جواب مانگا تھا انھوں نے عوام کے جذبات کو یہ کہکر بھڑکا دیا کہ

> اگر ایک دفعہ حضرت کے اسوۂ حسنہ کو سند ماننے سے انکار کر دیا گیا تو اس کے بعد دین کے کسی اہم معاملہ میں دو مسلمانوں کے لئے بھی متفق الرائے ہونا ممکن نہیں ہوگا۔ اور وہ امت ایک ایسے انتشار کا شکار ہو جائے گی جس کے بعد نہ دین باقی رہے گا نہ شعائر دین میں سے کسی کی شکل محفوظ رہیگی۔ ہمارا رشتہ اپنے ماضی اور اپنی روایات سے بالکل کٹ جائیگا اور ہم ایک ایسی لاوارث قوم کی حیثیت سے دنیا میں کھڑے رہ جائیں گے جس کے پاس نہ اپنی کوئی تاریخ ہو نہ روایات۔ جو اپنے ماضی پر شرمسار اور نادم ہو اور اپنی تمام عظیم شخصیتوں کو احمق اور جاہل قرار دے۔

اس بحث کو سردست چھوڑئیے کہ مودودی صاحب خود مسلمانوں کی تاریخ اور عظیم شخصیتوں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں (اگر آپ اس کی تفصیل چاہتے ہیں تو ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مزاج شناس رسول" ملاحظہ فرمائیے) سوال یہ ہے کہ جس تحریک یا جس فریق کی بابت یہ کچھ کہا جا رہا ہو اس کی کسی تحریر کا کوئی حوالہ تو دیا ہوتا جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ فی الواقعہ دین میں اس قسم کی صورت پیدا کرنے کے درپے ہیں؟ بلا سند و دلیل دوسروں کو اس قسم کا ہوّا بنا کر پیش کرنا اصول ابلہ فریبی ہے۔

حدیث اور سنّت کا فرق اس تمہید کے بعد اب اصل موضوع پر آئیے۔ مودودی صاحب نے فرمایا کہ

> عام لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہونے کا ایک بڑا سبب حدیث اور سنت کے فرق سے ناواقفیت ہے۔ سنت اس طریقے کو کہتے ہیں جسے حضور نے خود اختیار فرمایا اور امت میں اسے جاری کیا۔ سنت کے لفظ کا اطلاق اس امر واقعی پر ہوتا ہے جو حضور سے ثابت ہو۔ اس کے برعکس حدیث سے مراد وہ روایات ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے کیا کیا اور کس چیز کو کرنے کا حکم دیا۔ مولانا نے کہا کہ اس لحاظ سے حضور کی پوری زندگی کا طور طریقہ سنت ہے۔ آپ نے زندگی کے مختلف شعبوں۔ اخلاق، تہذیب، تمدن، عبادات، معاملات کے متعلق جو کچھ تلقین کی اسے آپ کی سنت کہا جائیگا۔ حدیث کا اطلاق متعدد چیزوں پر ہوتا ہے۔ علم حدیث کو بھی حدیث کہتے ہیں۔ ایک ایک حدیث کو بھی حدیث کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ احادیث کے مجموعہ کو بھی حدیث کہتے ہیں۔

سمجھ میں آ گیا آپ کو سنت اور حدیث کا فرق؟ "زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق حضور نے جو کچھ تلقین فرمایا" اسے کہتے ہیں سنت۔ باقی رہی حدیث، تو "ایک ایک حدیث کو بھی حدیث کہتے ہیں۔ احادیث کے مجموعہ کو بھی حدیث کہتے ہیں اور علم حدیث کو بھی حدیث کہا جاتا ہے"۔ ہو گئی نا بات واضح؟ اگر اب بھی بات واضح نہ ہوئی ہو تو آپ کی عقل کا قصور ہے۔ چشمۂ آفتاب را چہ گناہ!

بہرحال بات صاف ہوئی ہو یا نہ مندرجہ بالا اقتباس سے اتنا تو ضرور واضح ہوتا ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک سنت کوئی الگ چیز ہے اور حدیث الگ۔ لیکن ذرا آگے چل کر آپ فرماتے ہیں کہ

> حدیث سنت کو معلوم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

اس کے بعد کہا کہ

> اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں سنت کو مانتا ہوں لیکن حدیث کو نہیں مانتا تو یا تو اس کا دماغ خراب ہے یا وہ دانستہ لوگوں کو دھوکا دیتا ہے۔

اب بات یوں ہوئی کہ حضور نے اپنی زندگی میں جو طریقہ اختیار فرمایا یا زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق جو کچھ تلقین فرمایا، اس کے معلوم کرنے کا ذریعہ حدیث ہے۔ یعنی سنت رسول اللہ کا ریکارڈ حدیثوں کے اندر ہے۔ لہٰذا جو شخص سنت کو مانتا ہے لیکن سنت کے اس ریکارڈ کو نہیں مانتا تو یا تو اس کا دماغ خراب ہے یا وہ لوگوں کو دھوکا دیتا ہے۔

اب یہ دیکھئے کہ سنت کے اس ریکارڈ کے متعلق مودودی صاحب کا کیا طرز عمل ہے فرماتے ہیں۔

حدیث کی حیثیت ظاہر ہے کہ احادیث کے تمام مجموعوں کا حکم یکساں نہیں ہو سکتا اور کوئی ہوشمند آدمی یہ مطالبہ نہیں کر سکتا کہ سارے

> ذخیرۂ احادیث میں جو کچھ درج ہے اسے بلا چون وچرا سنت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے۔ ان تمام احادیث کی مختلف حیثیتوں سے جانچ پڑتال کا باقاعدہ طریقہ موجود ہے۔ ایک ایک روایت کے بارے میں سوال کیا جا سکتا ہے کہ کس ذریعے سے ہم تک پہنچی ہے۔ اس کا مضمون کیا ہے۔ یہ قرآن کے خلاف تو نہیں۔ اسلام کے مجموعی نظام کے خلاف تو نہیں۔ ان تمام حیثیتوں سے احادیث کو پرکھنے کا حق ہمیں حاصل ہے۔ اور ہم سے پہلے غیر معمولی جد و جہد اور کوشش سے سلف نے اس کام کو کیا ہے۔ انھوں نے ہر پہلو سے حدیث کی تحقیق کرنے کے لئے باقاعدہ علوم مدون کئے ہیں۔

یہانتک دیکھئے کہ بات کیا ہوئی۔

(۱) سنت رسول اللہ دین کا جزو ہے۔ اس کی اطاعت کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔

(۲) سنت کے معلوم کرنے کا ذریعہ احادیث ہیں۔

(۳) احادیث کی پوزیشن یہ ہے کہ اس مجموعہ کو بلا چوں وچرا سنت کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں پرکھنا چاہئے اور اس پرکھنے کا حق ہمیں حاصل ہے۔

اسکے بعد مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ جس حدیث کو تحقیق سے اس نے حق جان لیا ہے وہ دوسروں کو بھی مجبور کرے کہ اس کی تحقیق کو قبول کریں۔ ہر شخص اپنی جگہ تحقیق کرنے کا حقدار ہے اور دوسروں سے اختلاف بھی کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی رائے کے لئے دلائل دے۔

آپ نے غور فرمایا کہ بات کیا ہوئی؟

(ا) سنت حدیثوں کے اندر ہے۔ اور

(ب) حدیثوں کے متعلق ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ جسے صحیح سمجھے اسے مان لے جسے غلط سمجھے چھوڑ دے۔ کوئی شخص اپنی تحقیق کو دوسروں سے منوا نہیں سکتا۔

لہٰذا سنت رسول اللہ ہر شخص کے نزدیک الگ الگ ہو گئی اور کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جس بات کو ایک شخص سنت کہتا ہے وہ کہدے کہ یہ سنت نہیں۔ یا وہ دوسروں کو مجبور کرے کہ اسے سنت سمجھے۔

یہ ہے وہ سنت رسول اللہ جس کی اطاعت کو مودودی صاحب منجانب اللہ فرض قرار دیتے ہیں اور جس کی نسبت فرماتے ہیں کہ

اگر ایکدفعہ اسے سند ماننے سے انکار کر دیا گیا تو اس کے بعد دین کے کسی اہم معاملہ میں دو مسلمانوں کے لئے بھی متفق الرائے ہونا ممکن نہیں ہوگا اور امت ایک ایسے انتشار کا شکار ہو جائے گی جس کے بعد نہ دین باقی رہیگا نہ شعائر دین میں سے کسی کی شکل محفوظ رہے گی۔

آپ سوچئے کہ کیا تشتت و انتشار کی یہ شکل سنت کے اس تصور کے ماتحت ہی پیدا نہیں ہوتی جسے مودودی صاحب نے پیش فرمایا ہے۔ یعنی ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اپنے لئے آپ سنت متعین کرے!

اس کے بعد مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

ثابت شدہ طریقہ

ایک چیز کے حضور کے قول اور عمل کی حیثیت سے ثابت ہو جانے کے بعد ایک مسلمان کے لئے اس کے سوا چارہ ہی نہیں کہ وہ اس کی اطاعت کرے ...... تاریخ اسلامی میں کوئی قابلِ ذکر آدمی نہیں جس نے سنت کے ماخذ قانون ہونے کی حیثیت سے انکار کیا ہو۔ حدیث پر تو اختلافات ہوئے ہیں لیکن حضور کے ثابت شدہ طریقہ کے واجب الاتباع ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہوا۔

ابھی ابھی مودودی صاحب نے فرمایا تھا کہ ہم سب کو احادیث کے پرکھنے کا حق حاصل ہے اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ جس حدیث کو اس نے صحیح سمجھا ہے دوسروں کو بھی مجبور کرے کہ وہ اسے صحیح سمجھیں۔ لیکن اب یہ ارشاد ہے کہ حضور کے ثابت شدہ طریقہ کے واجب الاتباع ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہوا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

(۶) اگر حضور کا کوئی ثابت شدہ طریقہ موجود ہے تو ثابت شدہ کو پرکھنے کا سوال کہاں سے پیدا ہو گیا؟ اور

(۷) اگر احادیث کو پرکھنے کا حق ہر شخص کو حاصل ہے تو پھر حضور کا ثابت شدہ طریقہ کونسا ہوا؟

اصل سوال

سنت کے بارے میں یہی اصل سوال ہے۔ یعنی کیا حضور کا کوئی ثابت شدہ طریقہ ہمارے ہاں موجود ہے۔ اگر موجود ہے تو وہ کہاں ہے اور اسے ثابت شدہ کس طرح کہا جاتا ہے؟ اسے کس نے ثابت کیا ہے اور ایسا کرنے کی اس کے پاس کیا اتھارٹی تھی؟ اور اگر وہ ثابت شدہ ہے تو پھر مودودی صاحب کو اس ثابت شدہ طریقہ کو پرکھنے کا حق کیسے پہنچتا ہے؟

ہم محترم مودودی صاحب سے گذارش کریں گے کہ اگر ان کے پاس ان سوالات کا کوئی جواب ہے تو وہ اسے واضح الفاظ میں بیان فرما دیں۔ ایسے اہم معاملہ میں قوم کو اس طرح الجھاؤ میں رکھنے سے کیا حاصل ہے؟ اس قسم کی ابلہ فریبی زیادہ دیر تک چل نہیں سکتی۔

لیکن آپ دیکھیں گے کہ مودودی صاحب اس کا کوئی جواب نہیں دے سکیں گے۔ اس لئے کہ اس کا جواب ان کے پاس ہے ہی نہیں۔ ان کے ذہنی انتشار کا تو یہ عالم ہے کہ ابھی ابھی وہ کہہ چکے کہ حدیث، سنت کو معلوم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

اور اس کے بعد فرماتے ہیں کہ۔

اگر حدیث اور سنت کو قرآن کی تعبیر کے لئے سند تسلیم نہ کیا جائے تو......... یعنی اب حدیث اور سنت دو الگ الگ چیزیں بیان ہو رہی ہیں!

طلوعِ اسلام کا مسلک

طلوعِ اسلام کا پیش کردہ مسلک یہ ہے کہ

(۱) نبی اکرم نے قرآن کو عملاً نافذ کرنے کے لئے ایک نظام متشکل فرمایا جس میں خود حضور کی حیثیت مرکزی تھی۔ اس نظام میں حضور کے فیصلوں کی اطاعت "خدا اور رسول" کی اطاعت تھی۔

(۲) حضور کے تشریف برداری کے بعد یہی نظام حضور کے خلفاء نے برقرار رکھا۔ اب مرکزِ ملت کی حیثیت ان خلفاء کو حاصل تھی اور ان کے فیصلوں کی اطاعت "خدا اور رسول" کے فیصلوں کی اطاعت تھی۔ یہ حضرات رسول اللہ کے فیصلوں کے مطابق عمل کرتے تھے لیکن جہاں دیکھتے کہ ان کے زمانے کے حالات کا تقاضا کچھ اور ہے تو وہ حضور کے فیصلوں میں تبدیلی بھی کر دیتے تھے اب امت کے لئے ان تبدیل کردہ فیصلوں کی اطاعت "خدا اور رسول" کی اطاعت تھی کیونکہ قرآن میں "اللہ اور رسول" سے مراد وہ صالح نظام ہے جو قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے متشکل کیا جائے

(۳) حضور کے خلفاء کے بعد یہ شکل باقی نہ رہی۔ اب اگر مسلمان پھر سے صحیح دین کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ پھر سے اپنے ہاں علیٰ منہاج نبوت اس قرآنی نظام کو قائم کرے۔ اس نظام میں مرکزِ ملت کے فیصلے تمام اختلافی امور میں حکم بن جائیگے اور یوں ملت کا موجودہ انتشار ختم ہو جائے گا۔

(۴) اس مرکز کا کام یہ بھی ہوگا وہ احادیث کے موجودہ ذخیروں کو پرکھ کر متعین کرے کہ سنت رسول اللہ کی صحیح شکل کیا تھی۔

یہ ہے وہ مسلک جسے مودودی صاحب "فتنۂ انکار حدیث" قرار دیتے ہیں

اس پر اعتراض

چنانچہ اس پر اعتراض کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اپنے زمانے میں حضور مرکزِ ملت تھے اور ان کا حکم مسلمانوں کے لئے واجب الاتباع تھا۔ آج مسلمانوں کے لئے اپنے زمانے کے مرکزِ ملت کی اتباع ضروری ہے۔ یہ ایک ایسی گمراہی ہے جس سے بڑی کسی گمراہی میں مسلمان ہوتے ہوئے ہم مبتلا نہیں ہو سکتے۔

مودودی صاحب نے اس ٹکڑے میں پہلے تو اس شدید غلط بیانی سے کام لیا ہے جو یہ کہہ کر (یہ لوگ کہتے ہیں کہ) آج مسلمانوں کے لئے اپنے زمانے کے مرکزِ ملت کی اتباع ضروری ہے یعنی اس سے وہ یہ خیال پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ ہم موجودہ حکومت کے فیصلوں کو رسول اللہ کے فیصلوں کی جگہ دیتے ہیں۔ یہ بہت بڑا اتہام ہے۔ ہم نے کبھی یہ نہیں کہا۔ ہم نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ جب مسلمان پھر سے قرآنی نظام کو اسطرح قائم کریں گے جس طرح رسول اللہ نے قائم فرمایا تھا تو اسوقت ان کے لئے اس نظام کے مرکز کی اطاعت، "اللہ اور رسول" کی اطاعت کے مرادف ہو جائے گی۔ آپ غور کیجئے کہ اس میں اور جو کچھ مودودی صاحب نے کہا ہے کس قدر بنیادی فرق ہے۔

اللہ اور رسول کی اطاعت

ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ قرآن نے جہاں "اللہ اور رسول" کی اطاعت کا ذکر کیا ہے اس سے مراد اس صالح نظام کی اطاعت ہے جو احکام خداوندی کی تنفیذ کے لئے رائج ہو۔ اگر ایسا سمجھنا اتنی بڑی گمراہی ہے جس سے بڑی گمراہی کوئی اور نہیں ہو سکتی، تو اس گمراہی کے مرتکب خود مودودی صاحب بھی ہیں۔ وہ اپنی تفسیر (تفہیم القرآن۔ جلد اول) میں اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیۡنَ یُحَارِبُوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ کے تحت لکھتے ہیں

خدا اور رسول سے لڑنے کا مطلب اس نظام صالح کے خلاف جنگ کرنا۔ جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو۔ (ص ۴۶۵)

ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ جس طرح یحاربون اللہ و رسولہ میں اللہ اور اس کے رسول سے مراد وہ نظام صالح ہے جسے اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہے اسی طرح "اطیعوا اللہ و رسولہ" سے مراد اس نظام صالح کی اطاعت ہے جسے اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو۔

آپ غور کیجئے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اور جو کچھ مودودی صاحب نے لکھا ہے اس میں کچھ بھی فرق ہے؟ لیکن ہم قابلِ دار و رسن ہیں اور مودودی صاحب سب سے بڑے صالح اور مومن۔

دوسرا اعتراض

اس کے بعد مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

(یہ لوگ کہتے ہیں کہ اختلاف کی صورت میں مرکزِ ملت سے پوچھئے)

گویا آپ فیصلے کا حق سنت کو نہیں دیتے بلکہ مرکزِ ملت کے سپرد کرتے ہیں اور اسطرح مسلمانوں سے آزادیٔ رائے اور آزادیٔ تحقیق کا حق سلب کرتے ہیں۔ آپ مرکزِ ملت کے اس تصور سے اسلام میں بدترین قسم کی ڈکٹیٹرشپ قائم کر دیں گے۔

اس باب میں ہم محترم مودودی صاحب سے دو چار باتیں پوچھنا چاہتے ہیں۔

(اوّل) جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جس قبیلہ نے زکوٰۃ کو مرکز میں بھیجنے سے انکار کر دیا ہے اس کے خلاف جہاد کیا جائیگا، اور تمام صحابہؓ اس فیصلہ کے خلاف تھے لیکن اس کے باوجود حضرت صدیق اکبرؓ نے وہی کیا جس کا آپ فیصلہ کر چکے تھے، تو یہ ڈکٹیٹرشپ تھی یا کچھ اور!

(دوم) جب حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا تھا کہ ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقیں بائن تصور ہونگی اور صحابہؓ نے کہا کہ یہ فیصلہ نبی اکرمؐ کے فیصلہ کے خلاف ہے' تو عمل درآمد حضرت عمرؓ کے فیصلہ کے مطابق ہوا یا صحابہؓ کی تحقیق کی رو سے، اگر عمل درآمد حضرت عمرؓ کے فیصلے کے مطابق ہوا تھا تو کیا آپ نے صحابہؓ سے آزادیٔ رائے اور آزادیٔ تحقیق کا حق سلب کر لیا تھا یا نہیں؟

(سوم) پاکستان کی مجلس آئین ساز نے جو مسودہ قوانین مرتب کیا تھا (اور جسے آپ اور آپ کی جماعت' اسلامی دستور سے تعبیر کر رہی تھی)۔ اس میں تصریح تھی کہ کتاب و سنت کے خلاف کوئی قانون پاس نہیں ہوگا۔ اور اس امر کا فیصلہ کہ فلاں قانون کتاب و سنت کے خلاف ہے یا نہیں' مملکت کی عدالت عالیہ کرے گی۔

کیا اس سے' افراد کی آزادیٔ رائے اور آزادیٔ تحقیق کا حق سلب ہوتا تھا یا نہیں؟

(چہارم) جس قسم کی اسلامی اسٹیٹ آپ خود قائم کرنا چاہتے ہیں' اس کے متعلق آپ نے خود ہی یہ تحریر فرمایا ہے کہ

> اس قسم کا اسٹیٹ ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتا۔ یہ ہمہ گیر اور کلی اسٹیٹ ہے...... اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت رکھتا ہے (اسلام کا نظریہ سیاسی ص ۳۶)۔

کیا آپ فرمائیں گے کہ (آپ کے اپنے الفاظ میں) یہ "بدترین قسم کی ڈکٹیٹرشپ" نہیں ہوگی؟

اس کے بعد آپ فرماتے ہیں۔

> اگر آپ اس مرکز کو کسی شوریٰ کے مشورہ کا بھی پابند کر دیں تب بھی آپ اس اداے کو وہ حیثیت دیدیں گے جو حیثیت صرف حضورؐ کو حاصل تھی کہ ان کا ہر حکم واجب اطاعت تھا اور اس کا انکار کفر تھا۔

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ جب آپ کے تصور کا اسلامی اسٹیٹ قائم ہو جائے گا تو کیا اس کا ہر حکم واجب الاطاعت ہوگا یا لوگوں کو اجازت ہوگی کہ جس حکم کی جی چاہے اطاعت کریں اور جس حکم کے خلاف ورزی کرنا چاہیں یہ کہکر اس کے ماننے سے انکار کر دیں کہ ہم اسے "کتاب و سنت" کے خلاف سمجھتے ہیں اسلئے اسے واجب الاطاعت نہیں مانتے؟

جو پوزیشن آپ اس اسلامی اسٹیٹ کو دینا چاہتے ہیں' وہی پوزیشن اس مرکزِ ملت کی ہوگی جو ایک قرآنی اسٹیٹ میں خدا کے احکام کو نافذ کریگا۔ یہ نظام' فاشستی اور اشتراکی نظام کے مماثل تو نہیں ہوگا لیکن اس کے فیصلے جو ملک کا قانون ہوں گے تمام ملت کے لئے واجب الاطاعت ہونگے۔

یہ ہے "حدیث و سنت" کی وہ پوزیشن جسے امیر جماعت اسلامی نے اپنی تقریر میں واضح فرمایا ہے آپ خود سوچئے کہ اس سوال کو کتنی بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اسلامی نظام میں سنت رسول کی حیثیت کیا ہے ایسے اہم مسئلہ کے متعلق مودودی صاحب کی تصریحات وہ ہیں جو آپ کی نظر سے گذر چکی ہیں۔ مولانا ظفر احمد عثمانی نے اپنے فتویٰ میں مودودی صاحب کے متعلق کہا تھا کہ "یہ شخص جاہل اجہل ہے" ہمارا خیال ہے کہ یہ بات جہالت کی نہیں۔ اس لئے کہ مودودی صاحب اپنے کاروبار کے معاملہ میں بڑے ہوشیار واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ اپنی اسی تقریر کے خاتمہ پر وہ فرماتے ہیں کہ

کتب فروشی

ان حالات میں میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں آپ حضرات سے اپیل کروں کہ آپ جماعت اسلامی کے لٹریچر کو زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچانے کی کوشش کریں تاکہ جس قدر لوگوں کو اصل حقیقت سے آگاہ کرنا ممکن ہو کیا جا سکے۔

قرآن

مودودی صاحب نے اپنی ساری تقریر میں صرف ایک بات قرآن کے متعلق کہی ہے اور وہی قرآن کے خلاف ہے۔ میرزائی حضرات کا دعویٰ یہ ہے کہ میرزا غلام احمد صاحب خدا کے نبی تھے لیکن وہ کوئی کتاب لیکر نہیں آئے تھے۔ چنانچہ وہ کہا کرتے ہیں کہ نبی اور رسول میں فرق ہی یہ ہوتا ہے کہ رسول صاحب کتاب ہوتا ہے اور نبی کتاب نہیں لاتا۔ یہ عقیدہ یکسر قرآن کے خلاف ہے اور محض میرزا صاحب کی نبوت کی تائید کے لئے گھڑا گیا ہے۔ لیکن مودودی صاحب بھی ان کی تقلید میں فرماتے ہیں کہ

> اللہ تعالیٰ نے کتاب کے بغیر تو نبی بھیجے ہیں لیکن نبی کے بغیر آج تک کوئی کتاب نہیں آئی۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے تمام انبیاء کو کتاب دیکر بھیجا تھا۔

> فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ (۲/۲۱۳)
>
> اللہ نے انبیاء کو مبشر و منذر بنا کر بھیجا۔ اور ان سب کے ساتھ (معھم) حق کے ساتھ کتاب نازل کی۔

یعنی اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں کہ ہم نے ہر نبی کے ساتھ کتاب نازل کی اور یہ صاحب کہتے ہیں کہ نہیں! اللہ نے نبی بغیر کتاب کے بھی بھیجے تھے (جیسے میرزا صاحب) ذلك مبلغهم من العلم۔

باب المراسلات

تعدّد ازدواج

کچھ عرصے سے اخبارات میں تعدد ازدواج کے مسئلہ پر جو بحث جاری ہے۔ اس کا میں دلچسپی سے مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ میں نے اس سلسلہ میں پاکستان کے مختلف علماء کے فتاوے بھی پڑھے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مختلف النوع آراء یا تو قرآن مجید کے علاوہ دوسری کتابوں پر مبنی ہیں یا قرآن کی غلط تفاسیر پر۔ عوام کے سامنے قرآن حکیم کی پیش کردہ صحیح تصویر نہیں رکھی گئی جس سے وہ اس مسئلہ کا صحیح فیصلہ کر سکیں۔

قرآنی عبارت کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ نہ صرف مختلف آیات کا آپس میں ربط ہے۔ بلکہ مختلف سورتیں بھی مضامین کے اعتبار سے آپس میں تعلق رکھتی ہیں قرآن مجید میں صرف ایک مقام ہے جہاں تعدد ازدواج کی اجازت دی گئی ہے۔ وہ اس طرح کہ "اگر تمہیں ڈر ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہیں کر سکو گے تو تم دو دو تین تین چار چار عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں (یا جو تمہارے نکاح میں آنا پسند کریں) نکاح کر سکتے ہو۔ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل قائم نہیں رکھ سکو گے تو پھر ایک ہی (رہے گی)۔۔۔۔ (سورۃ النساء، آیہ ۳)

اس آیہ مبارکہ والی سورۃ سے پہلے ان اشخاص کا تذکرہ آتا ہے جنھوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی یا اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور لڑے اور قتل کئے گئے (سورۃ آل عمران آیہ ۱۹۵) گویا ملک میں جنگ سے پیدا شدہ حالات کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ اس آیت میں یتامے کے بارے میں انصاف نہ کر سکنے کے ڈر کی شرط لگائی گئی ہے۔ اس قسم کے حالات کا پیدا ہونا ہی اس آیہ مبارکہ کے دوسرے حصے پر عمل کی اجازت دیتا ہے۔ چنانچہ اگر یتیموں کے ساتھ ناانصافی کا ڈر نہ ہو تو اس آیہ مبارکہ کے دوسرے حصے پر عمل کا جواز پیدا نہیں ہوتا۔

یتیموں کے ساتھ ناانصافی کا خوف صرف غیر معمولی حالات میں ہی ممکن ہے۔ مثلاً جیسے کہ ملک کی تقسیم کے موقع پر مشاہدہ میں آئے۔ جب حالات معمول پر ہوں تو اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ بدقسمتی سے بعض علمائے کرام نے تعدد ازدواج کا جواز بیان کرنے کی خاطر اس آیت کا صرف دوسرا جزو پیش کیا ہے اور پہلا حصہ حذف کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض ایسے حضرات نے بھی یوں کیا ہے۔ جو تعدّد ازدواج کے حق میں نہیں یہ نہ قرآن کریم کے ساتھ انصاف ہے اور نہ ان کے ساتھ جو قرآن مجید کو صحیح نقطۂ نظر سے سمجھنا چاہتے ہیں۔ علاوہ ازیں الفاظ جو استعمال کئے گئے ہیں۔ وہ دو یا تین یا چار نہیں بلکہ دو دو، تین تین چار چار ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ معاملہ انفرادی نہیں بلکہ ملک کے صاحب امر یا اس کے نمائندوں کے لئے ہے کہ وہ ان غیر معمولی پیدا شدہ حالات میں فیصلہ دیں اور اہل مردوں کی تعداد اور عورتوں کی تعداد کا جائزہ لے کر تناسب مقرر کریں۔ تاکہ ہنگامی حالات میں معاشرہ کا یہ مشکل مسئلہ حل ہو سکے۔

مختصراً یہ کہ تعدد ازدواج کا جواز بشرط عدل صرف غیر معمولی حالات میں پیدا ہوتا ہے جب کہ بعد از جنگ کے حالات میں یتامے کثیر تعداد میں موجود ہوں۔ لیکن جب حالات معمول پر ہوں۔ جیسے کہ آجکل پاکستان میں ہیں کہ یہاں عورتوں کی تعداد مردوں کی تعداد سے زیادہ نہیں تعدد ازدواج کا جواز پیدا نہیں ہوتا۔ آجکل فرانس اور جرمنی جیسے ممالک میں تعدد ازدواج کا جواز ملتا ہے۔ جہاں کہ بظاہر تو ایک مرد کے لئے ایک ہی عورت ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اصل میں ایک ایک مرد کے کئی عورتوں سے تعلقات ہیں۔ اس وجہ سے کہ وہاں عورتوں کی تعداد مردوں سے دگنی تگنی ہے۔ چونکہ ان لوگوں کا بعد از جنگ کے ہنگامی حالات میں تعدد ازدواج پر ایمان نہیں۔ اس لئے ان ممالک میں بدکاری کی وسیع پیمانے پر موجودگی بیان کی جاتی ہے۔

سورۃ النساء آیہ ۲۳ کے آخر میں فرمایا گیا ہے: "اور تم پر دو بہنوں کا اکٹھا کرنا (بھی حرام ہے)" تو جب ان غیر معمولی حالات میں تعدد ازدواج ناگزیر ہو تب بھی دو بہنیں ایک ہی شخص کے نکاح میں نہیں آسکتیں۔ تعدد ازدواج کی ناپسندیدگی صاف ظاہر ہے کہ اس کے نتیجہ میں ایک شخص کی دو بیویوں کے درمیان حسد اور رنج رہے گا۔ اور چونکہ دو بہنوں میں قدرتی محبت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتے کہ اس طرح سے ان کے درمیان رنج کا سامان پیدا ہو جائے۔

جو حضرات عام حالات میں تعدّد ازدواج کے حامی ہیں اگر ان سے کہا جائے کہ وہ اپنی بیٹیوں اور بہنوں کی شادیاں ایسے اشخاص سے کر دیں جو پہلے ہی شادی شدہ ہوں۔ تو یقیناً وہ اس بات پر خوش نہ ہوں گے۔ کیا ایسا نہیں کہ یہ حضرات ان حالات میں یہ کوشش کریں گے کہ وہ شخص پہلی بیوی سے کوئی سروکار نہ رکھے اور اسے "معلقہ" بنا دے؟۔

رسول کریم کی سوانح حیات پر غور فرمایئے۔ پچپن[1] برس کی عمر تک ان کی ایک ہی بیوی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے بعد از جنگ کے حالات اور سورۃ احزاب میں بیان شدہ حالات غیر معمولی میں اور نکاح کئے۔ صحابہ کرام نے بھی ان غیر معمولی حالات میں ہی ایسا کیا۔

بخاری شریف جلد سوم کتاب النکاح پارہ ۲۱ میں بیان کیا گیا ہے۔ "مسور بن مخرمہ راوی ہیں کہ ایک دن رسول کریمؐ نے فرمایا کہ بنی ہشام بن مغیرہ میری اجازت چاہتے ہیں کہ اپنی بیٹی کو (حضرت) علیؓ کے ساتھ بیاہ دیں۔ میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا نہیں دے سکتا، نہیں دے سکتا سوائے اس کے کہ ابن ابی طالب (حضرت علیؓ) پہلے میری بیٹی کو طلاق دیدیں۔ اور پھر ان کی بیٹی سے شادی کر لیں۔ اس لئے کہ فاطمہؓ میرے جگر کا ٹکڑہ ہے۔ جس نے اس کو تکلیف دی اس نے مجھے تکلیف دی۔ اور جس نے اسے ایذا پہونچائی۔ اس نے مجھے ایذا پہنچائی" اس میں تعدد ازدواج سے رسول کریمؐ کی بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے کہ حضرت علیؓ کی مجوزہ دوسری شادی کو حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے حق میں تکلیف دہ اور نقصان دہ بیان کیا گیا۔

سورۃ البقرہ آیہ ۱۷۳ میں ارشاد ہے کہ "اللہ نے تم پر حرام کر دیا ہے مردار جانور اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جو اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی سے نامزد کیا گیا ہو۔ اب اگر ایسی حالت ہو کہ کوئی بھوک سے بیتاب ہو اور مقصود تو لذت ہو اور نہ خدائی حد ذکر کو توڑنا تو اس پر کچھ گناہ نہیں (اگر وہ یہ بھی کھالے) بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے" گویا جو چیزیں عام حالات میں حرام ہیں۔ غیر معمولی حالات میں جان بچانے کی خاطر جواز پاتی ہیں۔ اسی طرح تعدد ازدواج غیر معمولی حالات میں بدکاری کو روکنے کی خاطر جواز پاجاتی ہے۔

تعدد ازدواج کے حق میں یہ کہا جاتا ہے کہ بعض مرد غیر معمولی قسم کے ہوتے ہیں اور ان کے لئے ایک ہی بیوی کافی نہیں ہوتی ایسے حضرات کو یہ بھی ماننا چاہیئے کہ بعض عورتیں بھی غیر معمولی قسم کی ہوتی ہیں۔ اور ایسی عورتوں کے لئے ازراہ نوازش کوئی تدارک تجویز فرمانا چاہیئے۔

قرآن مجید میں نکاح کا مقصود محصنین غیر مسٰفحین (پابندی نہ کہ شہوت رانی) پیش کیا گیا ہے (سورۃ النساء آیہ ۲۴)۔ عقلمند شخص بنی نوع انسان کی بہبودی کے لئے اپنی قوت کو خرچ کرتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں اپنے اوپر کچھ پابندیاں بھی عائد کرتا ہے۔ رسول کریمؐ کی پیش کردہ مثال ہمارے سامنے ہے کہ انھوں نے پچپن برس کی عمر تک ایک ہی بیوی پر اکتفا کیا۔ اور اپنی جوانی اور اپنی قوت کو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کیا۔ تعدد ازدواج کے حامیوں کے لئے اس میں سبق ہے کہ اپنی قوتوں کا رخ قوم کے لئے تعمیری کاموں کی طرف پھیر دیں۔

لاہور ایم۔ ڈی۔ مرزا

مقام حدیث

حدیث کے متعلق پوری تفصیل

جلد اول۔ جلد دوم

قیمت فی جلد چار روپے

[1] تاریخی روایات سے جہاں تک مترشح ہوتا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات اس وقت ہوئی تھی۔ جبکہ آپ کی عمر پچاس سال کی تھی۔ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے کچھ عرصہ کے بعد جب کہ آپکی عمر قریب اکیاون سال تھی آپ نے حضرت سودہؓ سے نکاح کر لیا تھا۔ لہٰذا پچپن کے بجائے اکیاون سال ہونا چاہیئے (طلوع اسلام)

نقد و نظر

کتاب قیامت

مصنفہ:- سید محفوظ الحق علی مولوی فاضل شائع کردہ:- محفل روحانی ملّی بہائیان ہند و پاکستان دیر پبلشنگ کمیٹی۔ ملنے کا پتہ: بہائی ہال کراچی نمبر ۵۔ ضخامت ۳۳۳ صفحات۔ قیمت بلا جلد دو روپے، چار آنہ

مسلمانوں کی تاریخ بھی عجیب طرفہ تماشا ہے۔ یہ قرآن پر ایمان رکھتی ہے۔ لیکن قرآن نے انسانی تاریخ میں جن جن دروازوں کو بند کیا تھا۔ انھوں نے ان میں سے ایک ایک دروازے کو چوپٹ کھولا۔ اور اس کا نام اسلام کی تعلیم رکھا۔ قرآن نے کہا کہ ملوکیت استبداد کی مظہر ہے۔ اسے ختم کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے ہاں ملوکیت کو جاری کیا۔ اور آج جب کہ دنیا کی قریب قریب ہر قوم اپنے ہاں سے ملوکیت کو دیس نکالا دے چکی ہے۔ مسلمانوں کے ہاں بادشاہ موجود ہیں۔

قرآن نے کہا کہ پیشوائیت انسان کے دورِ توہم پرستی کی یادگار ہے۔ اسے دین سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ سلسلہ ختم کیا جاتا ہے۔ لیکن مسلمانوں نے اپنے ہاں مولویوں کا مستقل طبقہ پیدا کیا۔ جو اس وقت تک شجر ملت پر اکاس بیل کی طرح چھائے ہوئے ہیں۔

قرآن نے کہا کہ رنگ، نسل، خون، زبان، وطن کے امتیازات عہدِ جہالت کی یادگار ہیں۔ اسلام میں انسانوں کی تقسیم صرف کفر و ایمان کے معیار سے ہوتی ہے۔ اس معیار کی رو سے تمام دنیا کے مومن ایک ملت کے افراد ہیں۔ لیکن مسلمانوں نے ان امتیازات کو پھر سے قائم کر لیا۔ اور یہ حدود آج تک قائم ہیں۔ اور بڑے شد و مد سے قائم۔

قرآن نے کہا کہ نبی اکرمؐ پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا جاتا ہے۔ خدا نے تمام نوع انسانی کی راہ نمائی کے لئے جو ضابطۂ حیات دینا تھا وہ اپنی مکمل شکل میں قرآن کے اندر دیدیا گیا ہے۔ اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا ہے۔ اب اس کے بعد دنیا میں کوئی نبی نہیں آئیگا اب انسانوں کو اس وحی کے اصولوں کی روشنی میں اپنی عقل سے کام لینا ہوگا۔ اب افراد کی جگہ امم کا دور شروع ہو گیا ہے۔ اب موت اور حیات کے فیصلے اشخاص کی فتح اور شکست کے بجائے اس نظام کے نقص اور خوبی کی بنا پر ہوں گے۔ جو آئیڈیالوجی پر مبنی ہوگا۔ قرآن نے ختم نبوت سے تاریخ انسانیت میں اس نئے دور کا آغاز کیا لیکن تماشا ہے کہ اس دروازے کو بھی خود مسلمانوں نے ہی توڑا۔ اور انہی میں نبوت کے دعویدار پیدا ہو گئے۔ باقی دنیا میں کہیں نبی پیدا نہیں ہوئے۔ ان مدعیانِ نبوت میں ہمارے دور میں قادیان کے مرزا غلام احمد اور ایران کے سید علی محمد باب اور بہاؤ اللہ مشہور ہیں مرزا صاحب کی نبوت کا صغریٰ کبریٰ یہ تھا کہ مسلمان ایک آنیوالے کے انتظار میں ہیں اور وہ آنیوالا میں ہوں۔ اگر وہ آنیوالا مسیح ہے تو مسیح ابن مریم وفات پا چکے۔ اب میں مثیل مسیح کی حیثیت سے آیا ہوں۔ اور اگر وہ امام مہدی ہیں تو امام مہدی میں ہوں۔

لیکن یہ اپنے دعوائے نبوت میں چلمنی انداز سے سامنے آئے یعنی یہ کہا کہ میں نبی تو ہوں لیکن کوئی الگ کتاب نہیں لایا۔ اس کے برعکس باب اور بہاؤ اللہ صاحب نے نبوت کا بھی دعویٰ کیا اور اس کے ساتھ نئی کتاب کا بھی۔ ان کا دعوائے مرزا صاحب کی نسبت زیادہ صاف ہے۔ کیونکہ نبی بغیر کتاب کا تصور ایک بے معنی چیز ہے۔

ایرانی نبوت کا صغریٰ کبریٰ ہندی نبوت سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ چنانچہ زیر تبصرہ کتاب کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

قیامت کے معنی ہیں اٹھ کھڑا ہونا۔ جب کوئی پیغمبر ظاہر ہوتا ہے۔ خدا کے حکم سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ لوگ بھی نئی زندگی میں برپا ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی بعثت سے وفات کے دن تک یوم قیامت کہلاتا ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کی بعثت سے وفات تک یہودیوں کی قیامت تھی جبکہ حضرت عیسیٰ نے قائم ہو کر نئی زندگی میں لوگوں کو برپا کیا اور حضرت رسول اللہؐ کی بعثت سے وفات تک عیسائیوں کی قیامت تھی۔ جبکہ حضرت رسول اللہ نے لوگوں کو نئی زندگی میں برپا کیا۔ اور حضرت باب کی بعثت سے شہادت تک مسلمانوں کی قیامت تھی۔ جب کہ حضرت باب نے لوگوں میں نئی زندگی کی روح پھونکی۔ اور سب کو نئے دور میں برپا کیا۔ اور حضرت بہاؤ اللہ کے ظہور سے صعود تک بابیوں کی قیامت تھی۔ جب کہ حضرت بہاؤ اللہ نے اعلانِ حق کا صور پھونکا۔ اور لوگ نئی زندگی میں کھڑے ہوئے اور تمام دنیا میں نئی لہر چلنے لگی۔ اسی طرح قیامت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اس سے لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کے معنی اٹھ کھڑا ہونا تو ٹھیک ہیں۔ لیکن اس دعوے کے لئے کہ اس سے مراد ایک نئے نبی کا ظہور ہے کیا سند ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی سند خود علی محمد باب اور بہاء اللہ صاحب کی وحی ہے۔

چنانچہ تحریر ہے کہ

خدا نے ایک کتاب حضرت سید علی محمد باب اللہ پر نازل فرمائی جس کا نام "بیان" ہے۔ اس میں نہایت تفصیل سے موت وحیات کی حقیقت، قیامت کی حقیقت، حساب کتاب کی حقیقت، میزان کی حقیقت، جنت دوزخ کی حقیقت، لقائے الٰہی کی حقیقت وغیرہ وغیرہ تمام مسائل شرح وبسط سے خود بیان فرمائے ہیں۔ پھر حضرت بہاؤ اللہ نے کتاب مستطاب "ایقان" میں ان تمام حقائق کا بیان فرمایا ہے۔ . . . . ہمارا معتقد یہ ہے کہ ہم جو تفسیر آیات قرآنیہ کی بیان کرتے ہیں اور فنائے عالم کو قیامت نہیں بتلاتے بلکہ ظہور حق کے ایام کو قیامت کہتے ہیں۔ اس کی بنیاد ہماری تشخص فکر نہیں بلکہ خود خداوند عالم نے اپنے تازہ کلام میں صاف صاف فرما دیا ہے کہ قرآن مجید کی آیات کا یہ مطلب ہے (ص ۳۱۱)

آپ نے اس منطق پر غور فرمایا۔ سوال یہ تھا کہ اس ایرانی نبوت کی دلیل کیا ہے؟ جواب ملا کہ اس کی دلیل لفظ قیامت ہے جو قرآن میں مذکور ہے۔ پوچھا گیا کہ قیامت کا یہ مفہوم کس طرح لیا گیا؟ جواب ملا کہ اس کا مفہوم ان حضرات کو وحی کے ذریعہ ملا۔ یعنی جو دعوےٰ ہے وہی اسکی دلیل بھی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ جن لوگوں کی سمجھ میں اتنی سی بات بھی نہ آئے کہ دعوائے نبوت کی یہ بنیاد کس قدر کمزور اور غلط ہے۔ ان سے حقائق کے متعلق بات کیا کی جائے؟ زیر نظر کتاب میں قیامت کے اسی مفہوم کو اصل قرار دے کر اس کے متعلقات مثلاً موت وحیات، قبر، عذاب قبر، پل صراط، برزخ، نفخ صور، جنت دوزخ وغیرہ کی تاویلات اس طرح کی گئی ہیں جو اس بنیادی مفہوم پر فٹ آ جائیں۔ اس ضمن میں دو ایک دلائل اور بھی ملاحظہ فرمائیے قرآن کریم کی مشہور آیت ہے کہ "خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ اس سے یہ دلیل لائی گئی ہے کہ

ایک ہزار سال پورے ہونے پر دورِ اسلام ختم ہو جائیگا اور قرونِ اولیٰ کے دو سو ساٹھ سال ہیں۔ ان میں ہزار سال ملا کر ۱۲۶۰ سال ہوئے۔ جبکہ قیامت کا صور پھونک دیا گیا۔ اور سنتِ اسلام کے مہدی موعود حضرت سید علی محمد باب نے حکم خداوندی سے نئے دور کا مژدہ سنایا (ص ۱۶۵)

یعنی باب صاحب کا ظہور ۱۲۶۰ھ میں ہوا، اس لئے قرون اولیٰ کے دو سو ساٹھ سال کہلائے۔ اگر ان کا ظہور ۱۳۰۰ھ میں ہوتا تو قرونِ اولیٰ کے تین سو سال شمار کر لئے جاتے۔ اور جب دلیل پوچھی جاتی تو کہدیا جاتا کہ خدا نے ہمیں ایسا ہی بتایا ہے یہ تو رہی زمان کی دلیل۔ اب مکان کی طرف آئیے۔ قرآن میں ہے يَوْمَ يُنَادِي الْمُنَادِ مِن مَّكَانٍ قَرِيبٍ۔ اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ عرب سے قریب، ایران، عراق اور شام ہیں۔" لہذا اس سے بھی ثابت ہوا کہ باب صاحب اور بہاؤ اللہ صاحب خدا کے رسول ہیں۔ غرضیکہ ساری کتاب اس قسم کے دلائل پر مشتمل ہے

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم میں قیامت کا لفظ قوموں کی نشاۃ ثانیہ کے لئے بھی آیا ہے اور اس کے تضمنات میں اکثر الفاظ کا مفہوم اس قسم کے انقلاب پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن اس سے ایک نئے نبی کا مفہوم کسی صورت میں بھی نہیں لیا جا سکتا قرآن نوع انسانی کے لئے خدا کی طرف سے آخری ضابطۂ حیات ہے۔ جس کے بعد وحی کا عقیدہ قرآن کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ اس لئے قرآن کی کسی اصطلاح سے ایسا مفہوم پیدا کرنا جس سے دروازۂ نبوت کھل جاتا ہو۔ قرآن سے کھلا ہوا انحراف ہے۔ اور اس مفہوم پر اٹھائی ہوئی عمارت قرآن کی بہت بڑی تحریف ہے۔

اصل یہ ہے کہ جن لوگوں نے قرآن کے بعد دعوائے نبوت کیا ہے یا جو لوگ ایسے مدعیوں پر ایمان لے آئے ہیں انھوں نے قرآن کی عظمت اور حقیقت کو سمجھا ہی نہیں اور اس نے

(باقی صفحہ ۱۷ پر)

عالم اسلامی

افغانستان کا قضیہ ابھی تک لاینحل پڑا ہے۔ ہر چند شاہزادہ مساعد بن عبدالرحمٰن نے یہ اعلان کیا تھا کہ اصل بنیادی متعلق اتفاق ہو چکا ہے ابھی تک تفاصیل طے نہیں ہو سکیں۔ اب یہ دکھائی دیتا ہے کہ افغانستان اپنے عہد سے پھر گیا ہے۔ گو ذمہ دارانہ طور پر اصل سے متعلق اتفاق کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ اتفاق اس پر ہوا تھا کہ افغانستان میں پاکستانی پرچم کی جو توہین کی گئی اور پاکستانی املاک کو نقصان پہنچایا گیا اسکی مسلمہ قواعد کے مطابق تلافی کی جائے۔ اور اس کے بعد پشاور کے واقعہ کی پانچ قومی کمیشن کے ذریعہ تحقیقات کی جائے اور اگر اس کی ذمہ داری پاکستان پر عائد ہو تو پاکستان بھی انہی قاعدے کے مطابق تلافی کرے لیکن اگر بات یہیں تک ہوتی تو اب تک تفاصیل کا اعلان ہو جانا چاہئے تھا۔ ایسا نہ ہونے سے بجا طور پر اس خدشے کا اظہار کیا جا سکتا ہے کہ افغانستان آمادہ بہ مفاہمت نہیں ۹ر جون کی رات کو کرنل سعادت کے کراچی پہنچنے کی توقع ہے۔ آپ کو مصری حکومت نے مصالحت پر مامور کیا ہے آپ کی آمد سے بظاہر یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ پشاور کے واقعہ کی تحقیقات کیلئے جو پانچ قومی کمیشن بنایا جائیگا اس کے لئے تیاری مکمل ہو چکی ہے۔ کیا واقعی ایسا ہو گیا ہے، اس کا علم آپ کی آمد کے بعد ہو سکے گا۔

عالم اسلامی میں ان دنوں آمد و رفت کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ شاہ ادریس السنوسی بہت جلد ترکی کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔ عراق کے وزیر اعظم نوری السعید انقرہ پہنچ چکے۔ شاہ فیصل بعد میں جا رہے گے۔ صدر جمہوریہ ترکیہ جناب جلال بایار اسی ماہ کے وسط میں لبنان کا دورہ کریں گے (صدر لبنان حال ہی میں ترکی کا دورہ کر چکے ہیں) لبنان سے فارغ ہو کر آپ اردن بھی جائیں۔ اردن کے نئے وزیر اعظم سعید مفتی بغداد جائیں گے وہ عراق سے معاشی مدد حاصل کرنے کے لئے بھی گفتگو کریں گے اور استحکام روابط کے لئے بھی) یہ آمد و رفت علامت ہے ان عوامل اتحاد و یگانگت کی جو عالم اسلامی کی گہرائیوں میں کارفرما ہیں۔ ان میں مزاحمت روا نہ رکھی گئی تو یہ یقیناً مطلوبہ نتیجہ پیدا کر کے رہیں گے۔

غزا میں اسرائیل اور مصر کے مابین کشیدگی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کرنل ناصر نے کہا ہے کہ اگر اب جنگ شروع ہوئی تو وہ باقاعدہ جنگ ہو گی اور اس کا نقشہ ۱۹۴۸ء کی جنگ سے بالکل مختلف ہو گا۔ عرب لیگ کی معرفت دیگر ممالک عرب نے اعلان کیا ہے کہ اگر مصر سے اسرائیل نے جنگ کی طرح ڈالی تو وہ سب مل کر مصر کا ساتھ دیں گے۔ واضح رہے کہ ترکی کے صدر نے لبنان کا دورہ کرتے ہوئے پچھلے دنوں کہا تھا کہ اگر ترکی اور لبنان کا معاہدہ ہو گیا تو اسرائیلی حملہ کی صورت میں ترکی بھی اسرائیل سے جنگ کرے گا۔ یہ بڑا اہم اعلان تھا۔ اگر مصر اس کی اہمیت محسوس کرے تو وہ پاکستان، ترکی اور عراق کے دفاعی سلسلہ میں منسلک ہو کر عالم اسلامی کے اتحاد کو مضبوط تر بنا سکتا ہے۔ اس صورت میں عالم عربی نہیں بلکہ ممالک مسلمہ ایک نقطے پر جمع ہو جائیں گے۔

بین الاقوامی جائزہ

روس اور چین ان دنوں اپنے موقف سے ہٹ کر ان قوتوں کو اپنے حق میں تبدیل کرنے کے لئے بڑی تگ و دو کر رہے ہیں۔ جو میدان سیاست عالم میں توازن پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہیں۔ آسٹریا کو غیر جانبدار بنا کر روس نے ایک طرف مغربی جرمنی کے غیر جانبدار ہونے کی طرح ڈالی اور دوسری طرف یوگوسلاویہ کو دام تزویر میں لینے کی کوشش کی۔ مغربی جرمنی کے چانسلر ڈاکٹر ایڈی نار نے تو صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ وہ اسلحہ بندی سے دستکش نہیں ہوں گے اور مغرب کے حلیف رہیں گے۔ یوگوسلاویہ کے مارشل ٹیٹو سے روسی وزیر اعظم مارشل بلگانن، اور کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری کروشیف نے خود بلگریڈ جا کر ملاقات کی۔ ان دونوں ممالک کے تعلقات ۱۹۴۸ء میں منقطع ہوئے اور اسکے بعد یوگوسلاویہ روس کی نظروں میں مقہور و مغضوب بن گیا ان حالات میں روسی قائدین کا بلگریڈ جانا ایک انہونی سی بات تھی۔ اس کے باوجود وہ گئے اور تعلقات کو نئے قالب میں ڈھالنے سے پہلے انقطاع تعلقات کی ذمہ داری پولیس کے سابق افسر اعلیٰ بیریا پر ڈالی جن کو گذشتہ سال اچانک گدی سے اتار کر گولی کا نشانہ دیا گیا تھا۔

بلگریڈ کے مذاکرات کے بعد جو مشترکہ اعلامیہ شائع ہوا ہے اس سے گو ایک حد تک مترشح ہوتا ہے کہ یوگوسلاویہ نے کہیں کہیں روسی موقف کی تائید کی ہے لیکن اسے روسی ڈپلومیسی کی فتح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بہر کیف ابھی یہ دیکھنا ہے کہ مشترکہ اعلامیہ پر عمل در آمد کیسے ہوتا ہے۔ ایسے نظر آتا ہے کہ یوگوسلاویہ مغرب سے رابطہ منقطع کر کے پوری طرح غیر جانبدار ہونے کے لئے تیار نہیں۔ روسی لیڈروں سے ملاقات ختم کرنے کے بعد مارشل ٹیٹو نے امریکہ، برطانیہ فرانس کے نمائندوں کو ملنے کے لئے بلایا ہے۔ اس کانفرنس کا مقصد اقوام مغرب کو روس کے ساتھ مذاکرات کی تفاصیل سے آگاہ کرنا ہے۔ گویا یوگوسلاویہ روس کے بارے میں رازداری سے کام نہیں لیگا۔

مشرق میں چین نے بھی مصالحت جوئی کا ایک مظاہرہ کیا ہے۔ اس نے چار امریکی ہوابازوں کو رہا کر دیا ہے۔ کوئی پچاس سے اوپر امریکی اسیروں میں سے چار کی رہائی بہت بڑا کارنامہ نہیں لیکن یہ چینی موقف میں تبدیلی ضرور ہے۔ اقوام متحدہ کے جنرل سکریٹری مسٹر ہیمر شولڈ نے اس پر خصوصی اطمینان کا اظہار کیا ہے اور توقع ظاہر کی ہے کہ دوسرے اسیر بھی جلد رہا کر دیئے جائیں گے۔ امریکہ میں بھی اس کا خیر مقدم کیا گیا ہے اور خلاف توقع اور ناقابل یقین بیان ہے امریکہ نے جینوا میں چینی نمائندے کی وساطت سے چین کو براہ راست کہا ہے کہ وہ بقایا قیدیوں کو بھی چھوڑ دے۔ یہ براہ راست تعلق اس لئے اہم ہے کہ امریکہ نے چین کو تسلیم نہیں کر رکھا۔

امریکی ہوابازوں کی رہائی کی شاباش ہندوستان بھی لینے کی کوشش کی ہے۔ مسٹر مینن نے علانیہ طور پر کہا کہ یہ رہائی ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مسٹر ہیمر شولڈ و اجو خصوصیت سے اس کے لئے کوشاں رہے اور چین جا کر قائدین سے بھی ملتے رہے، انھوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا لیکن اس مصلحت سے کچھ کہنا پسند نہ کیا کہ اس سے ان پر اثر پڑیگا جن کی رہائی کے لئے کوشش کی جا رہی ہے۔ مسٹر مینن چین سے آپ آ گئے ہیں اور اب انگلستان میں ہیں اور امریکہ جائیں گے۔ پنڈت نہرو ماسکو کے لئے روانہ ہو گئے ہیں۔ ہندوستان اس آمد و رفت سے دنیا کو یہ یاد کرانا چاہتا ہے کہ ہندوستان بھی دول عظمیٰ میں سے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قیادت ایشیا کا خواب بھی پھر ابھر کر سامنے آ رہا ہے۔ حالانکہ بنڈونگ میں اسے پریشان کر دیا گیا تھا۔ اور مشرق و مغرب میں مصالحت پر پھر توجہ مرکوز کی جا رہی ہے دنیا کو ادھر الجھا کر پنڈت نہرو ایک طرف کشمیر کا معاملہ کھٹائی ڈالے جا رہے ہیں اور دوسری طرف گوا پر قبضہ کرنے کے لئے راستہ صاف کر رہے ہیں یہی دو معاملات ایسے ہیں جن کے لئے انھیں دوسروں کے سامنے شرمسار ہونا پڑتا ہے۔

نقد و نظر

(صفحہ ۱۵ سے آگے)

سمجھنے کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے قرآن کو براہ راست نہیں دیکھا بلکہ ان تفسیروں کے ذریعہ سے سمجھا ہے۔ جو ہمارے ہاں عرصہ سے مروج چلی آ رہی ہیں۔ ان تفسیروں کے ذریعہ سے جو قرآن ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس سے قرآن ایک مکمل اور ابدی ضابطہ حیات تو ایک طرف عام انسانی سطح کی تصنیف بھی دکھائی نہیں دیتا۔ یہ لوگ ان تفسیروں کو دیکھتے ہیں۔ اور ان سے قرآن کا اندازہ لگاتے ہیں۔ جو شخص قرآن کو براہ راست دیکھ لے اس کے کبھی حیطہ تصور میں بھی یہ نہیں آ سکتا کہ اس کتاب کے بعد نوع انسانی کو کسی اور رہنمائی کی بھی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ چہ جائیکہ وہ مرزا صاحب کے الہامات اور سید علی محمد باب اور بہاؤ اللہ صاحب کی پست تصانیف کو خدا کا کلام سمجھنے لگ جائے۔

جو شخص اس قسم کی عربی زبان کو اس خدا کا کلام سمجھے جس نے قرآن نازل کیا ہے۔ اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ

بآدمی نہ رسیدی خدا چہ می جوئی

نمونہ ملاحظہ ہو۔ قیامت کی مناجات میں یہ دعا لکھی گئی ہے

سبحانك اللّٰهم یا الٰهی اسئلك باستوائك علی عرش الظهور وبا سمك الذی به نفخ فی الصور وقام من فی القبور ان تقدّر لی ما ینبغی فی كل عالم من عوالم الملك انك انت المقتدر المشفق الفیاض

یہاں خدا کے لئے مشفق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو خود زبان اور لغت کے اعتبار سے بھی غلط ہے کیونکہ شفقت میں اندیشہ اور خوف کا تصور پایا جاتا ہے۔ جس کا اطلاق خدا پر نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں یہ لفظ کہیں بھی خدا کے لئے استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ ایسے ہی قرآن کریم میں خدا کے لئے نہ فیض کا لفظ استعمال ہوا ہے نہ فیاض کا لفظ۔ اور پھر اللّٰهم اور یا الٰهی پر بھی غور فرمایئے۔ ایک طرف اللّٰهم اور پھر اس

مطبوعات طلوع اسلام

معراج انسانیت از پرویز - سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش - مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں - بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات - اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ - مضبوط و حسین جلد مع گرد پوش ——— قیمت - بیس روپے

ابلیس و آدم از پرویز - سلسلہ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظرثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے - انسانی تخلیق قصۂ آدم - ابلیس - جنات - ملائکہ - وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل - بڑی تقطیع کے ۳۰۷ صفحات ——— قیمت ——— آٹھ روپے

قرآنی دستور پاکستان اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے - اور حکومت علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے - دو سو چوبیس صفحات ——— قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں - اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب ہیں - پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات - جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں - ۱۸۰ صفحات ——— قیمت ——— دو روپے

سلیم کے نام از پرویز - نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں - ان کا شگفتہ، مدلل اور اچھوتا جواب - بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات ——— قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے روزمرہ کی زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث - ۴۰۰ صفحات قیمت ——— چار روپے

اسباب زوال امت از پرویز - مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ایک سو اڑتالیس صفحات ——— قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو - طنز اور تنقید کے گہرے نشتر - سات سالہ دور آزادی کی ہنستی ہوئی تاریخ - ۲۵۶ صفحات ——— قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناس رسول یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول! مزاج شناس کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی - ۴۴۰ صفحات - قیمت ——— چار روپے

مقام حدیث حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب - احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی - دو جلدیں ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد ——— چار روپے

فردوس گم گشتہ از پرویز - ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا - خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف - ۴۱۲ صفحات ——— قیمت چھ روپے

نوادرات از علامہ اسلم جیراجپوری - علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ - چار سو صفحات ——— قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت از پرویز - مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ - رہنے سہنے کے ڈھنگ - سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات - انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں - صفحات ۱۹۲ ——— قیمت دو روپے

نظام ربوبیت از پرویز - انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور دور حاضرہ کی عظیم کتاب - ضخامت تین سو صفحے - قیمت قسم اول ——— چھ روپے قسم دوم ——— (غیر مجلد) ——— چار روپے

اقبال اور قرآن از پرویز - علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ - ڈسٹ کور کے ساتھ - صفحات ۲۵۶ قیمت دو روپے

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ - محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ: ادارۂ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ - کراچی

مطبوعات طلوع اسلام کی شرائط ایجنسی

شرح کمیشن

معراج انسانیت ——— ۱۵ فی صدی - دیگر مطبوعات ۳۳ فی صدی (۲) قیمت بعد وضع کمیشن بذریعہ وی پی وصول کی جائیگی - (۳) غیر فروخت شدہ کتب واپس نہیں لی جائیں گی - (۴) پہلی فرمائش پچاس روپے (بعد وضع کمیشن) سے کم کی نہیں ہونی چاہیئے - (۵) ہر آرڈر کے ہمراہ کم سے کم چوتھائی رقم پیشگی آنی چاہیئے - ورنہ تعمیل نہیں ہو سکے گی

نوٹ: - کراچی کے ایجنٹ صاحبان دفتر طلوع اسلام سے معاملہ طے کریں -

ناظم ادارۂ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ - کراچی

طلوع اسلام کثیر تعداد میں شائع ہو کر پاکستان و ہندوستان کے علاوہ غیر ممالک میں ہر طبقے کے لوگوں کے پاس جاتا ہے - اس میں چھپنے والے اشتہارات ہزاروں خریداروں کی نظروں سے گذرتے ہیں -

نرخنامہ اشتہارات، و تفصیلات ناظم ادارہ (شعبۂ اشتہارات) سے حاصل کیجئے -

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ - کراچی

ماہنامہ طلوع اسلام کے پرانے پرچے

ماہنامہ طلوع اسلام کے جو پرانے پرچے دفتر میں موجود ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے -

۱۹۴۹ء	اگست، ستمبر، نومبر، دسمبر
۱۹۵۰ء	نومبر
۱۹۵۱ء	مارچ تا نومبر
۱۹۵۲ء	اگست تا نومبر
۱۹۵۳ء	جنوری کے علاوہ سب
۱۹۵۴ء	پورے سال کے

یہ پرچے بزماے طلوع اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دیدیئے جائیں گے - خواہشمند حضرات اپنی فرمائشیں جلد بھیجیں - ورنہ پرچے ختم ہو جانے کا احتمال ہے -

ناظم ادارۂ طلوع اسلام ——— کراچی

جاوید پریس میکلوڈ روڈ کراچی

تقاضائے انصاف

(ص ۶ سے آگے)

نصف درجن اسیران مارشل لا کو کیوں قابل رہا نہیں سمجھا جاتا؟ کیا اس لئے کہ کوئی جماعت ان کے لئے طوفان احتجاج کھڑا نہیں کر سکتی؟ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی سزائیں لمبی ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا جرم سنگین تر ہے تو مولانا مودودی اور مولانا نیازی کے بارے میں کیا کہا جائے گا۔ جنھیں پہلے سزائے موت دی گئی تھی اور بعد میں اسے چودہ سال کی قید با مشقت میں تبدیل کر دیا گیا تھا؟ ہمیں ان حضرات کے جرم سے کوئی سروکار نہیں لیکن ان کی سزا ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا جرم سنگین ترین تھا۔ اس کے بعد فرق صرف یہ رہ جاتا ہے کہ جماعت اسلامی کے یہ "اعاظم رجال" تھے۔ ان کی سزائیں بیرونی دباؤ کی وجہ سے کم کر دی گئیں اور دوسرے معمولی آدمی ہیں جن کا کوئی پرسان حال نہیں اس لئے ان کی سزائیں بدستور سابق ہیں کیا حکومت کو افراد مملکت میں اس قسم کا فرق کرنا زیب دیتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جن غریبوں کا کوئی پوچھنے والا نہیں ان کا حکومت پر ان سے کہیں زیادہ حق ہے۔ جن کے لئے ذرا ذرا سی بات پر ہنگامے برپا کر دیئے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ باقیماندہ اسیروں کو بھی قید و بند سے رہا کر دے یا ملک کو بتلائے کہ انھیں کیوں چھوڑا گیا ہے اور انھیں کیوں نہیں چھوڑا جا سکتا؟۔

سیاست کے کھیل

ملک فیروز خاں نون نے وزارت کی برطرفی کے بعد جو بیانات دیئے ہیں ان میں ایک بات جو نمایاں طور پر سامنے آتی ہے یہ ہے کہ ارباب حکومت (یعنی وہ لوگ جو ابھی تک ایوان حکومت میں موجود ہیں) اپنے ذاتی استحکام و بقا میں مصروف اور جمہوری اقتضاآت سے بے پروا ہو کر آمریت کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ چنانچہ مجلس دستور ساز کے انتخابات سے متعلق قواعد پر تنقید کرتے ہوئے آپ نے مرکزی حکومت کو "مرکزی ڈکٹیٹرشپ" کے نام سے یاد کیا ہے۔ اسی بیان میں آپ نے یہ بھی بتایا ہے کہ کس طرح یہ "ڈکٹیٹرشپ" اپنے جی حضوریوں کو مجلس دستور ساز کیلئے منتخب کرانا چاہتی ہے اور کس طرح پنجاب کے گورنر سادہ کاغذوں پر ارکان اسمبلی سے دستخط لے رہے ہیں۔ تاکہ کوئی ناخواندہ منتخب نہ ہو سکے۔ وغیرہ وغیرہ

سردست اس سے بحث نہیں کہ ملک صاحب نے جن رازہائے درون پردہ کو بے نقاب کیا ہے وہ کس حد تک قابل نفرت و لائق مذمت ہیں۔ اس وقت ہمیں اس نقطہ کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ اب تک دیکھا یہ گیا ہے کہ جبتک کوئی شخص ایوان حکومت کے اندر رہتا ہے وہ اپنی اور اپنے رفقاء کی حسن کارکردگی میں رطب اللسان رہتا ہے اور جب اسے کسی نہ کسی وجہ سے اس ایوان سے نکلنا پڑتا ہے تو وہ ان لوگوں کے خلاف جو ابھی تک اس ایوان کے اندر ہوتے ہیں ہمہ تن تنقید بن جاتا ہے۔ مگر ملک صاحب قیام پاکستان سے لے کر اب تک مسلسل میدان سیاست میں رہے ہیں اور انھوں نے ہمیشہ حکمران پارٹی کا ساتھ دیا ہے یعنی وہ پارٹی جسے آج وہ "مرکزی ڈکٹیٹرشپ" قرار دے رہے ہیں۔ ہم ملک صاحب سے پوچھتے ہیں کہ ان پر یہ عقدہ کب کھلا کہ یہ طائفہ آمرین ہے؟ کیا گورنر اور وزیر رہتے ہوئے وہ یہ کچھ نہ بھانپ سکے اور جب "ملک ہاتھوں سے گیا" تو ان کی آنکھیں کھلیں؟

یہ کچھ ملک صاحب پر ہی موقوف نہیں۔ اور اس وقت ہم تنہا انہی کو مورد الزام نہیں ٹھہراتے کیونکہ یہ انداز ہر وہ شخص اختیار کر لیتا ہے جس کے ہاتھ سے حکومتی عہدے چھن جاتے ہیں۔ آپ کسی سابق وزیر کے بیانات کو لیجئے ان میں یہ رنگ نمایاں ہوگا۔ اس وزیر کے ان بیانات کو دیکھا جائے جو اس نے برطرفی سے پہلے دیئے تھے وہ سارے کے سارے اس "ڈکٹیٹرشپ" کی حمایت میں ہونگے یہی نہیں اس کے بعد اسی شخص کو پھر سے وزیر بنا دیجئے، اس کے بیانات کا انداز یکسر بدل جائیگا اور یوں معلوم ہوگا جیسے وہ اور ان کے رفقاء بالکل معصوم ہیں۔ اور وہ وہی کچھ کریگا جو اس کے ساتھی کر رہے ہوں گے اور جسے وہ حکومت سے علیحدہ ہو کر آمریت اور کیا کیا کچھ قرار دے چکا تھا۔

آپ حیران ہوں گے کہ ان ارباب سیاست میں اتنا بدیہی تضاد کیوں پایا جاتا ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ یہ انداز پستی سیرت کا کھلا ہوا غماز ہے لیکن اس میں سارا قصور انہی لوگوں کا نہیں اس میں خود قوم کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ قوم کی حالت یہ ہے کہ جب کوئی شخص وزیر بنتا ہے تو وہ آنکھ بند کر کے بے تعلق ہو جاتی ہے اور مطلق نہیں دیکھتی کہ وہ کیا کر رہا ہے اور اس کے ساتھی کیا کر رہے ہیں۔ لیکن جب اسے باہر نکال دیا جاتا ہے اور وہ دل کی بھڑاس نکالتا ہے تو اس کی "حق گوئی" کی داد دیتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ اسے فی الواقعہ حق گوئی سمجھتی ہے بلکہ اس لئے کہ اس کو دوسروں کی پگڑی اچھلتی ہے اور ہماری قوم کو ہر اس حرکت میں لذت ملتی ہے جس سے کسی کی ذلت ہو رہی ہو۔ اگر قوم احتساب کا فریضہ منصبی ادا کرے اور ارباب حکومت کے اقوال و اعمال پر مسلسل کڑی نگرانی رکھے تو یہ تضادات بھی رفع ہو جائیں اور سیاست اصول و اخلاق کے قالبوں میں بھی ڈھل جائے۔

ان "محرومین" کے ٹولے کو دیکھکر ہمارا دل دھڑکتا رہتا ہے کہ خدا خیر کرے۔ ان میں ہر روز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور اب حالت یہ ہے کہ ان کی ایک مستقل برادری بن چکی ہے جو حکومت کے ایوان سے نکالا جاتا ہے سیدھا اس برادری کے پاس جاتا ہے اور پھر یہ سب ملکر "ملک و ملت کی بہبودی" کے لئے جو منصوبے باندھتے رہتے ہیں ان سے سب واقف ہیں۔

عہد حاضر کے نوجوان
کا
مسئلہ کیا ہے اور حل کیا؟
اسے
"سلیم کے نام"
میں دیکھئے

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ہوگا اسی قدر قرانی فکر عام ہوگا اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ہے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا دس روپے* کی ماہانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تا آنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ہوجائے۔ اس طرح - - -

- آپ کی پیشگی رقم سے ہمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اب شامل ہوجائیے۔

★ پہلے ماہانہ قسط کی رقم کم سے کم پچیس روپے تھی لیکن اب متعدد قارئین کے اصرار پر اسے بدل کر دس روپے کر دیا گیا ہے۔ جو احباب دس روپے سے زیادہ قسطیں دینا چاہیں وہ دے سکتے ہیں۔

معاملہ کی ضروری باتیں

- ★ طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ہی برتاؤ کریگا۔
- ★ حساب میں بعض اوقات غلطی ہوسکتی ہے۔ ایسی غلطی باہمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے۔
- ★ رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
- ★ مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے۔
- ★ پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ہفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
- ★ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ہفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳۔ کراچی۔ ۳

کمیونزم

انسان کے معاشی مسئلہ کا وہ حل ہے جسے تنہا عقل نے دریافت کیا۔

لیکن اس میں انسانی زندگی اور حیوانی زندگی میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ دونوں کی زندگی طبعی ہے جس کا خاتمہ موت کر دیتی ہے۔

قرآن

اس مسئلہ کا جو حل دیتا ہے اس سے انسان اس زندگی کی خوشگواریاں بھی حاصل کرتا ہے اور اگلی زندگی میں ارتقائی منازل طے کرنے اور آگے بڑھنے کے قابل بھی ہوجاتا ہے۔

یہ حل کیا ہے؟

اس کا جواب آپ کو

✡ نظام ربوبیت ✡

(از - پرویز)

میں ملیگا۔

قسم اول: کاغذ سفید کرنافلی جلد مضبوط مع گردپوش - چھ روپے
قسم دوم: کاغذ میکانیکل صرف گرد پوش کے ساتھ - چار روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۴۳۱۳ - کراچی-۳

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Jawed Press, McLeod Road, Karachi. Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1, Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi. Editor: KHURSHID ALAM

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار طلوعِ اسلام کراچی

جلد نمبر ۸ شمارہ ۲۰	کراچی: ہفتہ - ۱۸ - جون ۱۹۵۵ء	قیمت چار آنہ سالانہ دس روپے

قرآن نے کیا کہا؟

فرقے مٹتے ہیں خالص قران کی اطاعت سے اور خالص قران کی طرف دعوت سے ان لوگوں کے دلوں میں سخت کبیدگی اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔ نفرت اور کبیدگی ہی نہیں بلکہ اس قدر دشمنی اور عداوت پیدا ہوجاتی ہے کہ جو شخص ان کے سامنے قران پیش کرے، ان کا جی چاہتا ہے کہ اسے جان سے ماردیں۔ واذا تتلیٰ علیھم آیتنا بینت تعرف فی وجوہ الذین کفروا المنکر۔ اور جب ان کے سامنے ہمارا واضح قانون پیش کیا جاتا ہے تو جو لوگ (خالص قران کے) ماننے سے انکار کرتے ہیں تو دیکھیگا کہ اس انکار کی علامتیں ان کے چہرے پر کس طرح ابھر کر آجاتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ۔ یکادون یسطون بالذین یتلون علیھم آیاتنا۔ (۲۲/۷۲) قریب ہے کہ وہ ان لوگوں پر جو قران پیش کرتے ہیں جھپٹ کر حملہ کردیں۔ اور ان کے بس میں ہو تو انہیں جان سے ماردیں۔ اس جرم کی پاداش میں کہ وہ خالص خدا کی طرف دعوت کیوں دیتے ہیں۔ ان کے خود ساختہ خداؤں کی شریعت کو بھی اس کے ساتھ کیوں نہیں ملاتے۔

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ....

1. تنہا انسانی عقل زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اس طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح حضرت محمدؐ کو عطا ہوئی تھی۔
2. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوع انسانی اس قرآن کے بغیر اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔
3. حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ جو روایات قرآن کے خلاف ہیں وہ صحیح نہیں۔ جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔
4. حضور نبی اکرم انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن بعض سازشوں نے ہماری تاریخ میں ایسی چیزیں شامل کر دی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری تاریخ کا یہ تمام حصہ خواہ وہ کسی کتاب میں ہو، بکسر غلط اور وضعی ہے۔ حضورؐ کی سیرت کا معیار خود قرآن کریم ہے۔
5. قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔
6. اس عالمگیر نظام زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انہیں قانون شریعت کہا جاتا ہے)۔ یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔
7. اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اسے ربوبیت عامہ یعنی تمام نوع انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
8. ربوبیت عامہ کے مقصد عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے "قرآنی نظام ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ....

پہلے پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں اس قرآنی نظام ربوبیت کا نفاذ ہو جائے تاکہ صفات خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی ذاتی صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو سکے اور اس طرح "زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"۔

اگر آپ طلوع اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوع اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ اسلامی نظام
★ عقل انسانی اور وحی خداوندی کے دئے ہوئے معاشی نظام
★ سلیم کے نام
★ حقائق و عبر
★ پنڈت نہرو کی خارجہ حکمت عملی
★ تاریخی شواہد
★ بین الاقوامی جائزہ
★ ایک اہم سوال
★ اسلام کی سرگزشت
★ عالم اسلامی
★ نظام ربوبیت
★ مجلس اقبال
★ بزم طلوع اسلام

ابلیس و آدم

حیات کا سلسلہ ارتقاء ۔ انسان کی تخلیق ۔ ابلیس و آدم کی آویزش
وحی کی حقیقت ۔ مقام رسالت ۔

یہ اور ایسے دیگر اہم عنوانات سے متعلق تفصیلی مباحث ۔

ضخامت ۳۷۶ قیمت آٹھ روپے

اسلامی نظام

قیمت -/-/۲ روپے

اسبابِ زوالِ اُمت

قیمت -/۸/۱ روپیہ

سلیم کے نام خطوط

نوجوانوں کو زندگی کے طوفان سے آشنا کرنے
کی کامیاب کوشش ۔

صفحات ۳۰۸ قیمت چھ روپے

فردوس گم گشتہ

انسان نے کون سی جنت کھوئی اور اسے
کیسے دوبارہ حاصل کیا جاسکتا ہے ؟
اس سوال کا نرالا جواب

صفحات ۳۱۲ قیمت چھ روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ ۔ کراچی ۔ ۳

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار

طلوعِ اسلام

جلد ۸ ۱۸ جون سنہ ۱۹۵۵ء نمبر ۲۰

اسلامی نظام

اب جبکہ ایک جدید مجلس آئین ساز زیرِ تشکیل ہے پاکستان کے آئین کے متعلق پھر مختلف حلقوں میں باتیں چھڑ رہی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ بلند آواز یہی سنائی دے رہی ہے کہ پاکستان کا نظام اسلامی ہونا چاہیئے، بلکہ یہ کہ یہ نظام اسلامی ہوگا اور ہو کر رہے گا۔

جہاں تک پاکستان کے نظام کے اسلامی ہونے کا تعلق ہے آپ اس کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے اور اس کے بعد اس کا مطالبہ ہو کہ وہ جس سرزمین میں زندگی بسر کر رہا ہے اس کا نظام اسلام کے خلاف ہو؟ اس میں شبہ نہیں کہ ملک میں کچھ لوگ ایسے ضرور پائے جاتے ہیں جن کا خیال ہے کہ اسلامی نظام ایک وقتی پروگرام تھا جو تیرہ سو سال پہلے ایک خاص خطۂ زمین میں کچھ دنوں کے لئے رائج رہا۔ اب دنیا اس مقام سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ اس لئے اس دور میں وہ نظام قابلِ عمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر آپ ان حضرات کے نظریہ، دعویٰ اور اس کے دلائل کا تجزیہ کریں تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ وہ دراصل اس جامد نظام کو ناقابلِ عمل تصور کرتے ہیں جسے مولوی صاحبان عین اسلام کہہ کر پیش کرتے ہیں اور چونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس قسم کا نظام اس دور میں چل نہیں سکتا، اس لئے وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اسلامی نظام ایک خاص ماحول میں چل سکتا تھا۔ اب زمانہ اس سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کے اس اعتراض سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ وہ درحقیقت اسلامی نظام نہیں چاہتے۔ اس سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ اتنا ہی ہے کہ یہ اس نظام کو آج کے ماحول میں قابلِ عمل نہیں سمجھتے جسے مولوی صاحبان اسلامی نظام کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ اور مولوی صاحبان کی مراد بھی چند جرموں کی شرعی سزائیں یا چند فقہی احکام ہوتے ہیں۔ ایک مملکت کے نظام کا تصور ان کے ذہن میں نہیں آتا۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس سے خائف ہیں کہ اسلامی نظام میں اخلاقی پابندیوں پر بہت زور دیا جائے گا۔ اور ان کی خلاف ورزی پر سخت مواخذہ ہوگا۔ اس لئے وہ نہیں چاہتے کہ یہاں اس قسم کا نظام نافذ ہو۔ اگر آپ غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس قسم کے لوگوں کا شمار اس طبقہ میں ہے جو جرائم کا خوگر ہو چکا ہوتا ہے۔ اس طبقہ کے نزدیک اسلامی نظام تو ایک طرف، کسی قسم کا نظام بھی خوش آئند نہیں ہو سکتا۔ چور کب چاہتا ہے کہ ملک میں تھانے قائم ہوں، میزانِ عدل نصب کی جائے، جیل خانے بنیں پولیس اور سپاہ رکھی جائے۔ لہٰذا یہ طبقہ اس باب میں درخورِ اعتنا ہی نہیں۔

لیکن ان دونوں طبقوں کو اگر شمار میں بھی لے لیا جائے تو ان کی تعداد بہت قلیل ہے۔ اس لئے یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ ملک کی بہت بڑی اکثریت اسلامی نظام ہی چاہتی ہے۔ بنابریں، اگر سابقہ مجلس آئین ساز کی زندگی میں ملک کے آئین و نظام کے اسلامی ہونے کے متعلق کچھ حتمی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا، تو یہ اس لئے نہیں تھا کہ یہاں مذکورہ صدر دو طبقات موجود ہیں۔ اس کا سبب کچھ اور تھا۔ اور وہ سبب یہ تھا کہ اسلامی نظام کے متعلق اس قدر شور و شغب کے باوجود یہ متعین ہی نہیں ہو سکا (نہ اب تک ہو سکا ہے) کہ اسلامی نظام کہتے کسے ہیں؟ یہاں ہر فرقے اور ہر پارٹی کے نزدیک اسلامی نظام کا مفہوم مختلف ہے۔ آیئے! اس باب میں ذرا صاف صاف بات کریں۔ یہاں شیعہ اور سنّی بستے ہیں۔ پھر سنّیوں میں اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ ہیں۔ پھر اہلِ فقہ میں متشدد طبقے، مثل رضاخانی، اور معتدل طبقے مثل دیوبندی ہیں۔ اگر اس سے آگے نہ بڑھا جائے۔ اور اس تقسیم کو یہیں تک رہنے دیا جائے تو

(۱) ہم سب سے پہلے شیعہ حضرات سے دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ جس نظام کو سنی حضرات اسلامی نظام کہتے ہیں، کیا ان کے نزدیک بھی وہی نظام اسلامی ہے؟ اور

(۲) ہم سنی حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ جو نظام شیعہ حضرات کے تصور کے مطابق ہے کیا آپ اسے اسلامی نظام سمجھتے ہیں! پھر

(۳) ہم اہلِ حدیث حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں، کہ جو نظام اہلِ فقہ کے نزدیک اسلامی ہے، کیا وہی آپ کے نزدیک بھی اسلامی ہے؟ اور

(۴) اہلِ فقہ میں سے ہم دیوبندی حضرات سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جس نظام کو رضاخانی حضرات اسلامی کہتے ہیں، کیا آپ بھی اسے اسلامی ماننے کو تیار ہیں؟ اور

(۵) رضاخانی حضرات سے ہم پوچھتے ہیں کہ اسلامی نظام کی جو تعبیر اہلِ دیوبند کے نزدیک صحیح ہے۔ کیا آپ کے نزدیک بھی وہ تعبیر درست ہے؟

(۶) پھر ان سب سے الگ ہم جماعت اسلامی سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اوپر کے مختلف طبقات میں سے وہ کونسا طبقہ ہے جس کی طرف سے پیش کردہ نظام کو آپ اسلامی نظام قرار دینے کے لئے تیار ہیں؟ اور اگر ان میں سے کسی کا پیش کردہ نظام بھی آپ کے نزدیک اسلامی نہیں تو پھر ہم اوپر کے تمام طبقات سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا آپ کے نزدیک جماعت اسلامی کی طرف سے پیش کردہ نظام اسلامی ہے؟

ہم قارئین سے درخواست کریں گے کہ آپ ان معروضات پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ اس کے بعد یہ کیجئے کہ ارباب مذہب میں سے جو صاحب بھی آپ کے قریب رہتے ہیں ان سے ملئے اور

(۱) ان سے دریافت کیجئے کہ اوپر کے مختلف گروہوں میں سے ان کا تعلق کس سے ہے۔ اور اس کے بعد

(۲) ان سے پوچھئے کہ ان کے گروہ کے علاوہ باقی جتنے گروہ بھی ہیں اگر ان میں سے کسی کے پیش کردہ نظام کو یہاں اسلامی نظام کی حیثیت سے نافذ کر دیا جائے۔ تو کیا وہ نظام ان کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا؟

آپ ان سے ان سوالات کا جواب بالکل واضح، غیر مبہم، متعین اور دو ٹوک انداز میں لیجئے۔ یہ جواب آپ کو خود بتا دے گا کہ اس باب میں حقیقت کیا ہے۔

کہدیا جائے گا کہ سابقہ آئین سازی کی کوششوں کے دوران میں ملک کے مختلف فرقوں کے اکتیس علماء نے متفقہ طور پر مطالبہ کیا تھا کہ ملک کا آئین کتاب و سنت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ان حضرات نے یہ متفقہ مطالبہ پیش کیا تھا لیکن جب آپ اس مطالبہ کا خفیف سا تجزیہ بھی کریں گے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ اس متفقہ مطالبہ میں اتفاق کی رمق تک بھی نہ تھی۔ یہ بات آپ کی سمجھ میں یوں آئے گی کہ

(۱) آپ شیعہ، سنّی، اہلِ حدیث، اہلِ فقہ، دیوبندی رضاخانی اور جماعت اسلامی میں سے کسی سے پوچھئے کہ ان کا مسلک کتاب و سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا دعوےٰ ہوگا کہ ان کا مسلک کتاب و سنت کے مطابق ہے۔ اس کے بعد

(۲) آپ ان میں سے کسی ایک سے (مثلاً شیعہ حضرات سے) پوچھئے کہ ان کے مقابلہ میں دوسرے فریق (مثلاً سنیوں) کا مسلک کتاب و سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ وہ صاف کہدیں گے کہ نہیں! کتاب و سنت کے مطابق مسلک صرف انہی کا ہے، فریق مقابل کا نہیں۔ اور

(۳) ان سب کو چھوڑ کر آپ جماعت اسلامی والوں سے پوچھئے کہ کیا ان کے نزدیک ان مختلف گروہوں میں سے ہر ایک کا مسلک کتاب و سنت کے مطابق ہے؟ اگر ہر ایک کا نہیں تو وہ کونسا گروہ ہے جس کا مسلک کتاب و سنت کے مطابق ہے؟

ان جوابات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ جب ان مختلف طبقات سے متعلق علماء کرام نے یہ متفقہ مطالبہ پیش کیا تھا کہ ملک کا نظام کتاب و سنت کے مطابق ہونا چاہیئے تو ان کا مطلب کیا تھا؟ مطلب صاف یہ تھا کہ ملک کا نظام اس "کتاب و سنت" (یا کتاب و سنت کی اس تعبیر) کے مطابق ہونا چاہیئے جو اس کے فرقے کے نزدیک درست ہے۔ اگر آپ کو اس میں کوئی شبہ ہو تو آپ آج بھی ان فرقوں سے پوچھ کر دیکھ لیجئے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔

کہدیا جائے گا کہ ان مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات محض فروعات میں ہیں۔ اصل کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں۔ ذرا اس دعوے کو بھی پرکھ کر دیکھئے کہ کہاں تک صحیح ہے "اصل و فرع" کی زیادہ باریک اور لطیف بحث کو چھوڑیئے اس میں تو کسی کو بھی اختلاف نہیں ہوگا کہ ایک مملکت میں سب سے اہم اور اصولی سوال یہ ہوتا ہے کہ ملک کے لئے قانون سازی کا اختیار کسے ہے اور اس اختیار کی حدود کیا ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسلامی نظام اس بنیادی اور اصولی بات کو تو ضرور متعین کرے گا آپ اس اصولی سوال کو لے کر

(۱) شیعہ حضرات کے پاس جایئے اور ان سے پوچھئے کہ کیا نمائندگان امت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ باہمی مشاورت سے اپنا کوئی امیر چن لیں (اور وہ امیر، امیر برحق قرار پاجائے) اور کوئی قانون بنالیں۔ یا یہ حق صرف ان کے ائمہ کرام تک ہی محدود تھا۔

(۲) آپ اہل حدیث حضرات کے پاس جایئے۔ اور ان سے پوچھئے کہ کیا نمائندگان امت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کوئی ایسا قانون بنالیں جو بخاری شریف کی کسی حدیث کے خلاف جاتا ہو، خواہ وہ حدیث اہل فقہ (احناف) کے نزدیک ضعیف ہی کیوں نہ ہو؟

(۳) آپ حنفی حضرات سے پوچھئے کہ کیا نمائندگان قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کوئی ایسا قانون بنالیں جو فقہ حنفی کے کسی مسلّم قانون کے خلاف جاتا ہو۔ خواہ فقہ کا وہ قانون اہل حدیث کے نزدیک خلاف سنت ہی کیوں نہ ہو؟

اس سے بھی آگے بڑھیئے۔ اسلامی نظام کا اصل الاصول یہ بتایا جاتا ہے کہ اس میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو۔ آپ

(۱) شیعہ حضرات سے پوچھئے کہ جس چیز کو سنی سنت کہتے ہیں۔ کیا آپ کے نزدیک بھی وہی سنت ہے؟

(۲) یہی سوال آپ اہل حدیث اور اہل فقہ سے بھی کیجئے

پھر

(۳) آپ ان سب سے پوچھئے کہ سنت رسول اللہ کہاں سے مل سکیگی۔ یعنی وہ کونسی کتاب کے اندر ہے؟ اگر وہ کہیں کہ سنت رسول اللہ نبی اکرمؐ کے ثابت شدہ طریقہ کو کہتے ہیں۔ تو ان سے پوچھئے کہ حضورؐ کا وہ ثابت شدہ طریقہ کہاں سے ملے گا؟ اور کیا تمام مسلمانوں کے نزدیک حضورؐ کا ثابت شدہ طریقہ وہی تھا

جو کچھ ہم نے اوپر لکھا ہے۔ آپ اس پر اچھی طرح غور کیجئے، اور سوچئے کہ ان حالات میں ان حضرات کے نقاط نگاہ کی رو سے اسلامی نظام کا کوئی متعین اور متفق علیہ نقشہ متشکل ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں (دیگر جماعتوں کا تو علم نہیں) البتہ جماعت اسلامی والے (حسب عادت) یہ کہدیں گے کہ طلوع اسلام نے یہ شاخسانہ، حکومت کے ایماء سے، اس لئے چھیڑا ہے کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ یہاں اسلامی نظام بن ہی نہیں سکتا۔ اور ان میں سے زیادہ "معتبر" لوگ شاید یہ بھی کہدیں کہ اس کے معاوضہ میں حکومت کی طرف سے اتنا روپیہ طلوع اسلام کو ملا ہے۔ آپ ان سے اتنا کہیئے کہ یہ سب کچھ درست سہی لیکن آپ اتمام حجت کے لئے ان باتوں کی وضاحت کر دیجئے جو اوپر پیش کی گئی ہیں تاکہ "حکومت" کی یہ مشئوم کوشش نامراد رہ جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ یہ بھی نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ ان امور کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔

اس کے بعد آپ کے دل میں لازماً یہ سوال پیدا ہوگا کہ طلوع اسلام خود بھی تو اسلامی نظام کا شدت سے حامی ہے۔ اور اس کے نزدیک پاکستان کے حصول کا مقصد ہی یہ تھا کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو سکے۔ اور اس کے ساتھ ہی طلوع اسلام کی پیش کردہ صورت سے منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہی نہیں ہو سکتا تو طلوع اسلام ان دونوں متضاد شکلوں میں توافق کی کیا راہ سمجھتا ہے؟ یہ سوال واقعی اہم ہے۔ اور اس کا جواب ہمارے ذمے ہے۔ یہ جواب آئندہ قسط میں پیش کیا جائیگا جہاں یہ بھی بتایا جائے گا کہ اسلامی نظام کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے۔ یعنی اس سے افراد مملکت پر کیا اثر پڑے گا۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

نہرو کی خارجہ حکمت عملی

پنڈت نہرو کے دورہ روس سے متعلق جو اطلاعات اخباروں میں اب تک شائع ہوئی ہیں۔ ان سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ وہ ایک خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہندوستان کے حق میں کیسا رہے گا۔ ہمیں اس سے سروکار نہیں کیونکہ یہ ہندوستان کا اپنا معاملہ ہے۔ اور ہم اس میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ لیکن اس کا نتیجہ اس کے ہمسایوں بالخصوص پاکستان کے لئے ایسا نہیں ہوگا جس کا وہ دلچسپی اور اطمینان قلب سے تصور کر سکیں۔ مثلاً ماسکو کی ایک اطلاع سے پتہ چلتا ہے کہ ۸ جون کو ایک دعوت میں روسی وزیر اعظم مارشل بلگانن نے پنڈت جی کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ "روس تین ایشیائی بڑوں — روس چین اور ہندوستان — کا ایک نیا اتحاد متشکل کرنا چاہتا ہے" اس اعلان کے مضمرات کو کما حقہ سمجھنے کے لئے ہمیں پنڈت جی کی اس پالیسی کا جائزہ لینا ہوگا۔ جو وہ بیرون ملک مسلسل اختیار کئے ہوئے ہیں۔

تقسیم سے پہلے برسر حکومت آتے ہی پنڈت جی نے قیادت ایشیا کا خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اس خواب کی عملی تعبیر کے لئے مغربی استعماریت کی مخالفت شروع کر دی اور غیر جانبداری کا نعرہ بلند کیا۔ ان کی چال یہ تھی کہ اگر اقوام مغرب بساط ایشیا سے بے دخل ہو جائیں۔ تو ان کے لئے راستہ صاف ہو جائے گا۔ اور اگر وہ از خود واپس نہ جائیں تو "استعماریت" کے خلاف اور غیر جانبداری کے حق میں فضا پیدا کر کے ان کا ایشیا میں رہنا ناممکن کر دیا جائے۔ یہ مطالبات ایسے تھے جو روس اور چین جیسے اشتراکی ممالک کی طرف سے بھی پیش ہو رہے تھے۔ اس طرح ہندوستان اور اشتراکی ممالک کی پالیسی میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ ہندوستان نے اس میں دو فوائد دیکھے۔ ایک یہ کہ اس ہم آہنگی کو دیکھ کر امریکہ اس کی زیادہ سے زیادہ مدد کرے گا۔ اور دوسرے یہ کہ چین اسے حریف سمجھنے کی بجائے اپنا حلیف سمجھے گا۔ اور اس طرح اس کی قیادت کی راہ میں مزاحم نہیں ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا امریکہ نے اس خیال سے ہندوستان کو دل کھول کر مدد دینا شروع کر دی کہ شاید اس طرح وہ کمیونسٹ ہونے سے بچ جائے۔ اور چین نے اس کی اس لئے جا و بے جا حمایت و تائید شروع کر دی کہ اس طرح ہندوستان رفتہ رفتہ اس کے حلقے میں آجائے گا۔ حالات کے بے لاگ مطالعہ سے یہ حقیقت بخوبی روشن ہو جاتی ہے کہ اس تثلیثی جنگ و دو میں چین کا پلڑا بھاری رہا۔ ہندوستان مدد تو امریکہ سے لیتا رہا لیکن ساتھ چین کا دیتا رہا۔ جنوری ۱۹۵۴ء کی برلن کانفرنس، اپریل کی جینوا کانفرنس اور کولمبو کانفرنس۔ دسمبر کی بندونگ کانفرنس اور فارموسا سے متعلق مذاکرات اس کی بین اور ناقابل تردید شہادتیں ہیں۔ ہندوستان نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ کوریا اور ہند چینی میں اشتراکی چین کی جنگ لڑتا بلکہ اس نے مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا میں امریکہ کی قیادت میں متشکل ہونے والی دفاعی تنظیموں کو روکنے میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا۔ امریکہ نے ایک حد تک اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی اور کوریا کی صلح کانفرنس میں ہندوستان کو اس خیال سے شریک نہ ہونے دیا کہ اس کا ووٹ چین کے لئے مخصوص ہوگا۔ لیکن اس نے اس سے زیادہ کچھ نہ کیا۔

امریکہ کی طرف سے نیم دلانہ مزاحمت دیکھ کر ہندوستان کمیونسٹ چین کی طرف اور زیادہ جھک گیا۔ چنانچہ چو این لائی بھی دہلی آئے۔ اور پنڈت جی بھی پیکنگ گئے۔ اور وہ اس طرح گھل مل گئے کہ پنڈت نہرو کی کامیابی کو کمیونزم کی کامیابی تصور کیا جانے لگا۔ اس کا ثبوت آندھرا کے انتخابات میں ملا۔ پنڈت جی کی کانگریس پارٹی کی حریف کمیونسٹ پارٹی کی جیت یقینی نظر آتی تھی لیکن ماسکو نے کمیونسٹ پارٹی کا ساتھ دینے کی بجائے پنڈت جی کی پیٹھ ٹھونکی پراودا اخبار نے ایک اداریہ میں پنڈت جی کی

تائید میں لکھا ہے کہ کانگریس نے لاکھوں کی تعداد میں مفت تقسیم کیا۔ اس سے کمیونسٹ پارٹی کے چھکے چھوٹ گئے۔ اور وہ ہار گئی۔

اس سے پہلے پنڈت جی مشرق و مغرب میں مصالحت کرانے کے زعم میں آگے بڑھتے تھے۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے اقوام مغرب سے یہ منوانے کی کوشش شروع کردی کہ وہ ایک عظیم طاقت (BIG POWER) ہیں۔ چنانچہ ان کے نمائندے مسٹر کرشنا مینن جو فارموسا کے سلسلہ میں پیکنگ سے ابھی ابھی واپس آئے ہیں۔ ان دنوں انگلستان اور امریکہ سے اپنی یہی مزعومہ حیثیت تسلیم کرا رہے ہیں۔ عین اس حال میں جبکہ ہندوستان اقوام مغرب سے اپنی بڑائی تسلیم کرانے میں مصروف ہے۔ روس نے اس دکھتی رگ کو پکڑا ہے۔ اور ہندوستان کو ایشیا کی تیسری بڑی طاقت کہہ کر اس سے اتحاد کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ روس کی پالیسی میں جو تبدیلی آچکی ہے اس کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جو روسی قائدین راندہ درگاہ مارشل ٹیٹو سے خود ملنے جا سکتے ہیں وہ پنڈت نہرو کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

ہندوستان بڑی طاقت ہے یا نہیں۔ اور اس سے روس اور چین یا کسی اور قوم سے رابطہ اتحاد پیدا کرنا چاہیئے یا نہیں۔ یہ خالصتہً ہندوستان کے اپنے مسائل ہیں۔ اور وہ ان کے بارے میں جو چاہے فیصلہ کر سکتا ہے۔ لیکن پاکستان اور دیگر اقوام کو یقیناً حق پہنچتا ہے کہ اگر ان فیصلوں کی زد ان پر پڑتی ہو تو وہ ان کے مضرات پر سنجیدگی سے غور کریں اور اپنی مدافعت کے سامان پیدا کریں۔

روس چین اور ہندوستان کے اتحاد کا مطلب یہ ہوگا کہ ہندوستان نے اپنی قسمت کو کمیونسٹ ممالک سے وابستہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو اشتراکیت کے لئے ہندوستان کے دروازے چوپٹ کھل جائیں گے۔ پہلے ہی ہندوستان میں کمیونزم کو کافی فروغ حاصل ہو چکا ہے اس کے لئے جہاں اور عوامل ہیں وہاں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پنڈت نہرو بین الاقوامی سیاست میں کمیونسٹ چین اور روس کا ساتھ دیتے ہیں تو اندرون ممالک کمیونسٹ پارٹی کو اور شہ ملتی ہے کیونکہ اس سے اس کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔ اگر ہندوستان پورا کمیونزم کی آماجگاہ بن گیا تو اس سے نہ محض پاکستان کے لئے کمیونزم کا خطرہ حقیقی بن جائے گا بلکہ ایشیا اور مشرق وسطیٰ کا توازن قوی اس حد تک بگڑ جائے گا کہ اس کی روک

تھام بالکل محال نہیں تو بہت دشوار ہو جائے گی۔ پاکستان اس صورت حال کو ایک لمحے کے لئے بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ وہ ہندوستان کے راستے سے آنے والے سیلاب اشتراکیت کا شکار ہو جائے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس خطرے کو بھانپا جائے اور ہندوستان کو اس کھیل کے خطرناک عواقب سے آگاہ کیا جائے۔ یہ مسئلہ تنہا پاکستان کا نہیں۔ امریکہ کو بھی اسے پوری سنجیدگی سے سوچنا ہوگا اور اس کے لئے حفاظتی تدابیر اختیار کرنا ہوں گی۔

ایک اہم سوال

اخبارات میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

ڈسٹرکٹ جج کیمبل پور مقیم راولپنڈی نے سول جج راولپنڈی کے اس فیصلہ کو بحال رکھا ہے کہ قادیانی مسلمانوں کا کوئی فرقہ نہیں اور ایک قادیانی خاتون ایک مسلم مرد کے نکاح میں نہیں رہ سکتی۔ فاضل جج نے اپنی رائے کا اظہار کیپٹن نذیر الدین کی اہلیہ کی اس درخواست کے فیصلہ کے دوران کیا ہے جس میں کہ اس نے حق مہر کی ادائیگی کے متعلق عدالت سے استدعا کی تھی۔

اس مقدمہ کے واقعات کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے کہ کیپٹن نذیر الدین اور امتہ الکریم ایک بچے کے والدین ہونے کے باوجود بھی خوشگوار زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے اس لئے مذکورہ خاتون اپنے والدین کے گھر چلی گئی اور اس کے خاوند نے اس کے قادیانی ہونے کی بنا پر اسکو طلاق دیدی۔ چنانچہ گذشتہ سال سول جج میاں محمد سلیم نے حق مہر کے لئے ایک بعد کے مقدمہ میں یہ قرار پایا کہ ایک مسلم کے ساتھ ایک قادیانی کا نکاح غلط ہے اس لئے حق مہر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ڈسٹرکٹ جج نے اب اس فیصلہ کی تائید و حمایت کرتے ہوئے حسب ذیل فیصلہ دیا ہے۔

۱۔ اس مسئلہ پر امت کا اجماع ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلعم آخری نبی ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

۲۔ اس مسئلہ پر بھی امت متفق ہے کہ جو کوئی بھی ختم نبوت پر یقین نہیں رکھتا دائرہ اسلام سے خارج ہے

۳۔ اس مسئلہ پر بھی اجماع امت ہے کہ قادیانی آنحضرت صلعم کو آخری پیغمبر تسلیم نہیں کرتے اور اسلئے قادیانی مسلمان نہیں ہوتے۔

۴۔ مرزا غلام احمد بلا شک و شبہ (جیسے کہ وہ خود اور اس کے پیغمبر اسے سمجھتے ہیں) دعویٰ کرتے ہیں کہ اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔

۵۔ جو کچھ بھی مرزا صاحب نے اپنی ابتدائی کتابوں میں ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے لکھا ہے اسکے نبوت کے دعوے کو جھٹلاتا ہے۔

۶۔ مرزا صاحب نے دوسرے پیغمبروں کی طرح سے ہی اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے اس کے اپنے اشعار درج ذیل ہیں۔

منم مسیح زماں و منم کلیم خدا
منم محمد و احمد کہ مجتبیٰ باشد

اور

میں کبھی عیسیٰ کبھی موسیٰ کبھی یعقوب ہوں ....

۷۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص بھی نبی اور حامل وحی ہونیکا دعویٰ نہیں کر سکتا اور اس کی توثیق میں قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت موجود ہے

قرآن کریم ۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ۔ الخ

حدیث :۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

(بحوالہ تسنیم ۔ ۸ر جون ۱۹۵۵ء)

ہمیں یاد پڑتا ہے کہ (قریب بیس سال کا عرصہ ہوا) بہاولپور میں بھی اسی قسم کا ایک مقدمہ ہوا تھا جس نے بڑی شہرت اختیار کرلی تھی اور دیر تک چلتا رہا تھا۔ اس کے فیصلہ میں فاضل جج نے لکھا تھا کہ وہ ایک عرصہ تک اس مسئلہ پر غور کرتے رہے لیکن ان کے سامنے معاملہ صاف نہیں ہوتا تھا حتیٰ کہ ایک دن اتفاق سے کسی رسالہ میں انھوں نے ختم نبوت پر پرویز صاحب کا ایک مضمون دیکھا جس سے ان کے تمام شکوک رفع ہوگئے اور انھوں نے فیصلہ دیدیا کہ قادیانیوں اور مسلمانوں میں رشتہ مناکحت جائز نہیں قرار پا سکتا۔ اب یہی فیصلہ راولپنڈی کی عدالت نے دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ ملت پاکستانیہ کے لئے بڑا اہم ہے۔ لیکن دو سال ادھر (پنجاب کی ختم نبوت کی تحریک کے سلسلہ میں) مفاد پرستوں اور ہنگامہ پردازوں نے جس بری طرح سے اس کا جھٹکا کیا وہ ہر قلب حساس کے لئے وجہ صد تاسف ہے۔ اس میں اس قدر تباہی و بربادی کے بعد جو نتیجہ نکلا وہ صرف اسقدر تھا کہ یہ مسئلہ تو اپنی جگہ ویسے کا ویسا رہا البتہ کچھ لوگ چند دن جیل میں رہ کر مجاہد اور غازی بلکہ (MARTYR) بن گئے۔

اس ضمن میں ہمارے پاس بہت سے استفسارات موصول ہو رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ معاملہ بالکل واضح اور صاف ہے۔ جس طرح عیسائی، مسلمان ہو جانے (یعنی نبوت محمد رسول اللہ پر ایمان لے آنے) کے بعد ملت نصاریٰ کا فرد نہیں رہ سکتا حالانکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت پر ایمان رکھتا ہے اسی طرح جو شخص نبی اکرمؐ کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرتا ہے وہ ملت اسلامیہ کا فرد نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ وہ نبوت رسول اللہ پر بھی ایمان کیوں نہ رکھے۔ ہمارے نزدیک قادیانیوں اور بہائیوں کی پوزیشن ایک ہی ہے۔ یہ دونوں نبی اکرمؐ کے بعد ایک جدید نبوت پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے یہ ملت اسلامیہ کے افراد نہیں قرار پا سکتے۔

لیکن ایک اسلامی مملکت کے اندر یہ سوال ایسا ہے جس کا فیصلہ نہ کسی فرد کی رائے کر سکتی ہے اور نہ ہی کسی عالم کا فتویٰ۔ اس کا فیصلہ اسلامی مملکت ہی کر سکتی ہے اس لئے کہ جب اس مملکت کے آئین میں یہ درج ہوگا کہ فلاں فلاں چیز صرف مسلمانوں سے مخصوص رہیگی (مثلاً رئیس مملکت ہیڈ آف دی سٹیٹ صرف مسلمان ہوگا) تو اس مملکت کو اپنے آئین میں اسکی بھی وضاحت کرنی ہوگی کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ جس طرح اسے اسکی وضاحت کرنی ہوگی کہ "پاکستانی شہری" کسے کہتے ہیں۔ یہ سوال زیر ترتیب مجلس آئین ساز کو اپنے سامنے رکھنا چاہیئے اور مجوزہ آئین میں اسکی وضاحت کر دینا چاہئے جب مملکت کو اسلامی کہنے کا دعویٰ کیا ہے تو پھر اس قسم کے تمام

مسائل کو سامنے رکھنے اور ان کا حل پیش کرنے کی بھی جرأت رکھنی چاہیئے۔ مسئلہ کو ٹال دینے سے وہ حل نہیں ہو جایا کرتا، جس طرح کبوتر کے آنکھیں بند کر لینے سے بلّی کا وجود ختم نہیں ہو جایا کرتا۔

نظام ربوبیت

مقام مسرت ہے کہ قارئین کے حلقہ میں نظام ربوبیت کو وہی مقبولیت حاصل ہوئی جس کی ہمیں توقع تھی۔ اسوقت تک جتنے خطوط موصول ہوئے ہیں ان میں اسے محترم پرویز صاحب کی بہترین تصنیف قرار دیا گیا ہے ہمارے نزدیک یہ پرویز صاحب ہی کی بہترین تصنیف نہیں بلکہ اس دور کی بہترین تصنیف ہے (لیکن شاید قرآن کی انقلابی آواز کی طرح، ہمارے دور یا کم از کم مسلمانوں کے لئے قبل از وقت)۔ ابھی ابھی ڈھاکہ سے ایک صاحب ذوق اور صاحب بصیرت دوست کا خط پرویز صاحب کے نام آیا ہے جس میں وہ رقمطراز ہیں۔

ڈھاکہ

۸ر جون ۱۹۵۵ء

نظام ربوبیت ختم کرنے میں مجھے دانستہ دیر لگی۔ جس طرح ایک بچہ مرغوب مٹھائی تھوڑی تھوڑی آہستہ آہستہ کھاتا ہے اسی طرح میں نظام ربوبیت پڑھتا رہا اور یہ خیال ہر وقت ستاتا رہا کہ کہیں ختم نہ ہو جائے۔ اختتام پر میں نے آپ کے لئے بہت سی دعائیں کیں۔ خدا کرے وہ آپ کی رفیق کار ہوں۔ اس بے نظیر تالیف کی محدود افادیت آپ کے لئے قابل غور ہے۔ ایک خاص تعلیم پس منظر یا معیار کے بغیر دوسروں کے لئے اسکو جذب کرنا مشکل ہوگا۔ اگر ممکن ہو سکے اور طلوع اسلام میں اس کے اقتباس نسبتاً آسان زبان میں شائع ہو جائیں تو زیادہ لوگ مستفید ہو سکیں گے۔

آپ بھی کہاں پیدا ہوئے جہاں عبث ہے تیرہ ذوقی کاش آپکی فکر کو کوئی اور خطہ نصیب ہوتا تو کیسے درخشاں تاریخ کتنے انسانیت نواز ہوتے۔ ذاتی جذبات محبت و احترام سے قطع نظر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ طالب حق کے لئے یہ تالیف سونے کی ڈلی کرن کی طرح حیات بخش ثابت ہوگی۔ یقین کیجئے اس کے مطالعہ کے بعد قرآن کے اعجاز پر میرا ایمان اور پختہ ہو گیا اور جو چیز بھی منزل قرآن کی طرف لیجائے آب حیات ہے۔

کتاب کی "محدود افادیت" سے صاحب مکتوب کا مطلب یہ ہے کہ کتاب اس قدر ٹھوس ہے کہ اس سے صرف وہی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو ایک عرصہ سے پرویز صاحب کے بصیرت قرآنی کے ساتھ ساتھ چلتے آ رہے ہیں۔ جو اس پس منظر سے آشنا نہیں ان کے لئے ایسی جامع اور مختصر تصنیف سے کماحقہٗ مستفیض ہونا مشکل ہوگا اس کے لئے انھوں نے تجویز کیا ہے کہ اس کے اقتباسات کی تشریح طلوع اسلام میں مسلسل شائع کی جائے۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب بڑی ٹھوس ہے۔ لیکن درحقیقت یہ لکھی ہی ان لوگوں کے لئے گئی ہے جو طلوع اسلام میں پیش کردہ قرآنی

اور مختصر کتاب کی ضرورت تھی۔ باقی رہا اسکی تشریح کا سوال! سو طلوع اسلام کا ہر پرچہ اور اس پرچہ کے مندرجات کسی نہ کسی انداز میں نظام ربوبیت ہی کی تشریحات ہوتے ہیں کیونکہ یہ ہے ہی نظام ربوبیت کا علمبردار۔ اس لئے ہمارا خیال ہے کہ اس کتاب کی مسلسل تشریح کی الگ ضرورت نہیں۔

باقی رہا اس کتاب میں پیش کردہ تصورات حیات کا اس دنیا تک پہنچانا جس تک ابھی تک پرویز صاحب کی آواز نہیں پہنچ سکی، تو اس کے لئے اس کتاب کا (کم از کم) انگریزی میں ترجمہ شائع کرنا پہلے ہی سے ہمارے پیش نظر ہے۔

طاؤس کی رنگینیوں کے بعد آخر میں ایک نظر اس کے پاؤں پر بھی جا پڑتی ہے۔ ہم نے کتاب کی اہمیت کے پیش نظر چاہا تھا کہ شائع بھی اسی اہتمام سے کیا جائے۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر اسکی کاپیاں بڑی احتیاط سے لکھوائی گئیں اور انکی تصحیح ایک بار نہیں بلکہ تین بار کرائی گئی۔ لیکن پریس میں جا کر یہ کاپیاں پلیٹوں پر سے اڑ گئیں اور ان کی جسقدر تصحیح کی گئی تھی سانہ نے انھیں درست کرنے میں تساہل برتا۔ چنانچہ کتاب میں یہ غلطیاں بدستور رہ گئیں اور اس کا علم اسوقت ہوا جب کتاب چھپ کر سامنے آ گئی۔ اس سے ہمارے دل پر کیا گذری ہوگی، آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ لیکن اسوقت ہم سوائے اسکے کہ محترم پرویز صاحب سے بالخصوص اور قارئین سے بالعموم معذرت خواہ ہوں اور کیا کر سکتے ہیں۔ امید ہے وہ ہماری اس معذرت

عالم اسلامی

غازہ (فلسطین) میں اسرائیل کے اور مصر کے مابین کشیدگی بڑھتی جا رہی ہے۔ اقوام متحدہ کے مبصر جنرل برنز اینگ بڑی ہوشیاری سے باقاعدہ جنگ کو روکے ہوئے ہیں لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں تک کامیاب ہو سکیں گے۔ انھوں نے کشیدگی کم کرنے کے لئے چار تجویزیں پیش کی ہیں۔ اوّل:۔ سرحد کے دونوں طرف اقوام متحدہ، مصری اور اسرائیلی افسروں کے مشترکہ ٹولے گشت لگاتے ہیں۔ دوئم۔ حملوں کی روک تھام کے لئے خاردار تار لگا دیئے جائیں۔ سوئم۔ سرحد کے پاس صرف باوردی سپاہیوں کو آنے کی اجازت دی جائے (تاکہ غیر فوجی آ کر گڑبڑ نہ کر جائیں)؟ چہارم۔ جب کوئی حادثہ پیش آئے تو جانبین کے کمانڈر باہمی طور پر مل کر ان پر غور و خوض کر سکیں۔ مصر نے ان تجاویز کو اس شرط کے ساتھ مان لیا ہے کہ خاردار تار صرف انہی علاقوں میں نصب کئے جائیں جہاں ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ اور اس حد کو دائمی نہ سمجھ لیا جائے۔ نیز فریقین کے کمانڈر جب بھی ملیں وہ اقوام متحدہ کے مبصر کی موجودگی میں ملیں۔ یہودی مشترکہ گروپوں کی گشت والی تجویز کو تسلیم نہیں کرتے۔ کیونکہ سرحد کے قریب جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کو مصر پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔

صورت حال بگڑتی دیکھ کر برطانیہ نے "اسرائیل" کو متنبہ کیا ہے کہ وہ اور امریکہ اور فرانس جنگ برداشت نہیں کریں گے واضح رہے کہ ۱۹۵۰ء میں ان تینوں قوموں نے ایک اعلان جاری کیا تھا جس میں اس مشترکہ عزم کا اظہار کیا گیا تھا کہ مشرق وسطیٰ میں سرحدوں کی کمی بیشی گوارا نہیں کی جائے گی۔ صحیح تر الفاظ میں اسکا مطلب یہ تھا کہ نہ "اسرائیل" کو مزید عربی علاقے غصب کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ اور نہ عربوں کو یہودی علاقوں پر قبضہ کرنے دیا جائے گا۔ یہ اعلان اور اس کا اعادہ اپنی جگہ اہم ہے لیکن اس سے علت مرض کا مداوا ممکن نہیں کیونکہ اس کے عوامل دور رس ہیں۔ ۲۶ر جولائی کو اسرائیلی انتخابات ہو رہے ہیں۔ موجودہ حکمران طبقہ کے نزدیک سرحدی علاقوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے کشیدگی مفید رہے گی۔ مزید برآں یہودیوں کی نظریں آئندہ سال کے امریکی صدارتی انتخابات پر بھی ہیں۔ ان انتخابات میں یہودی ووٹ بہت اہم ہوتا ہے۔ چنانچہ یہودیوں کی کوشش یہ ہے کہ غازہ میں کشیدگی برقرار رکھیں تاکہ امریکہ پر دباؤ ڈالا جا سکے کہ اگر اسے یہودی ووٹ درکار ہیں تو وہ یہودی فتوحات میں حائل نہ ہو۔ نیز عربوں کے مقابلے میں ان کی فوجی اور معاشی امداد کرتا رہے۔ گویا ان حالات میں خدشہ یہی ہے کہ غازہ کا قضیہ کرانکم ایک سال تک مصر کے لئے پریشانی کا باعث بنا رہیگا۔

مصر کو تمام عرب ممالک نے یقین دلایا ہے کہ یہودی حملے کی صورت میں وہ اس کا ساتھ دیں گے۔ اس سے مصری حکمرانوں کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہونا شروع ہو گئی ہے اور انھوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ عربی اتحاد زیادہ ضروری ہے۔ چنانچہ مصر کا رویہ عراق کے بارے میں پہلے کی طرح متشدد نہیں رہا۔ اس سے مصر، شام اور سعودی عربیہ کی حمایت سے جو نیا دفاعی معاہدہ تیار کر رہا تھا اس میں تاخیر واقع ہو گئی ہے۔ شام بھی پہلے کی طرح نئے معاہدہ کا پرجوش حامی نہیں رہا۔ وہ عراق کو ہاتھ سے ضائع نہیں کرنا چاہتا بالخصوص اس لئے کہ عراق عربی مفاد کا مؤید ہے اور اس کے تحفظ کے لئے مشترکہ اقدام کا قائل۔ لبنان مصالحت کی کوشش میں بدستور منہمک ہے۔ اب بعض حلقوں میں یہ کہا جانے لگا ہے کہ مصر اپنی پالیسی پر نظر ثانی کر رہا ہے۔

حال ہی میں کرنل ناصر نے اعلان کیا ہے کہ وہ جنوری سے ملک میں پارلیمانی طرز حکومت کا نفاذ کر دیں گے۔ یہ اہم فیصلہ ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس کی عملی شکل کیا ہوگی۔ اس سے پہلے اسی مسئلے پر عسکری انقلابی کونسل میں کافی سر پھٹول ہو چکا ہے۔ جنرل نجیب اس کے حق میں تھے۔ لیکن انھیں بالآخر اس کی پاداش میں ایوان حکومت سے نکلنا پڑا۔ اس فیصلے اور اس کے عملی نفاذ کا مصری سیاست پر کافی اثر پڑیگا اور اگر مصر واقعی اس پر قائم رہا تو مصری کوائف میں تبدیلیوں کی توقع کی جا سکتی ہے۔ یہ تبدیلی اتحاد عالم اسلامی کے حق میں ہوئی تو مسلمانان عالم اس کا خیر مقدم کریں گے۔

عقلِ انسانی کے تجویز کردہ اور وحیِ خداوندی کے دیئے ہوئے معاشی نظاموں کا تقابل

مغرب کا جمہوری نظام

۱۔ کچھ طبقے ایسے ہوتے ہیں جو خود کوئی تعمیری کام نہیں کرتے۔ اور دوسرے انسانوں کی محنت کے ماحصل پر جیتے ہیں۔ مثلاً صاحب اقتدار طبقہ، مذہبی پیشوا، صرف روپیہ لگا کر زندگی بسر کرنیوالا طبقہ

۲۔ جو شخص اپنی ہنرمندی سے جتنا مال و دولت سمیٹ لے وہ سب اس کی ملکیت ہو جاتا ہے۔ اور کوئی دوسرا شخص اس کی ملکیت میں دخل انداز نہیں ہو سکتا۔

۳۔ بعض لوگ رزق کے بنیادی سرچشمہ زمین پر لکیریں کھینچ کر مختلف رقبوں کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے لیتے ہیں اور عوام کو ان ذرائع معاش سے محروم کر دیتے ہیں۔

۴۔ ہیئتِ حاکمیہ کا فریضہ اتنا ہی ہوتا ہے کہ وہ لوگوں سے اپنے واجبات وصول کرلے۔ یہ اس کا ذمہ نہیں ہوتا کہ دیکھے کہ افرادِ معاشرہ کو ان کی ضروریاتِ زندگی بہم پہونچتی ہیں۔ یا نہیں۔

۵۔ نوعِ انسانی کو مختلف گروہوں (قوموں) میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور ہر قوم اپنی منفعت اور دیگر اقوام کی تخریب کے درپے رہتی ہے۔

۶۔ عزت کے معیار اضافی ہوتے ہیں۔ جو بڑے گھرانے میں پیدا ہو جسکے پاس مال و دولت ہو۔ جو قوت فراہم کرلے وہی واجب التکریم ہوتا ہے۔ دوسرے ذلیل و حقیر ہوتے ہیں۔

۷۔ گروہ کثیر قانون بناتا ہے اور گروہ قلیل اس کے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت پر مجبور ہوتا ہے۔ ایک حاکم دوسرا محکوم۔

۸۔ ہر شخص کو اجازت دیتا ہے کہ مفید یا مضر کام کرے اور جتنا مال جس طریقہ سے سمیٹ سکتا ہے وہ حاصل کرے۔ اور جیسے چاہے اس کا استعمال کرے۔ بس حکومت کے قوانین کی خلاف ورزی نہ کرے

روس کا اشتراکی نظام

۱۔ ہر شخص کو طوعاً و کرہاً کام کرنا پڑتا ہے۔ اور محنت کے ثمرہ میں سے اسے صرف اتنا ملتا ہے جس سے ضروریاتِ زندگی پوری ہو سکیں۔

۲۔ جس شخص کو جو کام دیا جائے وہ اسے مجبوراً کرنا پڑتا ہے۔ اور کام کا معاوضہ نظام خود مقرر کرتا ہے۔

۳۔ رزق کے سرچشمے نظام کی ملکیت میں رہتے ہیں اور نظام ہی طے کرتا ہے کہ پیداوار کا حصہ کس کو کتنا دیا جائے۔

۴۔ نظام روٹی، کپڑا، اور مکان کی ذمہ داری تو لیتا ہے۔ لیکن مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما سوائے سرکار نہیں ہوتا۔ فرد معاشرہ کے لئے زندہ رہتا ہے۔

۵۔ نوعِ انسانی طبقات میں بٹی ہوئی ہے۔

۶۔ بحیثیت انسان ہونے کے عزت و تکریم کا تخیل مفقود ہے۔ صرف کام کرنے کی صلاحیت کو اہمیت ہے۔

۷۔ حاکم اور محکوم کا تصور قائم ہے۔ استبداد کے ڈر سے فرد دم نہیں مار سکتا۔

۸۔ بھوکوں اور ننگوں کو دعوت دیتا ہے کہ مال داروں کو لوٹ لو۔

۹۔ زندگی کو صرف حیوانی سطح تک محدود سمجھتا ہے۔ جس میں کھانے پینے اور افزائش نسل سے زیادہ کوئی مقصد نہیں ہوتا، انسانی ذات، حیاتِ مستقبل اور مستقل اقدار کا تصور ہی نہیں ہوتا۔

قرآنی نظامِ ربوبیت

۱۔ ہر شخص اپنا بوجھ بطیبِ خاطر خود اٹھائے گا۔ یعنی بجز ان لوگوں کے جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو گئے ہوں، ہر شخص تعمیری کام کرے گا۔ جو شخص بلا عذر کام نہیں کرے گا اس کا معاشرہ کے ثمرہ میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

۲۔ ہر قابلیت کا شخص پوری پوری محنت کرے گا۔ لیکن اس کے ماحصل میں سے صرف اتنا لے گا جتنا اس کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔ باقی سب نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھے گا۔ دولت کا جمع کرنا سنگین جرم ہوگا۔

۳۔ رزق کے سرچشمے کسی کی انفرادی ملکیت میں نہیں رہیں گے۔ بلکہ معاشرہ کی تحویل میں رہ کر ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں گے۔

۴۔ ہر فردِ معاشرہ اور اس کی اولاد کے لئے روٹی، کپڑا، اور مکان کے علاوہ مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے جملہ سامان پرورش بہم پہونچانے کی ذمہ داری نظام پر ہوگی۔ معاشرہ فرد کی تکمیل ذات کے لئے ہوگا فردِ معاشرہ کی قربان گاہ پر ذبح ہونے کے لئے نہیں ہوگا۔ موجودہ زندگی کی خوشگواریوں کے ساتھ مستقبل کی زندگی کی شادابیاں بھی حاصل ہونگی۔

۵۔ پوری نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری بن جائے گی۔ اور پوری انسانیت کی منفعت اس کے پیش نظر ہوگی۔

۶۔ ہر انسان صرف انسان ہونے کی جہت سے قابلِ عزت و تکریم ہوگا۔ جو اپنی ذمہ داریوں کو بہتر طریق پر پورا کرے گا وہی زیادہ عزت کا مستحق ہوگا۔

۷۔ زندگی کے لئے اصولی قوانین خدا کے متعین کردہ ہوں گے۔ اور کسی انسان کو یہ حق نہیں ہوگا کہ وہ دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ جو گروہ اصولی قوانین کی جزئیات مشورہ سے مرتب اور نافذ کرے گا وہ خود بھی ان احکام کی اطاعت کرے گا۔

۸۔ ہر شخص کو دعوت دیتا ہے کہ اپنا فالتو روپیہ دوسروں کی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے اور ان کی مضمر صلاحیتوں کے نشوونما کے لئے دے ڈالو۔

قرآنی نظامِ ربوبیت کی تجدید کے لئے

۱۔ اگر آپ کسی تعمیری کام میں حصہ نہیں لے رہے ہیں تو اس میں ضرور حصہ لیجئے۔

۲۔ اپنے موجودہ ذریعہ معاش پر غور کیجئے کہ وہ دیگر انسانوں کے لئے مفید ہے یا مضر۔ اگر مفید ہے تو اسے جاری رکھئے۔ اور پورے انہماک اور ہمت سے اس میں لگے رہیئے۔ لیکن اگر وہ مضر ہے تو اسے ترک کر دیجئے یا ترک کرنے کی کوشش فوراً شروع کر دیجئے۔

۳۔ اپنی کمائی میں سے ضروریاتِ زندگی کو کفایت شعاری سے پورا کیجئے۔ اور جو باقی بچے اسے دوسروں کی جائز ضروریات کے پورا کرنے کے لئے کھلا رکھئے۔ اس عمل سے آپکی ذات میں استحکام پیدا ہوگا۔

۴۔ دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے میں تھوڑے اور بہت کا خیال نہ کیجئے۔

۵۔ اس طریق اعانت میں ساتھی تلاش کیجئے اور ان کے مشورہ سے اس طریق کار کو وسعت دیجئے۔ اور سابقون الاولون میں شمولیت کا اعزاز حاصل کیجئے۔

۶۔ اس نظام کی بنیاد فکری تبدیلی پر ہے۔ اس لئے اس نظام کو قرآن کریم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

(نوٹ:۔ معاشی نظاموں کا یہ تقابل محترم پرویز صاحب کی کتاب نظامِ ربوبیت سے مرتب کیا گیا ہے)

تاریخی شواہد

(۱۹)

یہ قوم دنیا سے نیست و نابود ہوگئی اور جس طرح حضرت ہودؑ نے انھیں پہلے سے آگاہ کر رکھا تھا۔ ان کی جگہ دوسری قوم لے لی کہ مکافاتِ عمل کی رو سے استبدال و استخلاف قومی (ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کا آجانا) خدا کا اٹل قانون ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَيْكُمْ ؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْــًٔا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝ (۱۱/۵۷)

پھر اگر (اس پر بھی) تم نے روگردانی کی تو جس بات کے لئے میں بھیجا گیا تھا، وہ میں نے پہنچا دی (اس سے زیادہ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے) اور مجھے تو نظر آرہا ہے کہ میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ دیدے گا۔ اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکوگے۔ یقیناً میرا پروردگار ہر چیز کا نگراں ہے۔

حضرت ہودؑ کو اللہ تعالےٰ نے پہلے ہی سے اس کا علم دیدیا تھا (جس طرح حضرت نوحؑ کو طوفان کا پیشتر علم دے دیا گیا تھا) وہ اس سے بار بار قوم کو آگاہ کرتے رہے۔ لیکن انھوں نے تو فیصلہ ہی یہ کر رکھا تھا کہ جو کچھ حضرت ہودؑ کہیں اسے جھوٹا سمجھا جائے۔ چنانچہ انھوں نے اس کا یقین نہ کیا اور تباہ و برباد ہوگئے۔ اور حضرت ہودؑ اور ان کے متبعین اس تباہی سے محفوظ رہے۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝ (۱۱/۵۸)

اور (دیکھو) جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آپہنچا۔ تو ہم نے اپنی رحمت سے ہودؑ کو بچالیا اور ان لوگوں کو بھی بچالیا جو اس کے ساتھ (سچائی پر) ایمان لائے تھے اور ایسے عذاب سے بچایا کہ بڑا ہی سخت عذاب تھا۔

ان باقیاتِ صالحات سے جو قوم آگے بڑھی اسے عادِ ثانیہ کہا گیا ہے۔ اور جو تباہ کردی گئی اُسے عادِ اولیٰ۔

وَاَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ِۨالْاُوْلٰى ۝ (۵۳/۵۰)

اور (دیکھو) بلاشبہ (تمہارا پروردگار) وہی تو ہے۔ جس نے عادِ اولیٰ کو ہلاک و برباد کردیا۔

قومِ عاد کے اس سانحہ عبرت آموز پر نگہ بازگشت ڈالئے اور دیکھئے کہ اس میں بعض خصوصیتیں کس قدر نمایاں طور پر ابھر کر سطح پر نظر آرہی ہیں۔ قوم قوت، دولت اور حکومت و سلطنت کی مالک ہے۔ اور اسے اللہ کا فضل و احسان قرار دیا گیا ہے۔ وہ عدل و انصاف کو چھوڑ کر سرکشی و تمرد پر اتر آتی ہے تو ان سے کہا جاتا ہے کہ یاد رکھو، اس روش کا نتیجہ سوائے ہلاکت کے اور کچھ نہیں لیکن اگر تم اپنی روش کی اصلاح کرلو۔ اور اپنے آپ کو قانونِ خداوندی کے تابع لے آؤ۔ تو وہ تمہاری قوتوں کو اور بڑھاتا جائے گا۔ يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وہ نہیں مانتی تو اس پر ایک رسوا کن عذاب نازل کیا جاتا ہے (لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى) اس سے صاف ظاہر ہے کہ قوانینِ خداوندی کے ماتحت عزت و شوکت حکومت و سطوت، قوت و ثروت اللہ کے انعامات ہیں اور ذلت و رسوائی کی زندگی عذابِ خداوندی ہے۔

پھر اس قوم کو یہ احسان بھی یاد دلایا گیا کہ اسے قومِ نوحؑ کا جانشین بنایا گیا تھا۔

وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۷/۶۹)

اور خدا کا یہ احسان یاد کرو کہ اس نے تمہیں قومِ نوحؑ کے بعد اس کا جانشین بنایا۔ اور تمہاری نسل کو زیادہ وسعت و توانائی بخشی۔ پس چاہیئے کہ اللہ کی قدرتوں کی یاد سے غافل نہ ہو۔ تاکہ ہر طرح کامیاب رہو۔

اور جب اس نے پیغاماتِ خداوندی سے سرکشی اختیار کی۔ تو اس سے کہدیا گیا کہ یاد رکھو کہ اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَيْكُمْ ؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْــًٔا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝ (۱۱/۵۷)

پھر اگر (اس پر بھی) تم نے روگردانی کی تو جس بات کے لئے میں بھیجا گیا تھا۔ وہ میں نے پہنچا دی (اس سے زیادہ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے) اور مجھے تو نظر آرہا ہے کہ میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ دے دیگا۔ اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکوگے۔ یقیناً میرا پروردگار ہر چیز کا نگراں ہے۔

لہٰذا ظاہر ہے کہ یہ اللہ کا عذاب ہے کہ کسی قوم کی شوکت و حشمت کی وارث کوئی دوسری قوم بنادی جائے۔

قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ دن بڑا "منحوس" تھا۔ جب ان پر اللہ کا عذاب طاری ہوا۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْۤ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝ (۴۱/۱۶، ۵۴/۱۹)

پھر (دیکھو ایسا ہوا کہ) ہم نے دنیوی زندگی میں ذلت و رسوائی کا عذاب چکھانے کے لئے چند منحوس دنوں میں ان پر ایک سخت آندھی بھیجدی۔ اور (یہ تو کچھ بھی نہیں ہے) بلاشبہ آخرت کا عذاب زیادہ رسوا کن ہوگا۔ اور وہ (وہاں کسی قسم کی) مدد نہیں کئے جائیں گے۔

اس کو قرآن کریم نے ایک بڑا دن بھی کہا ہے

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ؕ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖۤ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (۴۶/۲۱، ۲۶/۱۳۵)

اور (اے پیغمبرِ اسلام! ذرا) قومِ عاد کے بھائی ہند (ہودؑ) کو یاد کرو، جب اس نے اپنی قوم کو مقامِ احقاف (صحرائے عرب) میں (انکار و بدعملی کے برے نتائج سے) ڈرایا۔ اور (کچھ اسی پر منحصر نہیں) اس سے پہلے اور اس کے بعد (اور بہت سے) ڈرانے والے (بھی) آچکے ہیں (ہاں تو اس نے اپنی قوم سے کہا کہ) عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار نہ کرو، مگر صرف اللہ کی (کہ وہی تمہارا حاکم اور مالک ہے) اور (دیکھو، اگر تم اپنے اس کفر و شرک سے باز نہ آئے، تو) میں تمہارے متعلق ایک بڑے دن (یومِ مکافاتِ عمل) کے عذاب سے ڈرتا ہوں (کہ وہ تمہیں آکر گھیر لے)

اس سے معلوم ہوا کہ سعد و نحس آسمان کے ستاروں سے نہیں بلکہ جب کسی کے برے اعمال کے نتائج مرتب ہونے کا وقت آجائے۔ تو وہ گھڑی اس کے لئے نحس ہے۔ لہٰذا سعادت و نحوست خود انسان کے اپنے اعمال کے نتائج کا نام ہے، ستاروں کی گردش کا نام نہیں۔ ستارے تو انسان کے لئے مسخر کردیئے گئے ہیں۔ سو جو محکوم و مسخر ہو۔ وہ مقدرات کی تبدیلیوں پر کیا اختیار رکھ سکتا ہے۔

علامہ اقبال کے الفاظ میں ؎

تیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاک زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

مجلسِ اقبال

مثنوی اسرارِ خودی

(تمہید ۔ مسلسل)

گذشتہ اشعار میں اقبال نے بحضور رب العزت اپنی یہ آرزو پیش کی تھی کہ میری فکر کو بصیرت افروز بنادے تاکہ میں اس کی روشنی میں راہ گم کردہ کاروانِ ملت کو پھر سوئے منزل لے چلوں اور

گرم رو از جستجوئے نو شوم   روشناس از آرزوئے نو شوم

میں نئے نئے حقائق کی تلاش میں تیز رو ہو جاؤں اور نئی نئی آرزوؤں سے روشناس ہوتا جاؤں ۔ قرآن کی رو سے زندگی ایک جہدِ مسلسل اور سعی پیہم ہے۔ جس میں انسان کو ہمیشہ مصروفِ جستجو رہنا چاہیئے۔ خارجی کائنات کے پوشیدہ حقائق کی پردہ کشائی میں مصروف اور خود انسان کی اپنی ہستی کے راز ہائے مستور کے انکشاف میں منہمک۔ لیکن اس کا یہ انکشاف حقیقت خود اپنی ذات تک محدود نہیں رہنا چاہیئے بلکہ اس کا مسلک یہ ہونا چاہیئے کہ جو کچھ اس کی آنکھ نے دیکھا ہے، اسے اور لوگوں کو بھی دکھائے۔ اس لئے اقبال نے کہا ہے کہ میں سرگرمِ جستجو اور روشناسِ آرزوئے نو اس لئے ہونا چاہتا ہوں کہ

چشمِ اہل ذوق را مردم شوم   چوں صدا در گوشِ عالم گم شوم

میں اہل ذوق کی آنکھوں کی پتلی بن جاؤں۔ وہ میری وساطت سے تمام کائنات کے حقائق کو اپنے سامنے واشگاف دیکھ لیں۔ اور میں اہل عالم کی فکر میں اس طرح جذب ہو جاؤں جس طرح کان میں آواز گم ہو جاتی ہے۔

اقبال محسوس کرتا تھا کہ مدت ہائے دراز کی تقلید اور محکومی سے مسلمانوں میں شاعری کا درجہ کس قدر پست ہو چکا ہے، اگر فطرت کی طرف سے اسے صلاحیت سخن اس درجہ فراوانی سے نہ ملی ہوتی۔ تو وہ کبھی شعر کو اپنی پیغام رسانی کا ذریعہ نہ بناتا۔ جو کچھ کہنا چاہتا تھا نثر میں کہتا (یہ الگ بحث ہے کہ وہ شکل زیادہ مفید رہتی یا نہ) لیکن اس کے سامنے پہلے ہی دن سے یہ حقیقت بے نقاب تھی کہ ہمارے ہاں متاعِ سخن بیچ جنس کا سد ہو چکی ہے۔ وہ اپنے فکر کی بلندی سے چاہتا تھا کہ اسے پھر سے گراں بہا بنا دیا جائے۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ میں اس بصیرت کو اس لئے طلب کرتا ہوں کہ

قیمتِ جنسِ سخن بالا کنم   آبِ چشمِ خویش در کالا کنم

میں جنسِ سخن کی قیمت کو بڑھا دوں۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ میں اس مال و اسبابِ تجارت میں خود اپنی آنکھوں کا پانی حل کر دوں اس سے اس کی چمک دمک اور قدر و قیمت بہت بلند ہو جائے گی۔ اسی کو اقبال نے دوسری جگہ "خونِ جگر" سے تعبیر کیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر   عشق ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

جس پیغام میں نالۂ نیم شب اور اشکِ سحرگاہی کی آمیزش نہ ہو وہ محض "مشین کے بنے ہوئے (میکانیکل) الفاظ ہوتے ہیں۔ جن میں چمک تو ہوتی ہے۔ لیکن گداز نہیں ہوتا۔ اقبال کے الفاظ ہیں ۔۔ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ اور دل سے نکلی ہوئی بات میں اشکِ خونیں کی آمیزش ضرور ہوتی ہے۔ اسی سے اس کی قیمت بڑھتی ہے۔

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ میں یہ بصیرت اس لئے چاہتا ہوں کہ

باز بر خوانم ز فیضِ پیرِ روم   دفترِ سربستہ، اسرارِ علوم

تاکہ میں علوم و معارف کے اسرار اور حقائقِ کائنات کے سربستہ رموز کو کھول کر پڑھ سکوں اور یہ کچھ مرشد رومی کے فیض سے ہوگا۔

اقبال پر ابتدا ہی سے رومی کا گہرا اثر تھا۔ اور یہ اثر آخر تک قائم رہا۔ یہ درحقیقت نتیجہ تھا اس ماحول کا جس میں اقبال کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ وہ ماحول یکسر تصوف زدہ تھا، اس لیے تصوف، اقبال کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو چکا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعد ازاں قرآن اور تاریخ کے مطالعہ سے، تصوف کی اصل اور حقیقت ان پر عیاں ہوتی چلی گئی تھی، جس کی وجہ سے انھوں نے تصوف کی بڑی مخالفت بھی کی، لیکن ان کی یہ مخالفت اخلاقیاتِ تصوف (ETHICS OF MYSTICISM) تک جا سکی، اس سے آگے نفسِ تصوف تک نہ پہنچ سکی۔ حالانکہ خود تصوف کا تصور ہی اسلام میں ایک عجمی پودا تھا۔ اقبال کی یہی وہ کمی ہے جس کی وجہ سے اس کے ہاں جہاں ایک طرف تصوف کے خلاف آتا کچھ ملتا ہے وہاں تصوف کے حق میں بھی بہت کچھ پایا جاتا ہے یہی وہ کشمکش ہے۔ جس کی وجہ سے اقبال کو تمام صوفیا میں سے رومی سب سے زیادہ پسند آیا۔ تصوف کے عام اخلاقیات میں عجز و انکسار بیچارگی و افتادگی، بیکسی و بے بسی، مایوسی و ناامیدی، ترکِ دنیا اور حقائق سے فرار ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس رومی کے ہاں جوش و حرارت، تیزی اور گرمی۔ ولولہ اور طنطنہ، عمل و حرکت ہے۔ اور یہ چیزیں اقبال کے پیغام سے خاص طور سے مناسبت رکھتی ہیں۔ اس لئے اقبال نے رومی کو اپنا مرشد قرار دیا ہے۔ لیکن اس سے اس کے پیغام کو جو نقصان پہنچا ہے، افسوس ہے کہ اس کا اندازہ اقبال نے نہیں لگایا۔ رومی میں ہزار جوش و حرارت سہی، اس کی بنیاد تو تصوف ہی پر ہے۔ اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ تصوف یکسر غیر قرآنی تصور ہے۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ علم کا سرچشمہ وحی خداوندی اور عقلِ انسانی ہے۔ وحی خداوندی آخری بار قرآن کے اندر آچکی ہے۔ لہٰذا اب انسانی راہ نمائی کے لئے صرف عقل کی آنکھ اور قرآن کی روشنی ہے ان کے علاوہ کوئی اور ذریعہ علم نہیں ہے، اس کے خلاف تصوف کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ عقل کے علاوہ انسان کے پاس ایک اور ذریعہ علم بھی ہے۔ اسے باطنی ذریعہ کہتے ہیں۔ اس سے انسان پر حقائق کا انکشاف براہ راست ہوتا ہے۔ اس کا نام ان کی اصطلاح میں کشف یا الہام ہے لیکن بادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ محض نام کا فرق ہے۔ ورنہ اپنی اصل کے اعتبار سے الہام اور وحی میں کچھ فرق نہیں۔ اس لئے نبی اکرمؐ کے بعد اس قسم کے ذریعہ علم کا عقیدہ رکھنا، ختمِ نبوت کی نقیض ہے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے کہیں تصوف اور الہام کا ذکر نہیں کیا۔ اس لئے رومی ہو یا حافظ جہاں تک نفسِ تصوف کا تعلق ہے۔ دونوں ایک ہیں۔ لہٰذا اگر اقبال نے رومی کو بھی اپنا مرشد تسلیم کیا ہے۔ تو اس سے اصل خرابی میں کچھ فرق نہیں آتا۔ اقبال کے پیغام میں یہ بہت بڑی کمی ہے، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اس کی بنیادی وجہ ابتدائی ماحول کے اثرات تھے جو اقبال کے لاشعور میں جاگزیں ہو چکے تھے۔ نیز شاعری جسے انھوں نے اظہارِ فکر کا ذریعہ بنایا حزیں کے الفاظ میں "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" چونکہ اس کا تعلق حقائق کی بجائے لطائف سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں مضامین آفرینی کی گنجائش بڑی ہوتی ہے۔

انسان کتنا ہی اونچا کیوں نہ چلا جائے، اپنے میلانات کی دامن کشی سے بچ نہیں سکتا اس سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور یہ کہ انسان اپنے ہر میلان کو وحی خداوندی کے تابع رکھے اس لئے کہ ما ینطق عن الھویٰ (جذبات سے بلند ہو کر بات کرنا) صرف وحی کا خاصہ ہے۔

حیاتِ جاوداں

ابلیس کے نزدیک اولاد کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے

لیکن

قرآن کا جواب

اس سے مختلف ہے

یہ جواب   ابلیس و آدم   میں ملاحظہ کیجئے

صفحات ۳۷۶   قیمت آٹھ روپے

اسلام کی سرگزشت

گذشتہ اشاعتوں میں عربوں کے قومی خصائص و امتیازات کے ضمن میں علمائے عمرانیات اور جاحظ ابن خلدونؒ اور ادلیسی کی آراء کا خلاصہ پیش کر کے ڈاکٹر احمد امین صاحب کا تبصرہ اور ان کی اپنی رائے پیش کی گئی تھی۔ اس کے بعد زمانہ جاہلیت میں عربوں کی حیات عقلیہ پر بحث کی گئی تھی۔ اس فرصت میں عربوں کی حیات عقلیہ اور یونانیوں کی حیات عقلیہ کا فرق واضح کیا جائیگا۔

رہ گئی نگاہ کی ہمہ گیری اور مسائل کی بنیادوں اور عواقب کا دقیق تجزیہ تو یہ بات عقل عربی کے بس کی نہیں ہے۔ اس سے بھی بڑھکر یہ کہ جب وہ کسی ایک چیز کی طرف دیکھتا ہے تو اپنی فکر کے ساتھ اس میں مستغرق نہیں ہو جاتا بلکہ اس چیز کے ان چند خاص مقامات پر ہی وہ ٹھہرتا ہے جو اس کے تعجب کو ابھار سکیں۔ چنانچہ جب وہ کسی درخت کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس کی طرف بھی وہ ایک کُل کی حیثیت سے نہیں دیکھتا بلکہ اس میں کوئی خاص چیز ہوتی ہے جو اسکی نگاہوں کو اپنے لئے وقف کر لیتی ہے۔ مثلاً اسکے تنہ کا سیدھا ہونا یا اسکی ٹہنیوں کا خوشنما ہونا۔ جب وہ کسی باغ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اپنی نگاہوں سے اس باغ کا احاطہ نہیں کرتا۔ اس کا ذہن اسے اس طرح پر قبول نہیں کرتا جیسے ایک فوٹوگرافی اسے قبول کرتی ہے بلکہ وہ تو شہد کی ایک مکھی کی طرح ہے کہ ایک پھول سے دوسرے پھول اور ایک کلی سے دوسری کلی کی طرف اڑتی رہتی ہے اور ہر پھول سے ایک ایک قطرہ چوستی چلی جاتی

عقل عربی کا یہ خصوصی امتیاز ہی وہ راز ہے جس سے ادب عربی کے ــــ حتی کہ اسلامی زمانہ میں بھی ــــ وہ تمام نقائص اور وہ تمام خوبیاں بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہیں جو ایک بیننے والے کو اس میں نظر آسکتی ہیں۔

ادب عربی کے نقائص کا اندازہ تو تم اس کے کسی بھی ادبی شہ پارے کو ــــ نظم ہو یا نثر ہو ــــ پڑھتے ہی لگا سکتے ہو کہ اس میں کس قدر منطقی کمزوری، فکری اعتبار سے کسی دقیق تسلسل کا قحط، معانی و مضامین میں محکم ارتباط کا فقدان، تمہیں نظر آئیگا حتی کہ اگر تم ان کا کوئی سا قصیدہ اٹھالو ــــ خصوصاً زمانہ جاہلیت کا ــــ اور اس میں سے بہت اشعار تم حذف کر دو یا مؤخر کو مقدم اور مقدم کو مؤخر کر دو تو پڑھنے یا سننے والا، کتنا ہی بڑا ادیب بھی کیوں نہ ہو بجز اس صورت کے کہ وہ اسے پہلے پڑھ چکا ہو اسے قطعاً محسوس نہیں کر سکے گا۔

یہ نقص تمہیں ان کتابوں میں بھی نظر آئے گا جو خاص ادبی موضوعات پر ہی لکھی گئی ہیں۔ اگر تم جاحظ، ابن عبد ربہ یا ابوہلال عسکری کی ان تحریروں کا جو انھوں نے خطابت یا اوصاف کے بارہ میں لکھی ہیں، ان تحریروں سے موازنہ کرو جو ارسطو نے انہی موضوعات پر لکھی ہیں تو تمہیں دو قطعاً مختلف طبیعتیں نظر آئیں گی چنانچہ ارسطو مثلاً خطابت کا تجزیہ کرتا ہے تو یہ بیان کرتا ہے کہ بلاغت میں اس کا رتبہ کیا ہے، خطابت کی اقسام کتنی ہیں اور کیا کیا ہیں۔ خطبہ کے اجزاء کیا ہوتے ہیں، اور خطیب کس طرح بنتا ہے..... الخ وہ ان تمام امور پر ایسی ہمہ گیر نظر ڈالتا ہے کہ تمہارے سامنے خطابت کی ایک مکمل تصویر آجاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس عرب کاتب جب خطابت سے گفتگو کرتے ہیں تو سانچہ میں ڈھلے ہوئے حسین و جمیل الفاظ کہیں گے۔ خطابت کے موتی بکھیرینگے جن سے کبھی بھی خطابت کوئی مکمل تصویر تمہارے سامنے نہیں آسکے گی۔

البتہ تمہارے لئے یہ ضروری ہے ــــ اگر تم واقعی کوئی صحیح موازنہ کرنا چاہتے ہو ــــ کہ مثلاً ان کی جیسے لوگوں کو الگ کر دو جن کی طبیعتیں اور عقلیں یونانی فلسفہ سے متاثر ہو چکی۔

اسی قسم کا نقص عربی کی لٹریری کتابوں میں بھی نظر آتا ہے کیونکہ یہ کتابیں خود ادب کی طبیعت سے متاثر ہوئی ہیں۔ اگر تم اغانی، العقد الفرید، البیان والتبیین، یا جاحظ کی الحیوان کا مطالعہ کرو تو تمہیں کہیں کوئی ایسا موضوع نہیں ملیگا جس پر یک مرتبہ ہمہ گیر نظر ڈالی گئی ہو۔ اور پھر اس سے متعلق تمام امور کو کہیں یکجائی طور پر جمع کر دیا گیا ہو۔ بلکہ اس کا کوئی پہلو یہاں ہے تو کوئی پہلو وہاں ہے تم ابھی ابھی ایک موضوع کو پڑھ رہے تھے کہ اچانک تمہیں معمولی سی مناسبت سے کسی دوسرے موضوع میں دھکیل دیا گیا حتی کہ اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ کسی خاص موضوع پر اس کتاب میں کیا کچھ لکھا گیا ہے تو اس کی تلاش کرنیوالا تھک کر بیٹھ جائے گا اور کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں اس کا اعتراف ضرور ہے کہ اس طرز نگارش میں کہ آدمی ایک موضوع سے دوسرے اور دوسرے موضوع سے تیسرے میں اس طرح نکلتا چلا جاتا ہے ایک قسم کی لذت اور تازگی ضرور ہوتی ہے مگر اتنی ہی بات تو کافی نہیں

اسی قسم کی نظر ہے جس نے عربی شاعر کے سانسوں کو بھی کوتاہ کر دیا ہے وہ مکمل قصصی قصائد مہیا کر ہی نہیں سکتا اور نہ ہی اسے یہ قدرت ہے کہ وہ رزمیہ طویل نظمیں ــــ جیسے ایلیاڈ اور اوڈیسا ــــ آپ کے سامنے پیش کر سکے۔

اس قسم کی فکر نے یقیناً انھیں کچھ فوائد بھی پہنچائے ہیں اور اس فکر نے ان کے لٹریری کارناموں کو خوبصورتی کا ایک خاص جامہ بھی پہنا دیا ہے۔ اس قسم کی نظر چونکہ کسی نہ کسی خاص جزئی نقطہ میں منحصر ہوتی ہے اسلئے وہ کسی ایک چیز کے کسی ایک پہلو کی گہرائیو تک اتر جاتے ہیں اور اس طرح عجیب و غریب اور دقیق تر معانی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جب کہ عموماً ان کے اشعار میں یہ چیز بھی نظر آتی ہے کہ وہ کسی ایک ہی چیز پر بار بار غور کرتے ہیں اور اس کے متعلق مختلف طریقوں سے مختلف مضامین پیدا کر لیتے ہیں لیکن ان میں ہمہ گیری اور احاطہ نہیں ہوتا۔ ان کا لٹریچر چھوٹی چھوٹی دل آویز حکمتوں اور حکیمانہ امثال سے بھرا پڑا ہے اس قسم کی چیزوں کو انھوں نے بہت دور تک محکم طریقے سے انجام دیا ہے۔ ان کی عقول اس قسم کی چیزوں سے لبریز اور انکی زبانیں ان عجائبات سے سرمایہ دار ہیں۔ ان کا ایک خطیب کھڑا ہوتا ہے اور اپنا پورا خطبہ اس قسم کی عمدہ اور چھوٹی چھوٹی ضرب الامثال اور مفید و مختصر حکمتوں سے ترتیب دے لیتا ہے اس کا ہر فقرہ کثیر معانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک پورا شاہ بلوط کا درخت ننھے سے ایک بیج میں مرتکز ہو گیا ہے۔ یا فضا میں پھیلا ہوا کثیر گیس ایک قطرہ آب میں جمع ہو گیا ہے۔ اسلام آنے کے بعد اسی قسم کا ادب آگے بڑھا اور عربوں نے ایران، ہند اور روم کی اس قسم کی بہت سی حکمتوں کو اپنا لیا جن پر ہم کسی دوسری جگہ روشنی ڈالیں گے۔ حاصل یہ ہے کہ عقل یونانی مثال کے طور پر اگر کسی چیز کی طرف دیکھتی ہے تو مجموعی حیثیت سے دیکھتی ہے۔ اسکی تحقیق و تفتیش کرتی ہے تحلیل و تجزیہ کرتی ہے لیکن عقل عربی اسکے گرد گھومتی ہے اور مختلف قسم کے موتی مہیا کر کے ان سے ایک ہار ترتیب دے لیتی ہے۔

اب جبکہ ہمیں عقل عربی کی طبیعت معلوم ہو چکی ہے ــــ ہمیں یہ دیکھنا چاہئیے کہ کیا اس قسم کی نظر وہ طبعی طریقہ ہے جس سے تمام قومیں ہی کمال کی طرف سے بڑھتے ہوئے گذرتی ہیں یا یہ خاص قسم کی عقلیت ہے جو سامی جنس کے ساتھ مخصوص ہو۔

یہ موضوع یقیناً اس قابل ہے کہ اسکی تحقیق کی جائے۔ ہمارے پاس اتنا مواد موجود نہیں کہ ہم تفصیل سے اس موضوع پر گفتگو کر سکیں البتہ اجمالاً ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا میدان اس طرف ہے کہ یہ ایک طبعی طریقہ ہے جو ان طبعی اور اجتماعی احوال و ظروف سے پیدا ہوتا ہے جس میں عربوں نے زندگی بسر کی ہے۔ جس چیز کو وراثت کہتے ہیں وہ ان احوال و ظروف کے نتائج کی وراثت ہی ہوتا ہے اگر کوئی دوسری قوم ان جیسے حالات و کوائف میں سے گذرتی ہوتی تو ان کی عقلیت بھی اسی طرح کی ہوتی۔ اسکی سب سے بڑی دلیل محققین کے وہ ثبوت ہیں جو انھوں نے ان اقوام و ملل کے درمیان جو ایک جیسے یا ملتے جلتے احوال و ظروف میں زندگی بسر کرتی ہیں اخلاق اور عقلیتوں میں قوی مشابہت کے تئے پیش کئے ہیں۔ چونکہ عرب لوگ صحرانشین تھے اسلئے ان کو صحرانشینوں سے عقل اور اخلاق میں زیادہ مشابہت حاصل تھی جو دنیا کے دوسرے خطوں میں موجود تھے۔ اس کے بعد ہم ان عوامل کی تشریح کرتے ہیں جو عربوں کے نفوس میں کام کرتے آئے تھے

قوموں کی عقلیت کو بنانے میں دو قوی عامل ہوتے ہیں جو کام کرتے ہیں۔ (۱) طبعی حالات ــــ اس سے ہماری مراد وہ نہریں، پہاڑ، صحرا وغیرہ ہیں جو طبعی طور پر کسی قوم کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہوتے ہیں ــــ اور (۲) اجتماعی کوائف ــــ اس سے ہماری مراد وہ اجتماعی نظم ہے جو کسی قوم کو محیط ہوتا ہے۔

سلیمؔ کے نام

اسلام آگے کیوں نہ چلا؟

مجھے یاد پڑتا ہے سلیمؔ! کہ تم نے اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ یہ سوال پوچھا تھا۔ لیکن غالباً یہ اس زمانے کی بات ہے جب تم تعطیلات میں یہاں آئے ہوئے تھے۔ بہرحال چونکہ سوال بھی اہم ہے اسلئے اس کا بار بار دل میں پیدا ہونا کچھ مستبعد نہیں۔ اسے اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ مختصراً تمہارا سوال یہ ہے کہ اگر اسلام ایک حقیقتِ ثابتہ تھا اور اس کا نظام نوعِ انسانی کے لئے اسقدر نفع بخش تھا تو یہ تھوڑی سی مدت کے لئے چل کر کیوں رہ گیا۔ آگے کیوں نہ بڑھا؟ قبل اس کے کہ میں اس سوال کا جواب دوں، ضروری سمجھتا ہوں کہ خود تمہارے سوال کی کمزوری تم پر واضح کر دوں۔ تم کہتے ہو کہ اگر

(۱) اسلام ایک حقیقتِ ثابتہ تھا۔ اور

(۲) اس کا نظام نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش تھا؛

تو یہ ہمیشہ کے لئے قائم کیوں نہ رہا۔ تمہارا مطلب یہ ہے کہ جو چیز (۱) حقیقتِ ثابتہ ہو یا (۲) نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش ہو، وہ بالضرور از خود قائم رہتی اور آگے چلتی رہتی ہے۔ تم اگر ذرا بھی غور کرتے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ تمہارا یہ کلیہ درست نہیں۔ تم جانتے ہو کہ سچ (TRUTH) ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ ایسی حقیقتِ ثابتہ کہ اس کے ایسا ہونے میں کبھی کسی زمانے میں کسی نے بھی انکار نہیں کیا۔ لیکن اس کے باوجود تم دیکھتے ہو کہ انسانوں نے بہ حیثیت مجموعی آج تک سچ بولنا اختیار نہیں کیا۔ زور زورہ ہمیشہ جھوٹ ہی کا رہا ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ عدل و انصاف نوعِ انسانی کے لئے کس قدر منفعت بخش ہے۔ اس کی نفع بخشیوں میں کبھی کسی نے شک نہیں کیا۔ لیکن انسانیت کی تاریخ میں خالص عدل و انصاف پر مبنی نظام (چند لمحات کے علاوہ) کب قائم ہوا ہے؟ لہٰذا تمہارا یہ کلیہ درست نہیں کہ حقیقتِ ثابتہ یا نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش نظام کو از خود آگے بڑھنا اور قائم رہنا چاہیئے۔ اگر وہ قائم و دائم نہیں رہا تو وہ حقیقتِ ثابتہ یا نفع بخش نظام نہیں تھا۔ یہ تمہارے سوال کی بنیادی غلطی۔ اس کے بعد اصل موضوع پر آؤ کہ اسلام مسلسل آگے کیوں نہ چلا۔ اس کا نظام (تمہارے تصور کے مطابق) تھوڑی دور چلکر ختم کیوں ہو گیا!

میرا خیال ہے کہ تمہیں اس حقیقت کو سمجھانے کے لئے مجھے زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہوگی کہ ہر انقلابی آواز قبل از وقت آتی ہے۔ "قبل از وقت" سے مراد یہ ہے کہ جس زمانے میں وہ آواز اٹھتی ہے۔ اس زمانے کی سطح اس آواز سے نیچے ہوتی ہے۔ زمانے کو اس سطح تک پہنچنے میں وقت لگتا ہے۔ اگر وہ آواز اس زمانے کی سطح کے برابر ہی ہو تو وہ انقلابی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ تو اس سطح اور اس فضا کی پیداوار ہوگی۔ اسی حقیقت کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا کرتے ہیں کہ انقلابی آواز کے لئے اس کا دور سازگار نہیں ہوتا۔ سازگار نہیں ہوتا سے مراد یہ ہے کہ اس دور کے انسان اس آواز کو اچھی طرح (APPRECIATE) نہیں کر سکتے۔ ان کی ذہنی، فکری، تمدنی سطح اتنی اونچی نہیں ہوتی کہ وہ اس غیر معمولی آواز سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکیں۔ وہ آواز ان کے لئے بڑی نامانوس ہوتی ہے اسی لئے وہ اسکی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نابغہ (GENIUS) اپنے زمانے کے ہاتھوں اپنی ناقدر شناسی کا رونا روتے مر جاتا ہے۔ تم اپنے محبوب غالبؔ کو دیکھو۔ وہ کس طرح اپنے زمانے کی پستیٔ سطح کا شکوہ سنج ہے۔ کہیں وہ ان سے کہتا ہے کہ۔ مباش منکرِ غالبؔ کہ در زمانۂ تست۔ کہیں اپنی اس دشواری کا گلہ خواں ہے کہ گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل۔ لیکن چونکہ حقیقت شناس نگاہ رکھتا ہے اور اپنی قدر و قیمت سے خوب واقف ہے اس لئے نہایت حتم و یقین اور خود اعتمادی سے یہ کہکر اپنے دور کو ٹھکرا دیتا ہے کہ۔ قدرِ شعرِ من بہ گیتی بعد من خواہد شدن۔ یہی کچھ اقبالؔ کے ساتھ ہوا۔ وہ بھی اپنے آپ کو "گلِ نخستینِ آدمِ اول" اور "شاعرِ فردا" کہتا ہوا چلا گیا اور اپنے دور کی پستیٔ سطح دیا اپنی آواز کے قبل از وقت ہونیکا

ان الفاظ میں اعلان کر گیا کہ

ولیکن کس ندانست ایں مسافر۔ چہ گفت و باکہ گفت و از کجا بود

اور غالبؔ ہی کی طرح پیشگوئی کر گیا کہ

پس از من شعرِ من خوانند و می یابند و می گویند

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

اور ایک غالبؔ اور اقبالؔ ہی پر کیا موقوف ہے۔ یہ جو تمہیں آج مختلف ممالک کی تاریخ میں آسمانِ فکر و ادب کے درخشندہ تارے نظر آ رہے ہیں، ان سب کے ساتھ ان کے زمانے نے یہی کچھ کیا تھا۔ وہ اپنے زمانے میں روٹی کے ٹکڑے تک کے محتاج رہے۔ محتاج ہی نہیں رہے بلکہ ان کی زندگی اکثر قید و بند میں گذری اور مصائب و آلام کا شکار رہی۔ وہ گمنامی کی زندگی جئے یا بدنامی کی موت مرے۔ لیکن مرنے کے بعد آنے والے زمانے نے ان چیتھڑوں گدڑیوں تک کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالا جن میں انھوں نے زندگی کے دن کاٹے تھے اور انھیں اپنے عجائب گھروں کی یادگار اور پرستش گاہوں کی زینت بنایا ان کا ایک ایک لفظ سونے کے حروف میں لکھا اور جواہرات کے ترازوں میں تولا گیا۔

ان حقائق کی روشنی میں سلیمؔ! ذرا اس زمانے کی علمی، ذہنی، فکری، معاشی، معاشرتی، تمدنی، سیاسی اور عمرانی سطح پر غور کرو جس میں قرآن آیا اور اس کے بعد اس انقلاب آفریں پیغام کو دیکھو جو قرآن لایا، تمہیں خود معلوم ہو جائیگا کہ وہ پیغام اس زمانے کی سطح سے کسقدر اونچا اور اس دور سے کتنا آگے تھا۔ ذرا سوچو سلیمؔ! کہ جس زمانے میں دنیا کی حالت یہ تھی کہ بڑے بڑے مفکرین سے لیکر عام انسانوں تک، مندروں اور قربان گاہوں، معبدوں اور خانقاہوں کی پر اسرار اعجوبہ پرستیوں کے شکار اور راہبوں اور پجاریوں، منتریوں اور کاہنوں کے دامِ تزویر کے اسیر تھے اور انھیں کاروبارِ خداوندی کے براہِ راست کارپرداز تصور کرتے تھے اس زمانے میں یہ آواز کہ انسان اور بندے کے درمیان کوئی تیسری طاقت حائل نہیں کس قدر زمانہ کی سطح سے اونچی تھی۔

جس زمانے میں ساری دنیا کا معمول یہ تھا کہ راجہ کو ایشور کا اوتار، قیصر کو خدائی اختیارات کا حامل اور شہنشاہ کو زمین پر خدا کا سایہ سمجھتی اور ان کی اسی نہج سے پرستش کرتی تھی۔ اس زمانے میں یہ پکار کہ کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ اور یہ کہ انسانوں کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں، اس دور کے کان کے لئے کس قدر ناآشنا اور اس زمانے کے قلب کے لئے کتنی نامانوس تھی۔

جس زمانے میں عزت کا معیار نسلی تفوق، شرف و مجد کا معیار خاندانی اور قبائلی نسبتیں، اور قیادت و سیادت کا مدار حسب و نسب پر سمجھا اور مانا جاتا ہو اور ان امتیازات کے استحکام و بقا کے لئے ملکوں کے ملک اور قوموں کی قومیں تباہ و برباد کر دی جائیں اور ایسا کرنے میں ہر شخص، ہر قبیلہ، ہر ملک اور ہر قوم انتہائی فخر محسوس کرے، اس زمانے میں یہ پیغام کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے اعتبار سے ایک جیسا ہے اور عزت و تکریم کا معیار اس کے ذاتی جوہر ہیں نہ کہ آبائی انساب، کس قدر اجنبی اور "غیر فطری" تھا!

جس دور میں انسانوں کی تقسیم ملکوں کی چار دیواریوں اور قوموں کی حد بندیوں کی رو سے ہوتی تھی اور وطن اور قوم کی خاطر جان دینا زندگی کا مقدس ترین فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ اس دور میں یہ دعوت کہ انسانوں کی تقسیم اور قوموں کی تشکیل، وطن، رنگ، نسل، زبان وغیرہ کے اشتراک سے نہیں بلکہ آئیڈیالوجی کی رو سے ہوتی ہے کسقدر ناقابلِ فہم اور ماورائے سرحدِ ادراک تھی!

جس زمانے میں حالت یہ تھی کہ انسان نے فطرت کے ہر حادثہ اور کائنات کے ہر تغیر کے لئے ایک ایک الگ "خدا" تجویز کر رکھا تھا جس کی خوشنودی اور ناراضگی ہر خوش آئند یا الم انگیز واقعہ کا موجب بنتی تھی، اس زمانے کے انسان سے یہ کہنا کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے ایک لگے بندھے قانون کے تابع ہوتا ہے۔ یہاں ہر معلول (EFFECT) کے لئے ایک علت (CAUSE) اور ہر سبب کے لئے ایک مسبب ہے اور یہ سب کچھ ایک غیر متبدل قاعدے کے مطابق ہوتا ہے جس میں کبھی کسی کے لئے کوئی استثناء نہیں ہوتی، کتنا بڑا محیر العقول تصور اور کیسا ناقابلِ تسلیم دعوےٰ تھا۔

جس زمانے میں انسان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو اپنے ذہن کی تراشیدہ موہوم قوتوں کے سامنے بے دست و پا سمجھ کر اپنے آپ کو قدم قدم پر مجبور و مقہور پاتا تھا، اس زمانے میں انسان سے یہ کہنا کہ ان موہوم قوتوں کا کوئی وجود نہیں اور کائنات کی تمام موجود قوتیں اس کے لئے تابع فرمان

کردی گئی ہیں تاکہ وہ ان سے اپنا کام لے' ایک ایسی آواز تھی جس پر کوئی کان دھرنے کے لئے تیار نہیں تھا

جس زمانے میں انسان کی علمی سطح کا یہ عالم تھا کہ گاؤں میں جو شخص دس سے اوپر گنتی جانتا اسے مافوق البشر تصور کیا جاتا، اس زمانے میں اور تو اور خود پیغمبر کے متعلق یہ اعلان کہ وہ تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے' انسان کے ذہن میں سمانے والی بات ہی نہیں ہو سکتی تھی۔

جس زمانے میں یہ ایک مسلّمہ تھا کہ مقدس بزرگ وہ ہے جس سے کوئی نہ کوئی شعبدہ سرزد ہو' اس زمانے میں یہ کہنا کہ ہم نے پیغمبر تک کو بھی کوئی معجزہ نہیں دیا اور کسی دعوے کے جھوٹے اور سچے ہونیکا معیار یہ ہے کہ عقل و بصیرت اس کے متعلق کیا کہتی ہے اور اس کے ماننے اور نہ ماننے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے' ایک ایسی بات تھی جسے "عقل" تسلیم ہی نہیں کر سکتی تھی! پیغمبر اور معجزہ ہی کوئی نہیں! مذہب کی باتیں اور ان کا مدار عقل و بصیرت پر!! شریعت کی رسومات اور ان کی پرکھ نتائج کی رو سے!!! اسے اگر جنوں بو العجبی نہ قرار دیتے تو اور کیا کہتے۔

جس زمانے میں مزدور (LABOURER) تو ایک طرف' غلام (SLAVE) تک کو فطرت کی صحیح تقسیم کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہو' اس زمانے میں یہ آواز اٹھانا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے کی محنت کے ماحصل کا مالک بن بیٹھے' "پاگل پن" کی بات نہیں تو اور کیا قرار پاتی؟

اور جس زمانے میں قارون کی سی دولت کو خدا کا فضل قرار دیا جاتا ہو۔ زمینداری اور جاگیرداری کو فطرت کا عطیہ ٹھہرایا جاتا ہو اور ذاتی املاک مقبوضات پر کسی قسم کی حد بندی خلاف قانون و شریعت قرار پاتی ہو اس زمانے میں یہ نعرہ بلند کرنا کہ دولت جمع کرنا بد ترین جرم ہے۔ ذرائع پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ رزق کے دروازے تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں۔ ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا اور اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما، معاشرہ کا بنیادی فریضہ ہے کس قدر تحیر انگیز آواز ہوگی؟

ذرا غور کرو سلیم! کہ چھٹی صدی عیسوی میں اس قسم کے تصوراتِ حیات اور اس انداز کے نظریاتِ زندگی' اسوقت کے ذہنِ انسان کے لئے کس قدر نامانوس تھے۔ یہ وہ انقلاب آفریں تصورات تھے جنہیں اپنانے کے لئے زمانہ ابھی تیار ہی نہیں تھا۔ دنیا ان سے ابھی بہت پیچھے تھی۔ وہ تو خیر پھر بھی چھٹی صدی عیسوی تھی جسے ازمنۂ مظلمہ کہتے ہیں' قرآن کے انقلابی تصورات کا تو یہ عالم ہے کہ خود ہمارا زمانہ یہ بیسویں صدی جسے تہذیب و تمدن اور علم و عقل کا بلند ترین مظہر سمجھا جاتا ہے' یہ بھی ان کی ایک تصورات سے ہنوز بہت پیچھے ہے۔ ان تصورات کی سطح اتنی بلند ہے کہ ابھی زمانہ کو نہ معلوم ان تک پہنچنے کے لئے کتنی منزلیں اور طے کرنی پڑیں۔ ان حالات میں تعجب انگیز بات یہ نہیں کہ قرآن کا پیش کردہ نظام (تمہارے تصورات کے مطابق) زیادہ عرصہ تک چلا کیوں نہیں۔ تعجب انگیز بات تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں اتنے لوگ کس طرح پیدا ہو گئے جنہوں نے اپنے زمانے کی سطح سے اتنے بلند اور نامانوس تصورات کو اپنا لیا اور انہیں عملاً متشکل کر دیا۔ سلیم! جب میں اس مسئلہ کو اس زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہوں تو اس قوم (عرب) کی صلاحیتوں کے خیال سے' جس نے اس زمانے میں ایسے افراد پیدا کر دیئے' محوِ حیرت ہو جاتا ہوں اور اس ذات اقدس و اعظم کی تحیر انگیز تعلیم و تربیت کے حسنِ تصور سے میری روح وجد میں آجاتی ہے جس نے اس دور میں ایسے افراد تیار کر لئے جنہوں نے اس قسم کے نظام کو اپنا کر دکھا دیا۔ میرے نزدیک حضورؐ کا سب سے بڑا معجزہ یہی ہے کہ جن حالات میں دنیا کا ہر نابغہ (GENIUS) اپنے زمانہ کی قدر ناشناسی کا رونا رو کر اور اپنے آپ کو "آنے والے زمانے کا انسان" کہہ کر چلا جاتا' حضورؐ ان حالات میں یہ کہیں کہ خیر القرون قرنی۔ سب سے بہتر میرا زمانہ ہے جس میں اس قسم کا انقلاب آفریں نظام' جو زمانہ کی سطح سے منزلوں اونچا ہے' اس حسن و خوبی سے متشکل ہو کر سامنے آگیا ہے۔ اگر تم' سلیم! اس نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھو تو حضورؐ نبی اکرمؐ تمام دنیا کے انقلابی قائدین میں سب سے آگے اور سب سے اونچے نظر آئیں گے۔ ذرا سوچو! کہ ان تصورات کو جن تک زمانہ تیرہ سو سال میں بھی کما حقہٗ پہنچ نہیں سکا' نہ صرف اپنے رفقائے کار کے ذہن نشین کرانا بلکہ انہیں ان کے ہاتھوں سے عملاً متشکل کرا دینا' اعجاز نہیں تو اور کیا ہے؟ کتاب و حکمت کی ایسی حقیقت کشا اور محیر العقول تعلیم اور انسانی صلاحیتوں کا اسقدر ناقابل تصور تزکیہ (نشوونما)' اسی قسم کے معلّم و مربّی کے ہاتھوں عمل میں آسکتا تھا۔ یہی تھا حضورؐ کا وہ عدیم النظیر کارنامہ جس پر خدا اور کائنات کی تمام تعمیری قوتیں غلغلہ ہائے تبریک و تحسین بلند کرتی تھیں۔ (اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۳۳/۵۶) اور حضورؐ کے ساتھ اس جماعتِ مومنین کے لئے بھی جو ساری دنیا سے الگ ہٹ کر اور اپنے زمانے کی سطح سے منزلوں بلند ہو کر اس قسم کے ناممکن التصور نظام کو عملاً متشکل کر رہے تھے۔ (هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ ۳۳/۴۳) سوچو سلیم! اس زمانے میں (جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) قریش کے مرکز مکہ کے اندر اس قسم کا معاشرہ قائم کر دینا جس میں قریش کے بڑے بڑے سردار اور عجم (فارس) کا ایک "حامی" (سلمانؓ)، روم کا ایک مزدور (صہیبؓ) اور حبش کا ایک غلام (بلالؓ) نہ صرف ایک ہی دستر خوان پر بیٹھکر کھانا کھاتے تھے بلکہ باہمی رشتے ناطے بھی کرتے تھے' کس قدر محیر العقول تھا۔ پھر اس معاشرہ میں یہ کیفیت پیدا کر دینا کہ اور تو اور خود رسول اللہؐ جب جب کسی غلام اور لونڈی سے بھی کوئی بات کہتے تو وہ بغیر کسی جھجک کے پوچھ لیتے کہ حضورؐ آپ ایسا وحی کی رو سے فرماتے ہیں یا یہ آپ کا ذاتی مشورہ ہے۔ اور جب آپ فرماتے کہ یہ میرا ذاتی مشورہ ہے تو وہ نہایت آزادی سے کہدیتے کہ معاف فرمایئے! اس باب میں میرا فیصلہ کچھ اور ہے اس لئے میں اس مشورہ کو نہیں مان سکتا۔ کتنا بڑا تھا یہ انقلاب جو ذہنیتوں میں پیدا کر دیا گیا تھا۔ امورِ مملکت میں ایسا نقشہ پیدا کر دینا کہ اگر کسی دوسرے کی رائے زیادہ بہتر ہے تو امیر مملکت (نبی اکرمؐ) اسے خود اپنی رائے پر ترجیح دیتے اور بڑے بڑے اہم معاملات کو باہمی مشاورت سے طے کرتے' کتنی بڑی تبدیلی کا آئینہ دار تھا۔ اس سے بھی آگے بڑھو تو رسول اللہؐ کی وفات پر حضرت صدیق اکبرؓ کا پورے مجمع سے یہ کہنا کہ جو شخص محمدؐ کی پرستش کرتا تھا وہ سمجھ لے کہ اس کا خدا مر گیا ہے۔ لیکن جو خدائے حی و قیوم کا پرستار ہے اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کا خدا زندہ و پائندہ ہے۔ محمدؐ خدا کے ایک رسول تھے۔ وہ اپنا وقت پورا کر کے دنیا سے تشریف لے گئے ہیں۔ اس سے اس نظام پر کچھ اثر نہیں پڑتا جسے حضورؐ نے قائم کیا تھا۔ سوچو سلیم! کہ یہ آواز اس زمانے میں کتنی قبل از وقت تھی۔ پھر حضورؐ کی وفات پر لوگوں کا جمع ہو کر اپنے میں سے ایک امیر چن لینا اور بلا لحاظ قرابت و وراثت حسب کا اسے امیر تسلیم کرنا اس دور کے ذہنِ انسانی کے لئے کسقدر نامانوس واقعہ تھا! اور خود رسول اللہؐ کا اعلان کہ میرے گھر میں ایک پیسہ بھی جمع نہیں۔ اور جو اشیائے مستعملہ میں چھوڑ رہا ہوں' اس کا کوئی وارث نہیں۔ وہ تمام امت کی مشترکہ ملکیت ہیں۔ اس زمانے کے لئے کسقدر تحیر انگیز تھا۔ حضرت ابا بکر صدیقؓ کا بہ حیثیت امیر المومنین' صرف آنا کفاف (روزینہ) لینا جتنی ایک مزدور کی اجرت ہوتی ہے' اور اپنی وفات کے وقت اس رقم کو بھی بیت المال میں یہ کہکر واپس داخل کر دینا کہ معلوم نہیں میں اس رقم کے برابر کام بھی کر سکا ہوں یا نہیں' اس زمانہ کے سطح سے کسقدر اونچا فیصلہ تھا؟

حضرت عمرؓ کا اپنی بیوی سے یہ کہنا کہ قیصر کی بیوی نے (تمہارے عطر کے تحفہ کے بدلے میں) جو جواہرات بھیجے ہیں وہ بہ حیثیت امیر المومنین کی بیوی کے بھیجے ہیں نہ کہ تمہاری ذاتی حیثیت سے اس لئے انھیں بیت المال میں داخل کرنا چاہیئے' اس زمانے کی فضا میں کس قدر تعجب انگیز بات تھی! اور ان کا یہ فیصلہ کہ مفتوحہ زمینیں سپاہیوں میں تقسیم نہیں ہونی چاہئیں بلکہ ملّت کی مشترکہ تحویل میں رہنی چاہئیں' تاکہ اس سے موجودہ اور آنے والی نسلیں یکساں طور پر فائدہ اٹھائیں' اس دور کے لوگوں کے لئے کسقدر حیرت افروز تھا! پھر وادی شام کی اس بڑھیا کا یہ کہنا کہ اگر خلیفۃ المسلمین امت کے تمام افراد کے حالات سے باخبر رہنے اور ان کی ضرورت کو از خود پورا کرنے کا انتظام نہیں کر سکتا تو اسے خلافت کو چھوڑ کر الگ ہو جانا چاہیئے کیونکہ وہ اس کا اہل نہیں' اس زمانے کے لئے کس قدر ناقابل تصور تھا۔ اور حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ میں گیہوں کی روٹی اس وقت کھاؤں گا جب مجھے یقین ہو جائیگا کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی میسر آرہی ہے' ورنہ میں جو کی روٹی ہی کھاؤں گا' اس زمانے کے آسمان کی آنکھ کے لئے کیسا تحیر انگیز تھا۔ سوچو سلیم! کہ اس زمانے میں اس قسم کا معاشرہ قائم کر دینا جس میں اس قسم کے فیصلے بہ تکلف نہ کئے جائیں بلکہ زندگی کا عام معمول بنکر از خود سامنے آتے جائیں' کسقدر قبل از وقت تھا؟ (جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں' ذہنِ انسانی تو تیرہ صدیاں آگے بڑھنے پر بھی اس سطح تک نہیں پہنچا کہ وہ ان تصورات کو اپنا کر زندگی کا معمول بنالے۔ لہٰذا اس زمانے میں اس قسم کا نقش پیدا کر دینا' خواہ وہ قلیل ترین مدت کے لئے ہی کیوں نہ ہو' کتنی بڑی کامیابی تھی۔

اس قلیل سی مدت کے بعد جو کچھ ہوا' اس کا تعلق زیادہ تر تاریخ سے ہے (اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے تمہارے سوال کی ابتدا ہوتی ہے۔ یعنی یہ نظام اس مقام سے آگے کیوں نہ بڑھا) تاریخ (بالخصوص عہدِ رسالتمآبؐ اور صحابہؓ کی تاریخ) کے متعلق میرا نظریہ اور تصور تم پر واضح ہے۔ رسول اللہؐ خود قرآن پر عمل کرتے اور جماعتِ صحابہؓ سے اس پر عمل کراتے تھے۔ لہٰذا اگر اس دور کے متعلق ہماری تاریخ میں کوئی بات ایسی نظر آئے جو قرآن کے خلاف ہو تو ہم کہدیں گے کہ وہ بات صحیح طور پر تاریخ میں نہیں آئی۔

اس کے بعد جو دور آیا اس میں یہ نظام ایک ایسے حادثہ سے دوچار ہوا جس نے اسکی

گاڑی کو کسی اور ہی پٹڑی ڈال دیا۔ یہی وہ حادثہ ہے جسے پوری طرح سامنے آنے سے تمہارے سوال کا جواب مل جائیگا۔ یہ "حادثہ" تھا عجمی ممالک (ایران، عراق وغیرہ) کا مجموعی طور پر مسلمان ہو جانا۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہ لوگ اسلام کے انقلاب آفریں نظام کو سمجھ سوچ کر مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ انھیں میدان جنگ میں شکست ہوئی اور وہ اسلام لے آئے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح سے اسلام لانے والوں کا ذہن قرآن کے انقلابی تصوراتِ زندگی کو بمشکل اپنا سکتا تھا۔ یہ لوگ اپنے ذہن میں ان تمام غلط تصورات نظریات اور معتقدات کو لئے ہوئے آئے جنھیں مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ ان کا خمیر بدترین قسم کی ملوکیت۔ نسل پرستی، پیشوائیت اور سرمایہ داری کا مرکب تھا اور اس پر صدیاں گذر چکی تھیں۔ پھر یہ لوگ اپنی شکست کے انتقام کے جذبات ساتھ لیکر بھی آئے تھے اس پر ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ مسلمانوں کی مختلف شہروں اور قریوں میں ٹڈی دل کی طرح چھا گئے اور تھوڑے سے عرصہ میں ساری فضا کو اپنے خیالات کے مہلک جراثیم سے بھر دیا۔

تم جانتے ہو سلیم! کہ مجھے مسلمانوں کے کسی فرقہ سے کوئی تعلق نہیں۔ میں صرف مسلمان ہوں اس لئے زیر نظر معاملہ میں، مجھے نہ سنیوں کی تائید مقصود ہے نہ شیعہ حضرات کی مخالفت۔ انکے عقائد انھیں مبارک۔ میں تو ہر معاملہ کو خالص قرآن کی روشنی میں دیکھتا اور پرکھتا ہوں۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ان عجمی نومسلموں نے محبتِ آل محمدؐ کے نازک جذبہ کی آڑ میں نسل پرستی کے تصور کو مقدس بنا کر آگے بڑھایا اور یہ عقیدہ پھیلایا کہ مسلمانوں کا امیر انتخاب اور مشاورت سے نہیں بن سکتا۔ یہ منصب خدا کی طرف سے آل محمدؐ کو ودیعت کیا گیا ہے اس لئے یہ حضرت علیؓ اور ان کے بعد ان کی اولاد میں وراثتہً باقی رہیگا۔ اس ایک عقیدہ میں، ملوکیت، نسل پرستی اور پیشوائیت، تینوں کے اثرات یکجا جمع ہو گئے یعنی یہ کہ امارت ایک خاندان کے اندر محدود رہیگی باپ سے بیٹے کو ورثہ میں ملے گی اور خدا کی سند اختیار کو اپنے ساتھ رکھے گی۔ یہ تصورات فتح ایران کے تھوڑے عرصہ (حضرت عمرؓ کی وفات) کے بعد پھیلنے شروع ہو گئے اور رفتہ رفتہ آگے بڑھتے گئے۔ بنی امیہ کے زمانے میں (اگرچہ ملوکیت قائم ہو چکی تھی لیکن پھر بھی) ان کی رفتار دھیمی سی رہی۔ بدقسمتی سے بنو عباس نے اپنی سلطنت ہی ان عجمیوں کی مدد سے حاصل کی تھی اس لئے ان کی سیاست کا تقاضا تھا کہ عربی اقتدار کو یکسر کچل دیا جائے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ان کے زمانہ میں یہ خیالات اس تیزی کے ساتھ پھیلے کہ دین کا کوئی گوشہ ان سے غیر متاثر نہ رہ سکا۔ غیر متاثر ہی نہیں بلکہ دین کے ایک ایک عنصر کی جگہ انہی تصورات نے لے لی اور یوں قرآن کا لایا ہوا پیغام انقلاب یکسر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا (میں نے اس مقام پر عیسائیوں اور یہودیوں کی طرف سے لائے ہوئے خیالات کا ذکر نہیں کیا۔ وہ الگ داستان ہے) ان خیالات کی وجہ سے مسلمانوں کے ذہنوں میں کسقدر تبدیلی آ گئی۔ اس کا اندازہ دو ایک مثالوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جس میں احادیث منسوب الی الرسول کے مجموعے تیار ہو رہے تھے۔ امام بخاریؒ سنیوں کے امام ہیں اور ان کا مجموعہ حدیث اصح الکتب بعد کتاب اللہ تسلیم کیا جاتا ہے یعنی قرآن کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب۔ اس کتاب میں یہ واقعہ درج ملتا ہے۔ کہ جب حضرت ابابکر صدیق کا انتخاب ہوا ہے تو حضرت علیؓ نے آپ کی بیعت نہیں کی اور چھ ماہ تک اس سے الگ رہے۔ اس کے بعد حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہو گیا تو آپ نے حضرت صدیق اکبرؓ کی بیعتِ خلافت کر لی اور ان سے یہ کہا کہ

> آپ کو خدا نے جو رتبہ دیا ہے ہم کو اس پر حسد نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہم اس کو اپنی حق تلفی سمجھتے ہیں کیونکہ رسول اللہ کے ساتھ قرابت کی وجہ سے ہم اسے اپنا حق سمجھتے تھے۔ (بخاری، باب غزوہ خیبر)

تم نے دیکھا سلیم! کہ بات کیا ہوئی؟ یعنی اس میں کہا یہ گیا ہے کہ حضرت علیؓ خلافت کو وراثت سمجھتے تھے جسے رسول اللہ کے بعد آپ کے رشتہ داروں کی طرف منتقل ہونا چاہئے تھا۔ میں تو یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ حضرت علیؓ اسلام کے اس بنیادی نقطہ کو بھی نہیں سمجھتے تھے کہ خلافت ملوکیت کی طرح رشتہ داروں میں ورثہ نہیں آتی بلکہ خلیفہ، امت کے مشورہ اور رضامندی سے منتخب ہوتا ہے۔ لہٰذا اس تصور کے ماتحت میرے نزدیک یہ روایت صحیح نہیں۔ لیکن یہ تو بہرحال واقعہ ہے کہ امام بخاریؒ نے اسے صحیح سمجھ کر اپنے مجموعہ میں شامل کیا اور اس زمانے کے مسلمانوں نے بھی اسے صحیح ہی سمجھا جو اسے اس مجموعہ میں شامل ہونے دیا اور نہ صرف شامل ہونے دیا بلکہ اس مجموعہ کو اصح الکتب بھی قرار دیا۔ امام بخاریؒ نے لکھا ہے کہ انھوں نے قریب چھ لاکھ حدیثیں جمع کیں جن میں سے (مکررات چھوڑ کر) قریب دو ہزار ایسی تھیں جنھیں انھوں نے صحیح سمجھ کر اپنے مجموعہ میں شامل کیا۔ انہی میں یہ روایت بھی ہے۔ اس واقعہ کو بیان کرنے سے میرا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ تیسری صدی ہجری میں خود مسلمانوں کی ذہنیت اس سطح پر آ گئی تھی کہ انھوں نے اس بات کو حضرت علیؓ کی طرف منسوب کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ یعنی اسوقت وہ ذہنیت جسے رسول اللہ نے تعلیم قرآن سے پیدا کیا تھا، ختم ہو چکی تھی اور وہ ذہنیت جو اس زمانے میں عام تھی (یعنی بادشاہت، وراثتاً ملا کرتی ہے)۔ مسلمانوں میں بھی آ چکی تھی۔ ان میں عملاً ملوکیت رائج تھی اور اس میں وہ کوئی خرابی محسوس نہیں کرتے تھے۔ جبھی تو انھوں نے اسے حضرت علیؓ کی طرف بھی منسوب کر دیا۔ ورنہ اگر ذہنیت وہی ہوتی جسے رسول اللہ نے پیدا کیا تھا تو نہ امام بخاریؒ اس روایت کو صحیح سمجھ کر اپنے مجموعہ میں شامل کرتے اور نہ ہی دوسرے مسلمان اسے حضرت علیؓ کی طرف منسوب کرنے کی اجازت دیتے۔ اس سے تم نے سمجھ لیا ہو گا کہ وہ بلند ذہنیت جسے رسول اللہ نے انقلابی طریق سے (BY REVOLUTION) پیدا کیا تھا کچھ عرصہ کے بعد ختم ہو گئی تھی اور مسلمان اپنے دور کی عام سطح تک آ گئے تھے۔ اور اسکی وجہ سے ان غیر قرآنی تصورات کا سیلاب تھا جو ایران و عراق کی طرف سے یک لخت امنڈ کر آ گیا تھا۔

یا مثلاً وہ واقعہ جو ہمیں امام داؤد کے مجموعہ احادیث میں ملتا ہے۔ تم پر اب تک یہ حقیقت واضح ہو چکی ہوگی کہ قرآن، سرمایہ داری کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ سرمایہ داری کی اصل بنیاد وہ فاضلہ دولت (زر SURPLUS MONEY) ہوتی ہے جو انسان کی ضروریات سے زائد ہو۔ اور وہ اسے جمع کرے۔ قرآن نے دولت جمع کرنے کو جرم عظیم قرار دیدیا اور اس طرح فاضلہ دولت کا وجو ختم کر دیا۔ اس باب میں قرآن میں متعدد آیات موجود ہیں۔ ان میں سے ایک اہم آیت سورۂ توبہ کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ....مَا كَنَزْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (۹/۳۴-۳۵)، "جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں صرف کرنے کے لئے کھلا نہیں رکھتے، تو انھیں الم انگیز عذاب کی خبر دیدے۔ جب اس دولت کو جہنم کی آگ میں تپایا جائیگا اور اس سے ان کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور ان کی پشت پر داغ دیا جائیگا۔ اور ان سے کہا جائیگا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنی ذات کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ لہٰذا جو کچھ تم اس طرح خزانہ بنا کر بیٹھ گئے تھے اب اس کا مزہ چکھو۔" بات بالکل صاف ہے سلیم! قرآن نے دولت جمع کرنے کو جرم قرار دیا۔ رسول اللہ نے اس پر عمل کر کے ایسا نظام متشکل فرمایا جس میں فاضلہ دولت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ (اس عبوری دور کے لئے جس میں ہنوز یہ نظام متشکل نہیں ہوا تھا، خیرات، وراثت وغیرہ کے احکام دیئے گئے تھے) یہ وہ نظام تھا جو اس زمانے کی عام ذہنیت کے لئے یکسر غیر مانوس تھا۔ اسے مانوس بنانے کے لئے حضورؐ نے اپنی تعلیم سے صحابہؓ میں وہ بلند ذہنیت پیدا کی تھی جو اس انقلابی نظام کی متحمل ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کے بعد (ان اسباب کی وجہ سے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) مسلمان پھر اسی سطح پر اتر آئے جو اس زمانے عام تھی۔ چنانچہ ابوداؤد میں، سورۂ توبہ کی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ

> ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ والذین یکنزون الذہب والفضۃ۔ تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انھوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری فکر کو دور کر دوں گا اور اس مشکل کو حل کر دوں گا۔ پس حضرت عمرؓ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا نبی اللہ۔ یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں ہوئی ہے آپ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اسی لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے.... ابن عباس کہتے ہیں کہ یہ بیان سنکر حضرت عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔ (ابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ۔ جلد اوّل۔ کتاب الزکوٰۃ)

تم غور کرو سلیم! کہ یہ ذہنیت (کہ صحابہؓ پر خدا کا حکم گراں گذرے۔ حضرت عمرؓ اس مصیبت کا حل تلاش کرنے کے لئے رسول اللہ کے پاس جائیں۔ اور رسول اللہ یہ فرما کر اس مشکل کا حل بتا دیں کہ جتنی جی چاہے دولت جمع کرو۔ بس اس میں سے سال کے بعد اڑھائی فیصدی خدا کے نام پر دیدیا کرو۔ باقی سب جائز ہو جائیگا) کبھی بھی وہ ذہنیت ہو سکتی ہے جسے رسول اللہ نے انقلابی طور پر صحابہؓ میں پیدا کر دیا تھا اور جس کی رو سے (اور تو اور) انہی حضرت عمرؓ کی۔ جن کے متعلق اوپر کی روایت میں کہا گیا ہے کہ وہ اس مصیبت کا حل معلوم کرنے کے لئے رسول اللہ کے پاس گئے تھے) یہ حالت تھی کہ

بہ حیثیت امیر المؤمنین آپ کے گذارہ کے لئے جو وظیفہ مقرر کیا گیا تھا اسکی تعداد

دو درہم روزانہ تھی (ابن سعد)

اور

حضرت حسنؓ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ خطبہ دے رہے تھے۔ میں نے شمار کیا کہ تہ بند میں بارہ پیوند تھے۔ (کنز العمال)

لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں امام ابو داؤدؒ نے اپنا مجموعہ مرتب کیا ہے اسوقت مسلمان دنیا کے عام دستور کے مطابق اسی سطح پر اتر آئے تھے کہ اگر کچھ خیر خیرات کر دی جائے تو سرمایہ داری کے نظام میں کوئی عیب نہیں۔ جبھی تو امام داؤدؒ نے اس قسم کی روایت کو صحیح سمجھ کر اپنے مجموعہ میں داخل کر لیا (جو قرآن کا بنایا ہوا سارا نظام درہم برہم کر دیتی ہے) اور مسلمانوں نے اسے صحیح تسلیم کر لیا۔

میرا خیال ہے سلیم! ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ

(۱) قرآن نے زندگی کے متعلق ایسے تصورات دیئے تھے جو اس زمانے کی عام سطح سے بہت بلند تھے اور اس اعتبار سے بہت قبل از وقت تھے۔

(۲) رسول اللہؐ نے اپنی محیر العقول تعلیم و تربیت سے اپنے رفقائے محترمؓ کی ذہنیت میں ایسی بلندی پیدا کر دی کہ وہ قرآن کے ان انقلابی تصورات کو اپنانے کے قابل ہو گئے (یہ ایک جداگانہ حقیقت ہے کہ اس قسم کی تبدیلی قبول کر لینے والے افراد بھی اسی قوم میں مل سکتے تھے جو قرآن کی اولین مخاطب تھی)

(۳) جب مسلمانوں کی فتوحات عام ہوئیں تو وہ لوگ سیلاب کی طرح امنڈ کر اسلام میں داخل ہو گئے جن کی ذہنیت اس دور کی عام ذہنیت کی سطح پر تھی اور ان کی تعلیم و تربیت ایسی نہیں ہوئی تھی جس سے ان کی سطح میں بھی وہ بلندی آجاتی جس سے وہ قرآنی تصورات کو اپنانے قابل ہو جاتے۔

(۴) اس طرح مسلمانوں کی قوم (اسلام نہیں بلکہ مسلمانوں کی قوم) اس سطح پر آگئی جو اس زمانے کی عام سطح تھی۔ اور انھوں نے اسلام کو اسی ذہنیت کے قالب میں ڈھال دیا۔ یہ چیز قرآن کی اس تفسیر کی رو سے بہت آسان تھی جو وضعی روایات کے ذریعے عام کی گئی۔

(۵) یوں اسلام تھوڑے عرصے کے بعد آگے نہ چلا۔ اگر وہ لوگ دین کا مدار قرآن کو قرار دیتے اور عہد نبی اکرمؐ اور دور صحابہؓ کی تاریخ کو قرآن کی روشنی میں پرکھتے تو وہ ان عجمی خیالات سے متاثر نہ ہوتے اور اس طرح صحیح اسلام آگے بڑھتا چلا جاتا۔ لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔

ممکن ہے تم یہ کہدو سلیم! کہ قرآن نے ایسے تصورات دیئے ہی کیوں جو اس زمانے کی سطح سے اتنے آگے تھے؟ (مجھے تمہارے متعلق تو یہ توقع نہیں کہ تم ایسی کچی بات کہدو۔ لیکن جن لوگوں سے تمہیں واسطہ پڑتا ہے، وہ ضرور ایسا کہدینگے۔ لہٰذا انھیں سمجھانے کے لئے لکھتا ہوں کہ) انقلابی تصور تو کہتے ہی اسے ہیں جو اپنے زمانہ کی ذہنیت کا پیدا کردہ نہ ہو بلکہ اس سے بہت آگے اور بہت بلند ہو۔ اگر وہ اپنے زمانے کی سطح سے آگے نہیں تو اسے انقلابی کیسے کہا جا سکیگا؟ لہٰذا کوئی تصور جتنا زیادہ انقلابی ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ اپنے زمانے سے آگے، فلہٰذا قبل از وقت ہوگا۔ قرآن چونکہ یکسر انقلابی تصور کا حامل ہے، اس لئے وہ اپنے زمانہ نزول کی سطح سے کہیں آگے تھا۔ "اپنے زمانۂ نزول" تو ایک طرف، وہ تو ہمارے زمانے کی سطح سے بھی کہیں آگے ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس قسم کے انقلابی تصورات دیئے کیوں جاتے ہیں جو اپنے دور سے آگے ہوتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ زمانے کی امامت کریں۔ وہ انسانی ذہنیت کو اپنے پیچھے لگائیں اور اسے تدریجاً اس منزل تک لے جائیں جس تک وہ تصورات کاروانِ انسانیت کو پہنچانا چاہتے ہیں۔ اگر انقلابی تصورات دنیا میں نہ آئیں تو انسانی ذہنیت اپنی سطح سے ایک انچ بھی اونچی نہ ہو سکے۔ یہ انہی تصورات کی راہ نمائی ہے جو انسانی ذہن کے لئے چراغ راہ بنکر اسے بلندیوں کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ تصورات، فضا میں ایسے "جراثیم" چھوڑ دیتے ہیں جن سے انسانی ذہن، غیر شعوری طور پر متاثر ہوتا رہتا ہے اور اس طرح غیر محسوس طور پر ان کے پیچھے چلتا رہتا ہے۔ اسی کو لوگ عام طور پر "زمانے کا تقاضا" کہتے ہیں۔ "زمانے کا تقاضا" سلیم! ایک مبہم اصطلاح ہے۔ جن لوگوں کے سامنے وحی کے انقلابی تصورات نہیں ہوتے وہ سمجھ نہیں سکتے کہ انسانی ذہن کونسی کشش سے کھنچے کھنچے ایک خاص سمت کو جا رہا ہے۔ یہ کشش درحقیقت وحی کے انقلاب آفرین (قبل از وقت آئے ہوئے) تصورات کی غیر محسوس راہ نمائی ہوتی ہے۔ جو فضا میں پھیلی ہوتی ہے اور جس سے انسانی ذہن غیر شعوری طور پر متاثر ہو رہا ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے تم تاریخ کا مطالعہ کرو سلیم! تو تمہیں اس سوال کا جواب مل جائیگا کہ کیا قرآن کے دیئے ہوئے تصورات 'چند ہی دن تک چلکر رہ گئے' یا وہ آج تک برابر چلتے آ رہے ہیں اور زمانہ برابر "مسلمان ہوتا" چلا جا رہا ہے۔ ذرا سوچو سلیم! کہ جس زمانے میں قرآن نے اپنے انقلاب آفرین تصورات دیئے تھے اس وقت انسانی ذہنیت کس سطح پر تھی۔ پھر اس کے بعد یہ دیکھو کہ اس تیرہ سو سال کے عرصہ میں انسانی ذہن نے ان تصورات کو قبول کیا ہے جو قرآن نے دیئے تھے، یا وہ ان تصورات سے ہٹ کر ان سے متضاد سمت کی طرف گیا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، انسانی ذہن کا اسوقت فیصلہ یہ تھا کہ ملوکیت عین "فطرتِ انسانی" کے مطابق نظامِ جہانبانی ہے۔ قرآن نے اسکی تردید کی اور یہ تصور دیا کہ انسانوں کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ اسوقت ذہن انسانی کے لئے یہ تصور نامانوس تھا۔ تم بتاؤ کہ اس کے بعد اس تیرہ سو سال میں، ذہن انسانی کا رخ ملوکیت کی سمت رہا ہے یا وہ آہستہ آہستہ "اسلام قبول کرتا" چلا گیا ہے۔ اور قبول کرتا چلا جا رہا ہے؟

انسانی ذہن کا اسوقت فیصلہ یہ تھا کہ غلاموں کا وجود معاشرہ کا جزو لاینفک اور فطرت کی صحیح تقسیم کا نتیجہ ہے اس لئے اس نظام کو کبھی مٹایا نہیں جا سکتا۔ قرآن نے یہ انقلابی تصور دیا کہ تمام افرادِ انسانیہ اپنی پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ہیں اس لئے کسی فرد کا دوسرے فرد کو غلام بنا لینا یکسر خلاف انسانیت ہے۔ اس وقت کے ذہن انسانی کی عام سطح نے اس تصور کو ناقابل قبول سمجھا۔ لیکن بتاؤ کہ اس کے بعد زمانے نے اس تصور کو قابل قبول سمجھا یا اپنے قدیمی تصور کو؟

ذہن انسانی کا اس وقت کا فیصلہ تھا کہ ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ پر، ایک قوم کو دوسری قوم پر یعنی ایک نسل کو دوسری نسل پر فوقیت حاصل ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ محض توہم پرستی ہے۔ انسان کی قدر و قیمت اس کے جوہر ذاتی سے ہے نہ کہ انتسابات نسبی سے۔ اس زمانہ نے اس تصور کو اپنے لئے ناآشنا پایا۔ لیکن تم غور کرو کہ اس کے بعد زمانہ نے اپنے لئے کیا فیصلہ کیا؟ کیا وہی نہیں جسے قرآن نے پیش کیا تھا؟

اس زمانہ میں ذہن انسانی کا فیصلہ یہ تھا کہ قومیں شخصیتوں کے سہارے آگے بڑھتی ہیں اسلئے ہیرو ورشپ (مشاہیر پرستی) عین تقاضائے فطرت ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ تصور ذہن انسانی کے عہد طفولیت کی یادگار ہے۔ اب قومیں آئیڈیالوجی کی بنیاد پر مرتب ہونگی اور اپنے نظام کی خوبیوں کے سہارے آگے بڑھیں گی۔ اس زمانہ نے اس تصور کو اپنے لئے ناآشنا پایا اس لئے رد کر دیا۔ لیکن تم بتاؤ کہ آج تمہارے زمانہ کا رخ کیا اس رد کردہ تصور کو گلے لگانے کی طرف نہیں ہے؟

اس زمانہ میں جاگیرداری، زمینداری، سرمایہ پرستی کا نظام عین مطابق فطرت سمجھا جاتا تھا۔ قرآن نے یہ انقلاب انگیز تصور پیش کیا کہ ہر فرد انسانی کا فریضہ تمام نوعِ انسانی کی نشوونما ہے اسلئے وسائل و ذرائع پیداوار کسی انسان کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہ سکتے۔ زمین پر سانپ کی طرح بیٹھ جانا اور چاندی اور سونے کے ٹکڑوں کو جمع کرتے چلے جانا انسانیت کی عدالت میں بدترین جرم ہے جس کی سزا تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ اس زمانہ نے اس تصور کو ٹھکرا دیا لیکن ذرا غور کرو سلیم! کیا زمانہ اسی ٹھکرائے ہوئے تصور کو اپنانے کے لئے مضطرب و بیچین نہیں ہو؟

میں نے یہ چند باتیں محض بطور مثال لکھدی ہیں۔ ورنہ قرآن کی کونسی حقیقت ہے جو اس اصول کی تائید میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ زمانہ اسکے انقلاب آفرین حقائق میں سے بعض کو اپنا چکا ہے بعض کو اپنانے کے لئے مضطرب و بیقرار ہے اور جو باقی حقائق ہیں وہ ابھی اس زمانہ کی سطح کیلئے بھی "قبل از وقت" ہیں۔ یہ اسلئے کہ قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے آخری اور مکمل رہنمائی ہے۔ لہٰذا اس کے حقائق زمانے کی لہروں کے ساتھ ساتھ کھلتے جائیں گے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)

ہم نوعِ انسانی کو اپنی نشانیاں انفس و آفاق میں دکھاتے چلے جائیں گے تا آنکہ یہ بات ابھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ حقیقت ثابتہ ہے۔

لیکن اس بوالعجبی کو کیا کہئے سلیم! کہ دنیا تو "انفس و آفاق" کی شہادات سے حقیقت

کو پہنچانے کا راستہ اختیار کرتی ہے وہ تو قرآنی حقائق سے مانوس ہوتی چلی جارہی ہے، لیکن مسلمان کے سامنے جب قرآن خالص کی تعلیم آتی ہے تو وہ اسکی سخت مخالفت کرتا ہے اس لئے کہ اس نے اپنی ذہنیت وہی رکھی ہے جو ہزار سال پہلے عجمی تصورات کی بدولت بنی تھی اور اس کا نام "اتباعِ سلف" رکھکر اس سے متمسک رہنے ہی میں نجات و سعادت کا راز سمجھتا ہے - اگر وہ قرآن پر غور و فکر کے بعد اپنی روایتیں کرے اور اسلاف کے ترکہ میں جو کچھ ملا ہے اسے قرآن کی روشنی میں پرکھکر، جو اس کسوٹی پر کھرا ثابت ہو اسے قبول کرے اور جو کھوٹا ثابت ہو اسے چھوڑ دے، تو اسے پھر سے وہی راستہ مل جائے گا جس پر نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ گامزن ہوئے تھے اور یہ اپنے زمانہ کی عام سطح سے کہیں اونچا چلا جائیگا۔ لیکن یہ ایک الگ سا مبحث ہے۔

اب بتاؤ سلیم کیا اس کے بعد بھی تم یہی کہو گے کہ اسلام صرف چند دنوں تک چل سکا اور اسکے بعد فیل ہو گیا ؟ تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ زمانہ میں آ کے صرف اسلام ہی چلا، غیر قرآنی تصورات سب ایک ایک کر کے فیل ہو گئے۔

وان الباطل کان زھوقا۔

والسلام

۸؍ جون ۱۹۵۵ء

پرویز

ماہنامہ طلوعِ اسلام کے پرانے پرچے

ماہنامہ طلوعِ اسلام کے جو پرانے پرچے دفتر میں موجود ہیں ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

۱۹۴۹ء	اگست، ستمبر، نومبر، دسمبر
۱۹۵۰ء	نومبر
۱۹۵۱ء	مارچ تا نومبر
۱۹۵۲ء	اگست تا نومبر
۱۹۵۳ء	جنوری کے علاوہ سب
۱۹۵۴ء	پورے سال کے

یہ پرچے بزمہائے طلوعِ اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دیدیئے جائیں گے۔

خواہشمند حضرات اپنی فرمائشیں جلد بھیجیں۔ ورنہ پرچے ختم ہو جانے کا احتمال ہے۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام - کراچی

مطبوعاتِ طلوعِ اسلام

معراجِ انسانیت — از پرویز - سیرتِ صاحبِ قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش - مذاہبِ عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیز ڈ کاغذ مضبوط و حسین جلد بمعہ گرد پوش ——— قیمت - بیس روپے

ابلیس و آدم — از پرویز - سلسلۂ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظرِ ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق قصۂ آدم - ابلیس - جنات - ملائکہ - وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۴۰۰ صفحات ——— قیمت ——— آٹھ روپے

قرآنی دستورِ پاکستان — اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے - اور حکومت علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ دو سو بیس صفحات ——— قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں: اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے ؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات۔ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۰۰ صفحات ——— قیمت ——— دو روپے

سلیم کے نام — از پرویز - نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں - ان کا شگفتہ، مدلل اور اچھوتا جواب - بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات ——— قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے — روزمرہ کی زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ ۴۰۰ صفحات - قیمت ——— چار روپے

اسبابِ زوالِ امت — از پرویز - مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا ؟ ایک سو اڑتالیس صفحات ——— قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے — ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر - سات سالہ دورِ آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ۔ ۲۵۰ صفحات ——— قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناسِ رسولؐ — یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی ؟ مزاج شناسِ رسول! مزاج شناس کون ہے ؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۴۰ صفحات - قیمت ——— چار روپے

مقامِ حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد ——— چار روپے

فردوسِ گم گشتہ — از پرویز - ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۱۷ صفحات ——— قیمت چھ روپے

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات ——— قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت — از پرویز - مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔ صفحات ۱۹۲ ——— قیمت دو روپے

نظامِ ربوبیت — از پرویز - انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب۔ ضخامت تین سو صفحے۔
قیمت قسمِ اوّل ——— چھ روپے قسمِ دوم ——— (غیر مجلد) ——— چار روپے

اقبال اور قرآن — از پرویز - علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ - دست کور کے ساتھ۔ صفحات ۲۵۶ ——— قیمت دو روپے

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ: ادارۂ طلوعِ اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۱۳، ۳ - کراچی

جاوید پریس میکلوڈ روڈ کراچی

حقائق و عبر

پتی پوجا

محترم دریابادی صاحب کے اخبار صدق (لکھنؤ) بابت ۲۷ مئی ۵۵ء میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے:

آج چار دن کے بعد پتی پوجا کی تقریب عظیم ختم ہوئی۔ یہ تقریب دریائے گومتی کے کنارے یونیورسٹی کے متصل شوہر دار ہندو عورتوں نے اوندھے منہ لیٹے شوہروں کے قدموں گر گر کر ان کی پوجا کی۔ پوجا کے لیڈر ضلع رائے بریلی کے ایک سادھو شری امیش جی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں سو بیویوں نے حصہ لیا۔ وسیع شامیانہ اور خیمہ الگ الگ لگے ہوئے تھے۔ پہلے میاں بیوی مل کر پاربتی دیوی کی پوجا کرتی تھیں۔ پھر ہر ایک خیمہ میں جا کر بیویوں نے شوہروں کے پاؤں دھوئے اور وہ دھوون پیا۔ اس کے بعد انھوں نے شوہروں پر پھول چڑھائے۔ اور ان کے پیروں کو چھوا۔ ایک پنڈت جی نے مائیکروفون پر منتر پڑھا۔ جس میں بیوی شوہر سے کہتی ہے کہ تم ہی میرے پالن ہار ہو۔ تم ہی میرے پیدا کرنے والے ہو۔ اور تم ہی میرے ختم کرنے والے ہو۔ پنڈال میں کسی بن بیاہے یا بن بیاہی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ یہ ہندوؤں کی ایک قدیم مذہبی تقریب ہے۔ جس کی تجدید اب ہو رہی ہے کہا جاتا ہے کہ سری کرشن جی کی طرف سے پتی ورت دھرم پیش ہونے کے بعد دوارکا میں بیویوں نے اپنے شوہروں کی پوجا اس طرح کی تھی۔ ۵ من تیل اور گھی اور گڑ اور صندل پانچ ہون کنڈوں میں صرف ہوتا رہا۔"

اس خبر پر مولانا دریابادی صاحب کا تبصرہ بھی ساتھ ہی شائع ہوا ہے۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ انھوں نے لکھا ہوگا کہ انسان انسان کی پوجا کرے (خواہ وہ خاوند ہی کیوں نہ ہو) ہندومت ہی کو زیب دے سکتا ہے جو انسان کے عہد توہم پرستی کی یادگار ہے۔ اسلام میاں اور بیوی کا احترام سکھاتا ہے۔ پوجا کرنا نہیں سکھاتا۔ وغیرہ۔

لیکن نہیں! تبصرہ کچھ اور ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ارشاد ہے:

شاباش ہے اودھ کی دھرم پتنیوں کی اس جرأت و ہمت کو۔ اس بیسویں صدی میں "حریت نسواں" کے عین غلغلہ کے وقت یہ پتی پوجا کر ڈالی۔ کہیں کسی جنگل یا دیہات میں چھپ چھپا کر نہیں عین شہر لکھنؤ میں بجلی کے تیز قمقموں کی چمک دمک میں۔ لاؤڈ اسپیکروں پر ہانک پکار کے ساتھ اور وہ بھی یونیورسٹی کے عین متصل! اور آخری دن فوٹو ہی نہیں لئے گئے، بلکہ کسی منچلی امریکی کمپنی نے فلم بھی تیار کر لی! ––– کیا کہیئے ہمارے ملک میں نہ ہوئی کوئی "اپوا" کی قسم کی ترقی پسند زنانہ انجمن۔ ورنہ ان دھرم پتنیوں کو معلوم ہو جاتا کہ اس صدی میں پتی پوجا کے کیا معنی ہوتے ہیں؟"

آپ نے غور فرمایا ان مولانا صاحب کی طرف سے اس قسم کے کھلے ہوئے شرک پر شاباش کیوں مل رہی ہے؟ اس لئے کہ (شرک ہی سہی) اس سے معاشرہ میں عورت کی حیثیت مرد کے مقابلہ میں ایک لونڈی سے بدتر رہ جاتی ہے (بدتر اس لئے کہ اس مکروہ حرکت کو تو شاید کوئی لونڈی بھی گوارا نہ کرے کہ وہ آقا کے غلیظ پاؤں دھو کر دھوون غٹاغٹ پی جائے) اور مولوی انہی باتوں سے خوش ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک عورت کا مرد کے برابر واجب التکریم قرار پا جانا انتہائی درجہ کا خلاف انسانیت تصور ہے۔ چنانچہ مولانا صاحب اپنے اسی پرچہ میں دوسری جگہ گلہ سنج ہیں کہ "طبقۂ خواتین کی طرف سے مطالبۂ حقوق کا شور اس ہمہمہ کے ساتھ بلند ہوا اور آزادیٔ نسواں کا بگل اس زور کے ساتھ بجایا گیا کہ پڑھی لکھی خاتون ہر قید ہر پابندی، ہر خدمت واطاعت کو اپنے حق میں غلامی اور اپنی خودداری کے منافی سمجھ بیٹھی۔"

آپ کو معلوم ہے کہ عورتوں کے مطالبۂ حقوق پر اس طرح تعل بر آتش ہو جانے والے اور خاوندوں کے پاؤں دھو کر پی جانے والی بیویوں پر شردھا کے پھول نچھاور کرنے والے یہ مولوی صاحب خیر سے قرآن کے مفسر بھی ہیں۔ اسی قرآن کے جس میں (معاذ اللہ، بد قسمتی سے) یہ بھی لکھا ہے کہ

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۲/۲۲۸)

قاعدے کے مطابق عورتوں کے مردوں پر اتنے ہی حقوق ہیں جتنے مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں۔

قرآن کی اس قسم کی آیات کو دیکھ کر یقیناً ان لوگوں کا خون کھول جاتا ہوگا کہ اس میں یہ کیوں درج ہیں۔ اگرچہ عملاً انھوں نے آیات کو روایات اور فقہ کی رو سے مدت ہوئی منسوخ کر رکھا ہے۔

تخت کے خواب

دلی کے شاہزادوں کی حالت یہ تھی کہ سلطنت چھنی کو سو سال کا عرصہ گذر چکا تھا۔ اور ان کا گذارہ اب تانگے چلانے اور مٹیا کو پہنچے پر رہ گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو "ابد دولت" کہا کرتے تھے۔ اور لال قلعہ میں جشن تاجپوشی کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ شاہزادے تو دلی ہی میں رہ گئے۔ لیکن ان کی جگہ یہاں نئی قسم کے شاہزادے پیدا ہو گئے یہ وہ شاہزادے ہیں جنہیں کسی وقت مشتری کی نیک گردش سے وزارت کی کرسی مل گئی۔ اور پھر زحل کی نحوست سے وہ اس سے برطرف کر دیئے گئے۔ لیکن وہ اس کے بعد عمر بھر اسی کرسی کا خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ انہی شاہزادوں میں ایک بزرگوار سندھ کے قاضی فضل اللہ صاحب ہیں۔ یہ کسی زمانہ میں سندھ کے ہوم منسٹر تھے۔ مدت ہوئی وہ منصب ان سے چھن گیا لیکن پچھلے دنوں جب فیڈرل کورٹ نے یہ کہا کہ ۱۹۴۷ء سے اس وقت تک کے مجلس آئین ساز کے پاس کردہ قوانین قانونی حیثیت نہیں رکھتے تو قاضی صاحب نے جھٹ سے حکم صادر فرما دیا کہ سندھ کے ہوم منسٹر ہم ہیں۔ اس لئے تمام فائلیں ہمارے پاس بھیجی جایا کریں۔ اس حکم پر قہقہوں کی آواز ہنوز فضا میں گونج ہی رہی تھی کہ انھوں نے اب فرما دیا کہ صوبہ سندھ کی مسلم لیگ کے صدر وہ ہیں نہ کہ کھوڑو صاحب۔ چنانچہ وہ بہ حیثیت صدر پارلیمانی بورڈ کا جلسہ بھی طلب کر رہے ہیں تاکہ مجلس آئین ساز کی نشستوں کے لئے امیدواروں کو ٹکٹ تقسیم کئے جائیں۔ غور کیجئے کہ

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر

لیکن یہ ابھی تک اپنے اسی گھماؤ پھراؤ منصوبوں کے حسین خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور یہ چیز ایک قاضی فضل اللہ صاحب تک ہی محدود نہیں تمام "پاکستانی شہزادوں" کا یہی حال ہے۔ جو ایک دفعہ وزارت کا جھولا جھول لیتا ہے۔ پھر باقی عمر اسی کی پینگ میں گذار دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ ان حضرات کے ذاتی جوہر تو کچھ ہوتے نہیں کہ وہ کہیں اور کسی حال میں بھی رہیں ان کی شہرت اور مقبولیت ان کے ساتھ رہے۔ ان غباروں کی بلندیوں کا راز اس گیس میں ہوتا ہے۔ جو ان میں وزارت کا پمپ بھر دیتا ہے۔ جونہی وہ گیس نکلا غبارہ زمین پر آ لیا اور اس کے بعد ––– پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

یہ وجہ ہے کہ ان کی باقی تمام عمر اسی پمپ کی ہوس میں گذر جاتی ہے۔ ان سے کون کہے کہ

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی ہستی کے تجلی زار میں آباد ہو

ذاتی ملکیت
کا اصول
ملا کے نزدیک بڑا مقدس ہے
لیکن
اس کے بارے میں
قرآن کا حکم کیا ہے؟
اس کی تفصیل
"نظام ربوبیت"
میں دیکھئے

بین الاقوامی جائزہ

روس نے "امن" کے ترکش سے ایک اور تیر چلایا ہے اب کے اس کا نشانہ مغربی جرمنی کے چانسلر ڈاکٹر اڈینی نار ہیں انھیں ماسکو آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ جو قبول کرلی گئی ہے۔ اس دعوت کا مقصد سفارتی، تجارتی اور ثقافتی تعلقات کی استواری ہے۔ روس کا یہ اقدام قطعاً حیران کن نہیں کیونکہ ایک عرصہ سے یہ توقع کی جارہی تھی کہ وہ ایسا کریگا البتہ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس سے کیا فائدہ اٹھاتا ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر اڈینی نار کا تعلق ہے انھوں نے واضح طور پر کہ دیا ہے کہ وہ الحاق بندی اور مغرب سے اتحاد کے حق میں ہیں اور اس سے دست کش نہیں ہونا چاہتے۔ اگر وہ اسی پالیسی پر کاربند رہے تو روس کو ان سے کسی بہتری کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ لیکن روس ڈاکٹر موصوف کو بچانسے سے کہیں زیادہ اسے ضروری سمجھتا ہے کہ اپنی امن پسندی کا ثبوت دے کر اندرون ملک ان کی پوزیشن مخدوش کردے تاکہ وہ زیادہ سرگرمی سے مغرب کے اتحادی نہ بن سکیں۔ مغربی جرمنی نے اس دعوت کا خیر مقدم کیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ اعلان کیا ہے کہ اقوام مغرب سے مشورہ کئے بغیر روس سے مذاکرات کا آغاز نہیں کیا جائیگا۔ چنانچہ ڈاکٹر اڈینی نار ۱۷ر جون کو نیویارک میں امریکی، برطانوی اور فرانسیسی وزرائے خارجہ سے مل رہے ہیں۔ وہ اس طرح صلاح مشورہ کرنے کے بعد ماسکو جائیں گے۔

روسی وزیر خارجہ مسٹر مالوٹوف نے فرانسیسی وزیر اعظم اور وزیر خارجہ کو بھی ماسکو آنے کی دعوت دی ہے۔ وہ سان فرانسسکو جاتے ہوئے پیرس میں ان حضرات سے ملے اور دوران گفتگو میں یہ معنی خیز فقرہ استعمال کیا کہ جو ہو چکا ہے اسے جانے دیجئے۔ یہ اس فرانس کو کہا جارہا تھا جسے کئی بار دھمکی دی گئی تھی کہ اگر اس نے معاہدات پیرس کی توثیق کردی تو اس سے معاہدہ دوستی منقطع کردیا جائیگا۔ چنانچہ بعد میں یہ معاہدہ منسوخ کردیا گیا تھا۔ روس نے یہ پینترا اس لئے بدلا ہے کہ اب دھمکیوں سے کام نہیں چل سکتا۔ اب وہ ایک ایک ملک کو علیحدہ علیحدہ مل کر اپنی امن پسندی اور دوستی کا یقین دلاکر اور غیر جانبداری کے حق میں فضا سازگار کررہا ہے۔ کوئی عجب نہیں کہ اس کے امن کا نشانہ ترکی بھی بن جائے۔ یوگوسلاویہ کے مارشل ٹیٹو پر ڈورے ڈالنے کے بعد روسی قائدین کی نظریں یونان اور ترکی پر پڑ رہی ہیں۔ ترکی اور یونان ناٹو کے ارکان ہیں اور ترکی، یونان اور یوگوسلاویہ بلقانی معاہدے میں شریک ہیں۔ روس ہر دو معاہدات کو معطل کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اس سلسلہ کی اہم کڑی پنڈت نہرو کا سفر ماسکو ہے۔ پنڈت نہرو کو یوں تو روس نے ایک عرصے سے مدعو کر رکھا تھا لیکن وہ ایسے وقت ماسکو پہنچے ہیں جبکہ روس کی پالیسی میں قابل ذکر تبدیلی آچکی ہے اور اس کے قائدین برسوں کے راندۂ درگاہ مارشل ٹیٹو کے پاس جانے میں کچھ عار محسوس نہیں کرتے

اگر وہ بلگریڈ جانے کی زحمت اور ایک حد تک ذلت گوارا کرسکتے ہیں تو ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت نہرو کی آؤ بھگت کرنے میں انھیں کوئی باک نہیں ہونا چاہئے۔ چنانچہ اخباری اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اس سلسلہ میں روائتی بخل سے کام نہیں لیا۔ ایک دعوت میں تو وزیر اعظم روس، مارشل بلگانن نے یہاں تک کہدیا کہ ہندوستان ایشیا کی تین بڑی طاقتوں میں سے ایک ہے اور یہ طاقتیں (یعنی روس، چین اور ہندوستان) دفاعی تنظیم میں منسلک ہوسکتی ہیں۔ (اس اعلان کے مضمرات پر لمعات میں روشنی ڈالی گئی ہے)

بین الاقوامی توجہات کا مرکز سان فرانسسکو بنتا جارہا ہے جہاں ۲۰ سے ۲۶ر جون تک اقوام متحدہ کی دسویں سالگرہ کی تقریب منائی جارہی ہے۔ چونکہ اس موقع پر اقوام متحدہ کے ۶۰ ارکان کے وزرائے خارجہ موجود ہوں گے، اس لئے اہم طالب اور تبادلۂ خیالات کا موقع ہوگا۔ اس کا فوری نتیجہ تو شاید کچھ نہ نکلے لیکن اس سے دولت عظمیٰ کی وہ کانفرنسیں ضرور متاثر ہوں گی جو اس تقریب کے بعد منعقد ہو رہی ہیں۔

بزم طلوع اسلام

مردان بزم طلوع اسلام مردان کا ذکر ان کالموں میں ایک سے زیادہ مرتبہ آچکا ہے۔ یہ بزم بڑی فعال جماعت ہے اور اس نے اپنی سرگرمیوں کو کافی وسیع کرلیا ہے۔ ذیل میں عبدالحکیم صاحب ترجمان بزم کی ارسال کردہ روئداد کے کچھ اقتباسات دیئے جاتے ہیں جن سے انکی مستعدی اور سرگرمی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

"جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا گیا تھا۔ ہمارا درس قرآن بدستور جاری ہے۔ ۹ بجے سے ۱۰ بجے تک ڈاکٹر ٹی، ایم خان صاحب کے مکان پر درس قرآن ہو رہا ہے۔

ہمیں خوشی حاصل ہوتی ہے کہ ہماری مثال کو پیش نظر رکھتے ہوئے اہل محلہ اور اہل مردان نے جگہ بہ جگہ مساجد میں یا اپنی اپنی قیام گاہوں میں درس قرآن شروع کردیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ مردان میں قرآن کی آواز گونج اٹھی ہے اور امید ہے کہ اہل مردان اپنی دنیا اور آخرت کو خوشگوار بنالیں گے۔ اگرچہ ان پاک محفلوں میں بعض وقت ہماری مخالفت بھی ہوتی ہے لیکن ہمیں

مخالفت کا اتنا افسوس نہیں جتنی خوشی درس قرآن کی ہو ہم اس میں ہر ایک مسلمان بھائی کو دعوت دیتے ہیں کہ درس میں شمولیت کر کے قرآن کی آواز کو زیادہ سے زیادہ مسلمان بھائیوں تک پہنچائے۔

۱۰ر جون کو ہمارا ماہانہ اجتماع ڈاکٹر پی، ایم خانصاحب کے ہاں منعقد ہوا۔ اس میں دیگر باتوں کے علاوہ ایجنڈے پر مندرجہ ذیل کارروائی تھی۔ "طلوع اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ موجودہ غیر اسلامی و غیر قرآنی معاشرہ کو اسلامی اور قرآنی معاشرہ بنانے کے لئے معرض وجود میں آیا ہے۔ گذشتہ چھ سات برس سے طلوع اسلام یہی دعوت اہل فکر حضرات کو دیتا رہا ہے۔ ہم بزم کے رفقا بھی اس پیغام کو مخاطب بنا کر اتنے لمبے عرصے تک اس پہ غور و فکر کرتے رہے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ غور و فکر سے آگے بڑھیں اور عملاً قرآنی معاشرہ کا سنگ بنیاد رکھیں عملاً قرآنی معاشرہ کی ابتدا کس طرح کی جائے؟ اس اجلاس میں اس پر غور و خوض ہوگا۔"

اجلاس میں اس پر غور و خوض کیا گیا مگر حتمی فیصلہ نہ ہو سکا مزید غور و خوض آئندہ مہینے کے اجلاس میں ہوگا؟

اسی اجلاس میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ ہر مہینہ کی ۱۰ تاریخ کو ڈاکٹر صاحب کے ہاں بزم کا اجتماع ہوا کریگا۔ تمام رفقا کو بڑی سختی سے تاکید کی گئی کہ اس وقت سب کام کاج چھوڑ کر بزم میں شریک ہونے کے لئے حاضری دیا کریں۔

عنکہ موجودہ شدید مخالفت پر بحث کی گئی مگر یہی فیصلہ کیا گیا کہ مخالفت کے بغیر کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے مخالفت جتنی شدت سے ہوگی اسی مناسبت سے کامیابی اور کامرانی یقینی ہے۔ یہ بالاتفاق طے پایا کہ احسن طریق سے مخالفین کو سمجھانا ضروری ہے۔

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ھیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ھے۔ ظاھر ھے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ھوگا اسی قدر قرانی فکر عام ھوگا اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ھے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یکمشت یا دس روپے* کی ماھانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تا آنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ھوجائے۔ اس طرح — — —

- آپ کی پیشگی رقم سے ھمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ھوئے تو اب شامل ھوجائیے۔

* پہلے ماھانہ قسط کی رقم کم سے کم پچیس روپے تھی لیکن اب متعدد قارئین کے اصرار پر اسے بدل کر دس روپے کر دیا گیا ھے۔ جو احباب دس روپے سے زیادہ قسطیں دینا چاھیں وہ دے سکتے ھیں۔

معاملہ کی ضروری باتیں

- طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ھے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ھی برتاؤ کریگا۔
- حساب میں بعض اوقات غلطی ھوسکتی ھے۔ ایسی غلطی باھمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے۔
- رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
- مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے۔
- پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ھفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ھفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ ۔ کراچی ۔ ۳

افراد

الگ الگ رهیں گے تو هر فرد کی عقل اپنے مفاد کیلئے کوشاں رهیگی

اس کا نتیجه

مفاد کا تصادم فلهذه مستقل فساد هے۔

اس تصادم مفاد کا حل

یه هے که تمام افراد کی ضروریات زندگی کی فراهمی کی ذمه داری

معاشره پر هو - اس طرح تمام افراد معاشره

ایک گهرانے کے فرد

بن جائیں گے۔

قرآن ایسے هی معاشرے کا تصور پیش کرتا هے۔

اس کا واضح نقشه

☆ نظام ربوبیت ☆

(از - پرویز)

میں ملیگا۔

قسم اول: کاغذ سفید کرنافلی جلد مضبوط مع گردپوش - چهه روپے

قسم دوم: کاغذ میکانیکل صرف گرد پوش کے ساتھ - چار روپے

ناظم اداره طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۲۳۱۳ - کراچی-۳

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Jawed Press, McLeod Road, Karachi. Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1 Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi.
Editor: KHURSHID ALAM

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار طلوعِ اسلام کراچی

جلد نمبر ۸ شمارہ ۲۱ | کراچی: ہفتہ - ۲۵ - جون ۱۹۵۵ء | قیمت چار آنہ سالانہ دس روپے

قرآن نے کیا کہا؟

یہ لوگ جو اپنے فرقوں کو نہیں چھوڑنا چاہتے وہ قرآن کیطرف دعوت دینے والے کے جانی دشمن بن جاتے ہیں - وہ قرآن سے خود بھی اعراض برتتے اور پہلوتہی کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کے قریب آنے سے روکتے ہیں - وهم ینهون عنه و ینئون عنه (۶/۲۶) وہ لوگوں کو اس سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے پہلوتہی کرتے اور دور دور رہتے ہیں - یہ لوگ قرآن سے علانیہ انکار تو نہیں کر سکتے اس لئے وہ چاہتے یہ ہیں کہ قرآنی تعلیم میں کچھ ایسا تغیر و تبدل کردیا جائے جس سے وہ تعلیم ان کے فرقے کے مسلک کے مطابق بن جائے - اور اگر اس قسم کے رد و بدل کی گنجائش نہ ہو تو پھر یہ عقیدہ پیدا کرلیا جائے کہ وحی ساری قرآن ہی کے اندر نہیں - اس قرآن کے علاوہ اور بھی وحی ہے جو اسی کی مثل ہے - واذا تتلیٰ علیهم آیاتنا بینٰت - قال الذین لا یرجون لقائنا ائت بقرآن غیر هذا او بدله (۱۰/۱۵) جب ان لوگوں کے سامنے ہماری واضح آیات قرآنی پیش کی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو نہیں چاہتے کہ ہمارا قانون ان کے سامنے آئے کہتے ہیں کہ تم اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن پیش کرو - یا اس میں تغیر و تبدل کردو - قل ما یکون لی ان ابدله من تلقائی نفسی - اے رسول تم ان سے کہدو کہ میری کیا طاقت ہے کہ میں اس میں اپنی طرف سے رد و بدل کردوں - ان اتبع الا ما یوحی الی (۱۰/۱۵) - میں تو صرف اسکی اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے -

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ....

1. تنہا انسانی عقل، زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔
2. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔
3. حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہو گی صحیح ہو گی جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔
4. حضور نبی اکرمؐ انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن عجمی سازشوں نے ہماری تاریخ میں ایسی چیزیں شامل کر دی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضورؐ کی سیرت کو پرکھنے کا معیار خود قرآن کریم ہے۔
5. قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔
6. اس عالمگیر نظامِ زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انہیں قانونِ شریعت کہا جاتا ہے)۔ یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔
7. اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اسے ربوبیتِ عامہ یعنی تمام نوعِ انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
8. ربوبیتِ عامہ کے مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے (قرآن کی رو سے) ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے "قرآنی نظامِ ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ....

پہلے پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں قرآنی نظامِ ربوبیت نافذ ہو جائے جس سے صفاتِ خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی ذاتی صلاحیتیں کامل نشوونما پا سکیں اور اس طرح "زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"۔

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ اسلامی نظام ★ امریکی امداد ★ انڈیا آفس لائبریری ★ عورت کا قرآن ★ اسلام کی سرگزشت
★ تاریخی شواہد ★ مجلس اقبال ★ گوآ ★ اندرون ہند
★ حقائق و عبر ★ عالم اسلامی ★ بین الاقوامی جائزہ ★ بزم طلوع اسلام

سلیم کے نام خطوط

سلیم جدید تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کا نمائندہ ہے۔ اس کے نام خطوط میں ان شکوک و شبہات کا ازالہ کیا گیا ہے جو زمانے کے تقاضوں کے ہاتھوں ان کے دل میں لامحالہ پیدا ہوتے ہیں۔

صفحات ۸۰۳ قیمت چھ روپے

اسبابِ زوالِ امت

قیمت -/۸/۱ روپیہ

ابلیس و آدم

کیا انسان موجودہ شکل میں اچانک پیدا ہو گیا؟ یا اس کی تخلیق ایک مسلسل عمل ارتقاء کا نتیجہ ہے؟ سلسلہ ارتقاء کیا ہے؟ مغرب کے مادہ پرست کیا نظریہ رکھتے ہیں؟ اور قرآن کیا تصور دیتا ہے؟

اس کی تفصیل "ابلیس و آدم" میں ملاحظہ کیجئے۔

ضخامت ۳۷۶ قیمت آٹھ روپے

فردوس گم گشتہ

پرویز صاحب کے گراں بہا مقالات اور تقاریر کا مجموعہ جس سے قرآنی حقائق کے مختلف گوشے یک وقت سامنے آجاتے ہیں۔

صفحات ۳۱۶ قیمت چھ روپے

اسلامی نظام

قیمت -/-/۲ روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ - کراچی ۳

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ہفت روزہ

طلوع اسلام

جلد ۸ | ۲۵ جون ۱۹۵۵ء | نمبر ۲۱

اسلامی نظام

(۲)

سابقہ اشاعت میں اس حقیقت کو سامنے لایا گیا تھا کہ ہمارے ہاں اسلامی نظام کا مطالبہ تو عام ہے۔ لیکن اس کا کوئی متعین تصور کسی کے ذہن میں نہیں اور اس کے مآخذ وبانی کے متعلق مختلف فرقوں اور پارٹیوں کا باہمی اتفاق نہیں۔ نہ ہی ایسا اتفاق ممکن ہے۔ یہ واضح ہے کہ جب آپ کسی مملکت کا آئین مرتب کرتے ہیں۔ اور اس آئین کی بنیاد کتاب و سنت قرار دیتے ہیں۔ تو یہ ضروری ہے کہ ان دونوں چیزوں (کتاب اور سنت) کے متعلق یقینی اور متعین طور پر معلوم ہو (اور آئین میں اس کی صراحت کی جائے) کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور سنت کیا ہے اور وہ کہاں ملیگی؟ سنت کے متعلق ہم بتا چکے ہیں (اور آپ ذاتی طور پر اس کی خود تحقیق کرکے دیکھ لیجئے) کہ

(۱) اس کا کوئی متعین مفہوم ایسا نہیں جو تمام ملت پاکستان کے نزدیک متفق علیہ ہو۔

(۲) ایسی کوئی کتاب نہیں جس کے متعلق سب کو تسلیم ہو کہ اس میں جو کچھ درج ہے سب کا سب حتمی اور یقینی طور پر سنت رسول اللہ ہے۔

(۳) سنت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ رسول اللہ کا ثابت شدہ طریقہ ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو طریقہ کسی ایک جماعت کے نزدیک ثابت شدہ ہے دوسری جماعت اس سے اختلاف کرتی ہے۔ جہاں تک کسی کتاب کا تعلق ہے۔ جس میں حضورؐ کا یہ ثابت شدہ طریق موجود ہو۔ تو کتب احادیث میں امام بخاریؒ کے مجموعہ کو سب سے زیادہ صحیح تسلیم کیا جاتا ہے لیکن خود اس مجموعہ کے متعلق بھی (اور تو اور) جماعت اسلامی کا عقیدہ یہ ہے کہ انہیں حق حاصل ہے کہ اس کی ایک ایک حدیث کو پرکھا جائے۔ نیز یہ کہ جو روایت کسی ایک شخص کے نزدیک صحیح ہے اسے کوئی حق نہیں کہ وہ دوسرے شخص کو مجبور کرے کہ اسے صحیح تسلیم کرے۔

سنت کے متعلق جو کچھ ہم نے اوپر لکھا ہے۔ وہ ایک واقعہ کا بیان ہے، سمجھنے کی بات یہ ہے کہ کیا سنت کے متعلق اس وقت پوزیشن یہی ہے یا نہیں۔ اگر پوزیشن یہی ہے تو اس کا اظہار نہ انکار سنت ہے نہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) توہین رسالت یہ تو ہوا آئین کی بنیاد کے دو عناصر میں سے ایک عنصر (سنت) کے متعلق۔ اب دوسرا عنصر لیجئے۔ یعنی کتاب۔ جہاں تک کتاب (قرآن کریم) کا تعلق ہے آپ دنیا کے کسی مسلمان سے پوچھئے وہ بتادے گا کہ قرآن کریم کس کتاب کا نام ہے۔ دنیا میں قرآن کریم کے کروڑوں نسخے رائج ہیں۔ ان میں (بجز کسی کاتب کی غلطی کے) کہیں ایک حرف کا اختلاف بھی دکھائی نہیں دے گا۔ مسلمانوں کے جتنے فرقے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں۔ جسے قرآن کے کتاب اللہ ہونے میں شک و شبہ ہو (شیعہ فرقہ کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ اس کی صحت میں شبہ کرتے ہیں۔ لیکن ان کے بڑے بڑے مجتہدین کے اقوال موجود ہیں کہ یہ غلط ہے۔ ان کے نزدیک قرآن کریم غیر محرف کتاب ہے) یعنی کتاب اللہ تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ اس لئے جب ہم آئین مملکت کے متعلق کہیں گے کہ اس کی بنیاد کتاب اللہ پر ہے تو اس کا ایک متعین مفہوم سامنے آجائے گا۔ جس میں کسی ابہام اور شبہ کی گنجائش نہیں ہوگی۔ یہ کہدیا جائے گا کہ جس طرح سنت رسول اللہ کی تعبیر میں مختلف فرقوں کو اختلاف ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کی تعبیر میں بھی اختلاف ہے۔ لہٰذا جو دشواری سنت کو آئین کی بنیاد قرار دینے میں بیان کی گئی ہے۔ وہی دشواری قرآن کے متعلق بھی ہے۔ لیکن ہم اس وقت "تعبیر" کے متعلق گفتگو نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ متن (TEXT) کے متعلق بات کر رہے ہیں۔ جب ہم حدیث کے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو سب سے پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ یہ حدیث رسول اللہ کی ہے بھی یا نہیں؟ جسے اس سے اختلاف ہوتا ہے وہ کہتا ہے کہ یہ رسول اللہ کا قول نہیں ہو سکتا۔ دوسرا فریق ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے لیکن قرآن کی کسی آیت کے متعلق یہ بحث کبھی نہیں چھڑتی کہ یہ خدا کا ارشاد ہے یا نہیں، اس کی ہر آیت اور آیت کا ہر لفظ ارشاد خداوندی ہوتا ہے۔ اور اسے ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔

نیز کسی حدیث کے متعلق اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ارشاد نبوی ہی ہے۔ تو اس کے بعد یہ سوال سامنے آجاتا ہے کہ حضورؐ کا یہ ارشاد یا عمل بہ حیثیت رسول کے تھا یا آپ نے ذاتی طور پر ایسا فرمایا یا کیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو حضورؐ کے کسی قول اور عمل میں اس قسم کی تفریق نہیں کرتے لیکن امت میں وہ گروہ بھی تو ہیں جو اس تقسیم و تفریق کو بنیادی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ محترم مودودی صاحب نے تو یہاں تک کہدیا ہے کہ جو بات حضورؐ نے ذاتی حیثیت سے کی ہو، اسے سنت رسول اللہ قرار دینا، دین میں تحریف ہے۔ اس کے برعکس قرآن کی کسی آیت کے متعلق یہ سوال پیدا نہیں ہو سکتا کہ اس کی حیثیت "ذاتی" ہے یا دینی" اس کی ہر آیت کی حیثیت دینی ہے۔

قرآن اور حدیث (یعنی کتاب اور سنت) کا یہ فرق ایسا واضح ہے جس کے لئے کسی تفصیلی گفتگو کی ضرورت نظر ہی نہیں آتی۔ یعنی

(۱) قرآن کریم کی ہر آیت کے متعلق تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ وہ خدا کا ارشاد ہے۔ اور اس کی حیثیت دینی ہے۔ لیکن

(۲) ہر حدیث کے متعلق یہ صورت نہیں کہ وہ تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ طور پر ارشاد رسول اللہ ہو۔ یا اس کی حیثیت ہر مسلمان کے نزدیک دینی ہو۔

ان تصریحات کی روشنی میں ہمارا خیال ہے کہ آپ ہم سے متفق ہوں گے کہ) اگر آئین پاکستان کے متعلق یہ کہا جائے کہ اس کی بنیاد کتاب اللہ پر ہوگی تو اس کا مفہوم بھی متعین ہوگا اور یہ صورت تمام امت کے نزدیک متفق علیہ بھی ہوگی۔

اب آتا ہے تعبیر کا سوال۔ سو اس کے متعلق اس وقت صورت یہ ہے کہ

(۱) اہل حدیث حضرات قرآن کی تعبیر احادیث کی رو سے کرتے ہیں۔

(۲) اہل فقہ، قرآن کا مفہوم فقہ کی رُو سے متعین کرتے ہیں۔

(۳) جماعت اسلامی کے نزدیک دین کے ہر معاملہ میں سند ان کے امیر مودودی صاحب ہیں۔

چنانچہ جب وہ جہاد کشمیر کے سلسلہ میں قید ہوئے ہیں تو اس جماعت کے قیم محترم طفیل محمد صاحب نے ان کے متعلق لکھا تھا کہ

مولانا اس زمانہ میں اسلام کی ایک مانی ہوئی ہستی تھے۔ اور اسلام کے ہر مسئلہ میں سند تھے اور سند ہیں۔

(قاصد؛ کشمیر نمبر۔ بحوالہ الفرقان۔ بابت مئی۔ جون ۱۹۵۵ء۔ صفحہ ۹۱)

ہمارے نزدیک یہ ترتیب الٹی ہے۔ صحیح ترتیب یہ ہونی چاہیئے کہ احادیث، فقہ یا اشخاص کے اقوال و آراء کی تعبیر قرآن کی روشنی میں کی جائے۔ یعنی انہیں قرآن کے تابع رکھا جائے

قرآن کو ان کے تابع نہ رکھا جائے۔ اگر اس ترتیب یعنی

قرآن

حدیث

فقہ

کو سامنے رکھ لیا جائے۔ تو پھر قرآن کی تعبیر میں زیادہ اختلاف کی گنجائش نہیں رہتی۔ قرآن کا متن ہر ایک کے نزدیک متفق علیہ ہوگا۔ اس لئے ہر وہ چیز جو اس کے خلاف جائے گی، اسے چھوڑ دیا جائے گا۔

اب رہی یہ صورت کہ جن امور کے متعلق قرآن نے صرف اصولی احکام دیئے ہیں۔ اور ان کی جزئیات متعین نہیں کیں تو ان کے متعلق ان جزئیات کو سامنے رکھ لیا جائے گا۔ جو اس سے پہلے (احادیث اور فقہ کی رُو سے) متعین ہوئی تھیں۔ اگر ہمارے زمانہ کے ضروریات اور حالات کے مطابق ان میں کسی رد و بدل کی ضرورت نہ ہوگی تو انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے گا۔ اگر کسی میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت ہوگی تو باہمی مشاورت سے ایسا کر لیا جائے گا۔ جہاں تک فقہ کا تعلق ہے یہ حضرات (بجز کچھ متشدد قسم کے لوگوں کے) اس قسم کے اجتہادی تغیرات کو ناجائز قرار نہیں دیتے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے۔ خود کتب احادیث و آثار میں اس قسم کے متعدد واقعات ملتے ہیں۔ جن میں (مثلاً) حضرت عمرؓ نے رسول اللہ اور خلیفہ اول کے زمانہ کے فیصلوں میں بہ اقتضائے حالات تبدیلی کر دی تھی۔ ان نظائر کی روشنی میں ملت کا قرآنی نظام جو علیٰ منہاج نبوت قائم ہو وہ اس کا مجاز قرار پاتا ہے کہ اگر اس کے زمانہ کے حالات اس کے متقاضی ہوں تو وہ سابقہ فیصلوں میں مناسب تبدیلی کر دے۔

ہمارے نزدیک پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کی یہی صورت ہے۔ اگر اس پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھ لیا گیا تو اس مملکت میں اسلامی نظام کے قیام میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ لیکن اگر قوم کو سطحی جذبات میں الجھا دیا گیا (جیسا کہ اس وقت تک ہوتا رہا ہے) تو آپ دیکھیں گے کہ آئین میں "کتاب و سنت" کے الفاظ لکھ دینے کے باوجود یہاں اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکیگا۔ ہوگا صرف یہ کہ ہر فرقہ کے شخصی معاملات جسے (PERSONAL LAW) کہا جاتا ہے) اس فرقہ کی فقہ کی رو سے طے کرائے جائیں گے۔ اور امور سلطنت اپنے طور پر سرانجام پاتے رہیں گے (جس طرح انگریزوں کے زمانہ میں ہوتا تھا۔ اور اب تک ہو رہا ہے)

یہاں سے یہ اہم سوال بھی سامنے آتا ہے کہ اسلامی نظام سے مقصود کیا ہے؟ کیا اس سے یہی مقصود ہے کہ شخصی معاملات (نکاح، طلاق وغیرہ) میں اسلامی احکام (فقہ) کی رو سے فیصلے ہوتے جائیں؟ آپ دیکھیں گے کہ ہمارے ارباب مذہب کے ذہن میں اسلامی نظام سے کم و بیش مراد یہی ہے کہ اس میں ان معاملات کے فیصلے شریعت کے مطابق ہوتے ہیں۔ اور جرائم کی شرعی سزائیں دی جاتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک معاشرہ میں شخصی معاملات کو بھی کافی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ ان سے بھی کم درجہ کی جزئیات بھی اہم ہوتی ہیں جیسے (مثلاً) اس وقت ہمارے ہاں "بائیں ہاتھ چلو" کے حکم کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی نظام سے صرف اتنا ہی مقصود ہے؟ کیا اس سے ہمارے معاشرہ میں اس سے زیادہ کوئی تبدیلی نہیں ہوگی؟ اگر اس سے ہمارے معاشرہ میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اور اس کے اثر و نفوذ کا دائرہ عدالتوں کی چار دیواری تک ہی محدود رہے گا۔ تو یہ کوئی ایسی اہم تبدیلی نہیں۔ یہ تو خود ہمارے اس دعوے کی تکذیب ہے کہ اسلام ہماری زندگی کے ہر گوشے اور ہر زاویہ میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ اور تمام مسائل حیات کے لئے بے مثل و بے نظیر ضابطہ عطا کرتا ہے۔ اسے یقیناً ایسا کرنا چاہیئے۔ اور اسلامی نظام ایسا کرتا ہے، وہ ہماری زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہوتا ہے۔

اس حقیقت کی روشنی میں یہ دیکھئے کہ اس حیات ارضی میں ہماری زندگی کا سب سے اہم شعبہ کونسا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ شعبہ ہماری معاشی زندگی کا ہے۔ اگر آپ کسی معاشرہ کی خرابیوں کا تجزیہ کریں گے تو اس کا کم از کم نوّے فیصدی حصہ معاشیات ہی سے متعلق یا متاثر نظر آئے گا۔ کچھ خرابیاں وہ ہوں گی جو افلاس سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور کچھ وہ جو دولت کی زیادتی سے ظہور میں آتی ہیں۔ اس تفصیل کو اگر ہم چند الفاظ میں سمٹانا چاہیں تو یہ کہا جائے گا کہ معاشرہ کی بیشتر خرابیوں کا باعث دولت کی غلط تقسیم ہے۔ اور اسلامی نظام اس غلط تقسیم کو مٹا کر معاشرہ کو صحیح خطوط پر لاتا ہے۔ بس معاشرہ کی بنیاد "رب العالمین" کے ابدی اصول پر ہوتی ہے یعنی نوع انسانی کی عالمگیر ربوبیت، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا، اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشو و نما کے لئے اسباب و وسائل بہم پہنچانا اس نظام کی اولین ذمہ داری ہوتی ہے۔ اگر کسی نظام میں ایک فرد معاشرہ بھی اپنی ضروریات سے محروم رہ جاتا ہے۔ اور اسے اپنی صلاحیتوں کی نشو و نما کے لئے سامان میسر نہ آسکے۔ تو وہ نظام اسلامی نہیں کہلا سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ نظام اس قدر اہم، وسیع اور عالمگیر ذمہ داریوں سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتا ہے کہ وسائل رزق افراد کی ملکیت کی بجائے نظام کی تحویل میں ہوں۔ اور نظام ان کا قرآنی خطوط کی روشنی میں استعمال کرے اس طرح اس نظام میں دولت کی غلط تقسیم کی رُو سے پیدا شدہ خرابیوں کا ازالہ ہی نہیں استیصال ہو جاتا ہے۔ باقی خرابیوں کا بیشتر حصہ جنسیات سے متعلق ہوتا ہے۔ اس کے لئے وہ صحیح تعلیم و تربیت سے ایسا ماحول اور ایسی فضا پیدا کر دیتا ہے جس میں کوئی نگاہ اپنی حد سے آگے نہیں بڑھنے پاتی۔ اور قلب و نظر کی بیباکیاں پابند نشیمن ہو جاتی ہیں۔

کیا آپ چاہتے ہیں کہ پاکستان میں ایسا اسلامی نظام رائج ہو جائے؟ اگر آپ چاہتے ہیں تو سوچئے کہ اب جب کہ آئین پاکستان کی ازسرِ نو تدوین کا مرحلہ درپیش ہے آپ پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور آپ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کیا کر رہے ہیں؟ آپ اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دے کر نہ بیٹھ جائیں۔ اس لئے کہ یہ معاملہ بڑا اہم ہے۔ اور اس کا تعلق آپ سے آگے بڑھ کر آپ کی آنیوالی نسلوں بلکہ پوری نوع انسانی سے ہے۔

سیاست کے کھیل

مغرب کی مکیاولی سیاست (جس کا چلن آج ہر بازار میں ہے) کا مدار اس "اصول" پر ہے کہ مقصد پیش نظر ہمیشہ اپنا فائدہ ہونا چاہیئے۔ اور اس کے حصول کے لئے (جائز و ناجائز) سب کچھ کرنا چاہیئے۔ جس شخص (یا قوم) کی راہ میں اصول پرستی کا خیال تک بھی حائل ہو سکتا ہے۔ اسے اس میدان میں قطعاً قدم نہیں رکھنا چاہیئے۔ "جائز وہ جس سے اپنا مقصد حاصل ہو جائے۔ ناجائز وہ جس سے وہ مقصد حاصل نہ ہو سکے"۔ مغرب میں بالعموم یہ مقصد قومی ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ مقصد بھی انفرادی مفاد ہوتا ہے۔ ہر بطل سیاست کی زبان پر اسلام، قوم، وطن کی بہبودی کا نام اور دل میں اپنے مفاد کے حصول کا جذبہ۔ اس کی تمام تگ و دو کا رخ اسی قبلۂ مقصود کی طرف اور اس کی ہر نقل و حرکت اسی محور کے گرد۔

آجکل مجوزہ مجلس آئین ساز کی تشکیل نو اپنے آخری مراحل میں سے گذر رہی ہے (جس وقت یہ پرچہ قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے گا۔ انتخاب کے نتائج بھی سامنے آچکے ہوں گے۔ لیکن جس وقت یہ سطور سپرد قلم ہو رہی ہیں اس وقت ابھی انتخاب میں تین دن باقی ہیں) یہ ایک ایسی مجلس کے اراکین کا انتخاب ہے جس نے ملک کے لئے آئین مرتب کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اصول پرستی کی رُو سے اس مجلس کے لئے ایسے اراکین کا انتخاب ہونا چاہیئے جو ترتیب آئین کے اہل ہوں۔ لیکن حرام جو ہمارے ارباب سیاست میں سے کسی کے پیش نظر بھی یہ مقصد ہو۔ ان میں سے ہر ایک کی دوڑ دھوپ اس مقصد کے لئے ہے کہ وہ خود اس اسمبلی کے لئے منتخب ہو جائے اور (جب اس کا اطمینان ہو جائے تو) اسکی پارٹی اکثریت میں آجائے۔ چونکہ (بدقسمتی سے) اس اسمبلی نے مجلس مقننہ کے فرائض بھی سرانجام دینے ہیں۔ اور حکومت اس پارٹی کی بنا کرتی ہے جس کی مقننہ میں اکثریت ہو، اس لئے اسمبلی میں اپنی اپنی پارٹی کو محکم بنانے کا خیال دیوانگی کی حد تک پہنچ رہا ہے۔ اور اس کے لئے وہ کچھ کیا جا رہا ہے جس کے تصور سے روح دیانت کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ اسی مقصد کے لئے ہمارے وزیر اعظم مسٹر محمد علی نے مشرقی پاکستان کی حکومت فضل الحق صاحب کے سپرد کر دی۔ وہی فضل الحق صاحب جنہیں انہی محمد علی صاحب نے سال گذشتہ پاکستان کا غدار قرار دیا تھا۔ ادھر سے اطمینان کے بعد انہوں نے اپنے لئے مسلم لیگ کی طرف سے ٹکٹ لے لیا۔ اور اس طرح مطمئن ہو گئے کہ بنگال کی دو پارٹیاں ان کے ساتھ ہوں گی لیکن ان کے اس اطمینان کا سانس ابھی پھیپھڑے تک بھی پہنچنے نہ پایا تھا کہ معلوم ہوا کہ مسلم لیگ کی نشست کے لئے فضل الرحمٰن صاحب مقابلہ کر رہے ہیں (یاد رہے بحیثیت خواجہ ناظم الدین وزارت کے کامرس منسٹر فضل الرحمٰن صاحب) یعنی آل پاکستان مسلم لیگ کے صدر اعظم کی خود اپنی پارٹی میں یہ پوزیشن ہے کہ وہ انہیں بھی ٹکٹ دیتی ہے۔ اور ان کے مقابلہ میں ایک دوسرا امیدوار بھی کھڑا کر دیتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس ناگہانی آفت نے قصر وزارت عظمیٰ کے در و دیوار کو ہلا دیا۔ اور محترم محمد علی صاحب اڑ کر کراچی سے ڈھاکہ جا پہنچے۔ (اس دن عید اور ہفتہ کی درمیانی شب کو، پاکستان انٹرنیشنل

کے جہاز کے ڈھاکہ جانے کی باری نہیں تھی۔ اس لئے وہ ایک اور کمپنی کے جہاز میں کلکتہ تک گئے۔ اور کلکتہ سے جہاز تبدیل کر کے ڈھاکہ پہنچے) اب دیکھئے کہ فضل الرحمن صاحب کا کیا حشر ہوتا ہے۔

لیکن ادھر سے مطمئن ہو جانے کے بعد بھی ہمارے محترم وزیر اعظم صاحب کے نصیب میں اطمینان نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ یہ خبر بھی فضا میں گشت لگا رہی ہے کہ مسٹر فضل الحق صاحب خود وزیر اعظم بننے کی فکر میں ہیں۔ چنانچہ وہ مجلس آئین ساز کی رکنیت کے لئے امیدوار ہیں ان کا انتخاب یقینی ہے۔ اس انتخاب کے بعد وہ مشرقی پاکستان کے سب سے بڑے گروپ کے قائد ہوں گے ظاہر ہے کہ مشرقی پاکستان کے ہندو بھی انکے ساتھ ہوں گے اگر مغربی پاکستان کا تھوڑا سا حصہ بھی انھوں نے اپنے ساتھ ملا لیا تو ان کا وزیر اعظم بن جانا دھرا رکھا ہے۔

کس قدر عبرت انگیز ہوگا وہ منظر جب محمد علی صاحب خود اپنے بنائے ہوئے "خداؤں" کے ہاتھوں اپنی موہوم جنت سے اس بری طرح نکالے جائیں گے۔ اور خدائے حقیقی کے قانون مکافاتِ عمل کی بے صوت صدا پکار پکار کر کہہ رہی ہوگی کہ ھذا اجزاء بما کنتم تعملون۔ یہ تمہارے اپنے ہی کئے کا پھل ہے۔ اس لئے ذُق انک انت العزیز الکریم۔ اور روحِ مملکتِ پاکستان سر جھکائے اپنے مقدر پر خون کے آنسو بہا رہی ہوگی۔ اور سسکیاں بھر بھر کر کہہ رہی ہوگی کہ بای ذنب قتلت! میرے ساتھ یہ کس جرم کی پاداش میں ہو رہا ہے!

امریکی امداد

معاصر "ڈان" نے ۸ ؍ جون کی اشاعت میں "امریکہ، پاکستان اور جمہوریت" کے عنوان سے جو مقالہ افتتاحیہ چھاپا ہے وہ بوجوہ قابل مذمت ہے۔ اگر اس نے یہ سب کچھ معتمدانہ طور پر نہیں لکھا تو غایت درجہ کی جہالت کا ثبوت دیا ہے۔ مقالہ پڑھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ معاصر موصوف "امریکہ"، "پاکستان" اور "جمہوریت" میں سے کسی ایک کے مزاج یا روح کو نہیں سمجھ سکا۔ امریکی امداد کی مزعومہ سست رفتاری کو مدار بحث بنا کر مدیر "ڈان" نے سارا زورِ قلم اس پر صرف کیا ہے کہ پاکستان میں جمہوریت کا جنازہ نکل چکا ہے۔ اور اسکا تنِ بے جان میں جان رفتہ لانے کی واحد صورت یہ ہے کہ عنان اقتدار پھر سے اس طائفہ مردودہ کے سپرد کر دی جائے جسے گورنر جنرل نے انتہائی حسنِ تدبیر اور بکمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے معزول و مشلول کر دیا تھا۔ جہاں تک کسی گروہ کی حمایت کا تعلق ہے، معاصر کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی سمجھ اور پسند کے مطابق اپنے ممدوح چنے۔ اس حمایت کے ساتھ اسے مخالف گروہ کی مذمت کا بھی حق حاصل ہے اسے یہ بھی رعایت دی جاسکتی ہے کہ وہ حمایت و مذمت میں ایک حد تک مبالغہ سے کام لے۔ جمہوریت میں کم از کم عہد حاضر کی جمہوریت میں یہ قابل فہم ہے۔ لیکن جمہوریت کا یہ مفہوم کبھی نہیں ہو سکتا کہ مدح و قدح میں ایسا غلو برتا جائے کہ اس سے ملکی مفاد تک خطرہ میں پڑ جائے۔ ہمیں افسوس ہے کہ معاصر نے ایسے ہی غلو سے کام لیا ہے۔ اور ایسا زہریلا اور شر انگیز ایڈیٹوریل لکھا ہے جسے پاکستان کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اور کیا جائے گا۔ تعجب ہے کہ یہ اعتراف کرنے کے باوجود کہ دیگر ممالک کے نمائندے ہمارے ہاں موجود ہیں اور وہ کان لگا کر اور آنکھیں کھول کر بیٹھے ہیں اتنی احتیاط بھی نہیں برتی کہ بلا سوچے سمجھے ایسی بات نہ کہہ دی جائے، جو خلاف واقعہ بھی ہو۔ اور ملک کے خلاف بھی استعمال کی جاسکے۔

اس طویل لیکن بے مغز مقالہ کو دیکھ کر صاف پتہ چلتا ہے کہ مدیر اخبار نے امریکی امداد کو بہانہ بنا کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے بزعم خود یہ ثابت کرنے کے بعد کہ پاکستان میں جمہوریت دم توڑ چکی ہے۔ یہ نتیجہ نکالا ہے کہ امریکہ یہ دیکھ کر ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ اور اس نے امداد کی رفتار مدھم کر دی ہے۔ یہ بیان صریحاً خلاف حقیقت لہٰذہ غلط ہے اول تو یہ مفروضہ بے بنیاد ہے کہ پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ جمہوریت کے منافی ہے۔ جمہوریت کا اصل الاصول یہ ہے کہ ارباب حکومت باقاعدہ منتخب کئے جائیں اور وہ بدلے بھی جاسکیں اگر کوئی فرد یا گروہ منتخب ہونے کے باوجود ناقابل تبدیل ہو جائے تو یہ تقاضائے جمہوریت کے خلاف ہوگا۔ مثلاً سابقہ مجلس دستور ساز نے اپنے آپ کو ناقابل تبدیل بنانا چاہا تھا۔ اگر واقعی ایسا ہو جاتا تو دستور یہ کو محض اس بنا پر جمہوری کہنا غلط ہو جاتا کہ وہ ایک سے زیادہ افراد پر مشتمل ہے یا وہ کسی زمانہ میں منتخب ہو کر آئے تھے۔ اسی طرح ۲۴ ؍ اکتوبر کو گورنر جنرل نے جو اقدام کیا وہ فیڈرل کورٹ کے فیصلے کے مطابق بالکل آئینی تھا۔ اس اقدام کے بعد گورنر جنرل کی طرف سے یہی کوشش ہوتی رہی کہ کسی طرح آئین مرتب ہو جائے اور ملک کو نئے انتخابات کا موقع مل جائے۔ اس عمل کو معاصر موصوف کے ممدوحین نے نتیجہ خیز نہیں ہونے دیا اور اب بھی ان کی مشئوم کوشش یہی ہے کہ اسے معطل یا واژگوں کر دیا جائے۔ گویا نہ مجرد اقدام خلاف جمہوریت ہے اور نہ اس اقدام سے پیدا کیا جانے والا معلوم نتیجہ۔ بعض حلقوں میں انتخابات کی دھاندلی کو مدار بنا کر سرے سے سارے عمل ہی کو غیر جمہوری کہا جا رہا ہے۔ خود "ڈان" اسی غلطی کا شکار ہے۔ یہ استنباط بھی بے بنیاد ہے۔ اگر ایسے لوگ موجود ہیں جو انتخابات کو ذاتی استحکام کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اور شخصی یا حکومتی اثر کو اپنے حق میں استعمال کرتے ہیں تو اس سے جمہوری عمل غلط نہیں قرار دیا جاسکتا۔ بلکہ یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ان حرکات شنیعہ کا تدارک کیسے کیا جائے؟ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ سرے سے جمہوریت کا وجود ہی باقی نہیں۔

جب یہ مفروضہ غلط ہے تو اس پر اٹھائی ہوئی عمارت یقیناً غلط ہوگی۔ لیکن ہمارے معاصر نے یہاں دوسری غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کے خیال میں امریکہ نے پاکستان کو مدد دینے کا فیصلہ محض اس لئے کیا تھا کہ پاکستان جمہوریت کا داعی تھا۔ عالمی سیاست اور امریکی حکمت عملی کا کوئی مبصر اس کی تصدیق نہیں کرے گا۔ آئے روز دیکھا یہ جاتا ہے کہ قوموں کے اتحاد مفادات مشترک کی بنا پر دفاعی نقطہ نظر سے طے پاتے ہیں شاید کسی ایک بھی ایسے اتحاد کا نام نہ لیا جاسکے جو خالصتاً نظریاتی بنا پر معرض وجود میں آیا ہو۔ جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے۔ وہ ایسے ملکوں کو اب بھی مدد دے رہا ہے جہاں جمہوریت کی بجائے فوجی حکومتیں قائم ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں کہ اگر امریکی امداد کی مقدار اور رفتار کم ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں جمہوریت نہیں اور امریکہ محض جمہوریت کی بنا پر دوسرے ممالک کی امداد کرتا ہے۔

امریکی امداد سے متعلق حقیقت حال کیا ہے۔ اس کا پتہ وزیر دفاع جنرل محمد ایوب خاں کے تازہ بیان سے چلتا ہے آپ نے ۱۹ ؍ جون کو غالباً ڈان کے مقالے کے جواب میں بڑے حتم و یقین سے کہا کہ سست رفتاری اور کم مقداری کی معقول وجہ ہے اور اس میں مطلقاً صداقت نہیں کہ سیاسی یا دیگر وجوہ کی بنا پر امریکی جوشِ امداد ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ یہ بیان بڑا بروقت ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اس سے وہ شکوک و شبہات دور ہو جائیں گے جو اس ضمن میں پیدا کر دیئے گئے ہیں، یا ہو گئے ہیں۔ ہم اس موقعہ پر وزیر اعظم کے ایک بیان کا حوالہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آپ نے ۱ ؍ جون کو لاہور میں ایک اخباری نمائندے کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ امریکی امداد سست معلوم ہوتی ہے۔ اور ان کے نزدیک وہ تیز تر ہونی چاہیئے اور ہو سکتی ہے۔ اس مختصر بیان سے ایک ہی اثر مرتب ہو سکتا تھا۔ اور وہی ہوا۔ کہ خود وزیر اعظم کو شکایت ہے کہ امریکہ امداد دینے میں ڈھیل برت رہا ہے۔ اگر وزیر اعظم محتاط بیان دیتے تو کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہوتی اور غیر محتاط اور بد باطن عناصر کو وہ کچھ کہنے کا موقعہ نہ ملتا جو "ڈان" نے کہا۔ پچھلے دنوں وزیر اعظم صاحب نے یہ شکایت کی کہ عام طور پر بھی انھیں ہی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اگر کسی اخبار نے ان پر بلاوجہ تنقید کی ہے تو ہمیں اس کا دلی رنج ہے۔ لیکن کیا یہ مناسب نہیں کہ بیان دینے سے پہلے یہ اچھی طرح سوچ لیا جائے کہ حقیقت کیا ہے اور اسے کس طریق سے ملک کے سامنے پیش کرنا چاہیئے؟ اس سلسلہ میں ذرا سی احتیاط بعد کی بہت سی ناگوار و تلخ بحثوں کی روک تھام کر سکتی ہے؟

انڈیا آفس لائبریری

انڈیا آفس لائبریری کا مسئلہ پچھلے مہینے سے خصوصی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ مئی کے تیسرے ہفتے میں اس سلسلہ میں پاکستان اور ہندوستان کے وزرائے تعلیم کے مابین مذاکرات ہوئے تھے ان مذاکرات میں کیا طے ہوا، اس کے متعلق تفصیل سے کچھ نہیں بتایا گیا۔ ۱۰ ؍ مئی کو جو اعلامیہ دہلی سے شائع ہوا اس میں کہا گیا تھا کہ چونکہ لائبریری دونوں ممالک کی ملکیت ہے اس لئے وہی اسکے مستقبل کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اعلامیہ میں یہ اشارہ بھی موجود تھا کہ بعض امور سے متعلق دونوں وزیروں میں سمجھوتہ ہو گیا ہے لیکن وہ اگست میں مزید گفتگو کریں گے۔

اس کے بعد وزیر تعلیم ہند مولانا ابوالکلام آزاد نے ۲۸ ؍ مئی کو یورپ جاتے ہوئے کراچی میں ایک ملاقات میں کہا کہ تقسیم سے پہلے لائبریری کی مالک حکومت ہند تھی اور تقسیم کے بعد حق ملکیت حکومت ہائے ہندوستان اور پاکستان

کے نام منتقل ہو گیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ پاکستان اور ہندوستان کے مابین اس لائبریری کی تقسیم کا اصول تسلیم کر لیا گیا ہے اور تصاویر وغیرہ جیسے جدید طریقوں کو استعمال کر کے ایسا انتظام کیا جائے گا کہ لائبریری مکمل طور پر دونوں ملک کے کام آ سکے۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ ۱۹۴۹ء میں انھوں نے اس سلسلہ میں برطانیہ کے دولت مشترکہ کے سکریٹری سے بات بھی کر لی تھی۔

دہلی کے اعلامیہ اور مولانا کے بیان سے دو امور واضح ہو جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ انڈیا آفس لائبریری پاکستان اور ہندوستان کی ملکیت ہے اور دوسرے یہ کہ لائبریری کی تقسیم اس طرح سے کی جائے گی کہ دونوں ممالک پوری طرح اس سے استفادہ کر سکیں گے۔ یہاں تک تو بات صاف تھی لیکن اب برطانیہ کے دولت مشترکہ کے سکریٹری نے ۱۳؍جون کو جو بیان پارلیمان میں دیا ہے اس سے صورت حال بدل جاتی ہے انھوں نے غیر مبہم طور پر کہہ دیا ہے کہ برطانوی حکومت لائبریری کو علی حالہ لندن میں رکھنا چاہتی ہے۔ انھوں نے حکومت کے اس خیال ہی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اسے صحیح بھی قرار دیا۔ انھوں نے البتہ اس پر رضامندی کا اظہار کیا کہ اگر اس کے انتظام اور استعمال وغیرہ سے متعلق حکومت ہائے پاکستان اور ہندوستان کوئی تجویز پیش کریں گی تو اس پر مناسب غور کیا جائے گا۔ اس بیان کی صورت یہ ہوتی ہے کہ لائبریری پاکستان اور ہندوستان کی مشترکہ ملکیت نہیں بلکہ برطانیہ کی ملکیت ہے اور وہ اسے اپنے ہاں رکھنے پر مصر ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہندوستان کے اخبارات وغیرہ شد و مد سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ لائبریری کو لندن سے نئی دہلی منتقل کر دیا جائے اور پاکستان کو اس کے استعمال کی آسانیاں دی جائیں۔ گویا پاکستان کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو پہلا مرحلہ تو یہ ہے کہ برطانوی حکومت کو منوایا جائے کہ وہ لائبریری کو لندن سے منتقل ہونے دے اور دوسرے یہ کہ ہندوستان یہ اصرار چھوڑ دے کہ اس کا ذخیرہ سارے کا سارا اس کی تحویل میں رہے۔ یہ دونوں صورتیں ہمارے نزدیک اس لئے قابل قبول نہیں کہ اس طرح لائبریری کی افادیت بمنزلہ صفر کے ہو جاتی ہے۔ پاکستان میں بدقسمتی سے کوئی قابل ذکر لائبریری نہیں۔ محض یہی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ علمی لائبریری کا قیام محال نہیں تو بہت دشوار ضرور ہے۔ اس لئے پاکستان کسی طور اس بے بہا ذخیرے سے محروم نہیں رہ سکتا جو انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔ ان حالات میں لائبریری مذکور کی منصفانہ تقسیم ایک سنگین علمی مسئلہ ہے جسے جلد از جلد طے کرنا چاہئے۔ مذاکرات کی موجودہ رفتار سے ایسے پتہ چلتا ہے کہ حکومت پاکستان اس اہم معاملہ کو پوری توجہ کا مستحق نہیں سمجھ رہی۔ اگر غفلت شعاری کا یہی عالم رہا تو اقبال کے الفاظ میں یہ موتی علم و فن کے اور کتابیں اپنے آبا کی جو ہمارے دلوں کو دائماً سی پارہ بنا دیں گی اور صحیح علمی تحریک کے پیدا ہونے اور فروغ پانے کے امکانات ختم ہو جائیں گے۔ لہٰذا ہم حکومت کو استدعا کرتے ہیں کہ وہ ہوشیاری سے کام لے اور قوم کو صاف صاف بتائے کہ اس سلسلہ میں اب تک کیا کچھ ہو چکا ہے۔ اور آئندہ حصول مقصد کا کیا ذریعہ ہو گا؟

پانی کی تقسیم

ہمارے معاشرے کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس میں ضروریات زندگی کی تقسیم بڑی غیر مساوی اور نامنصفانہ ہے۔ اور تو اور پانی جیسی ضروری شے بھی کسی قاعدے قانون کے مطابق تقسیم نہیں ہوتی حالانکہ ایک مرکزی نظام کے تحت ہونے کی بدولت ایسا کرنا آسان اور قابل عمل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی تقسیم کرنے والے اور جن کیلئے یہ تقسیم کی جاتی ہے، سبھی ان ناہمواریوں کو ایسا ناگزیر سمجھتے ہیں کہ ان کے دور کرنے کی ضرورت کا احساس بھی کم سے کم کیا جاتا ہے۔ کراچی شہر کے پانی کا مسئلہ عجیب و غریب رہا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد اسکی آبادی یک لخت کئی گنا ہو گئی لیکن ذخائر آب کم و بیش وہی رہے۔ گو گذشتہ آٹھ سال میں پانی کی مقدار میں اچھا خاصا اضافہ کیا جا چکا ہے لیکن ابھی مطلوبہ مقدار کا مہیا کرنا دور کی بات ہے۔ ابھی پچھلے دنوں کراچی جائنٹ واٹر بورڈ کے صدر نے یہ اعتراف کیا تھا کہ ۱۹۵۸ء سے پہلے اس مقدار کی توقع عبث ہے۔ ابتک یہ مطلوبہ مقدار کیوں مہیا نہیں ہو سکی یہ بحث تو علیحدہ ہے، لیکن تعجب ہے کہ اب تک یہ بھی نہ سوچا گیا کہ موجودہ ذخیرہ آب کو اس طریق سے استعمال کیا جائے کہ اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اب تک شہر میں صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف ایسے علاقے ہیں جہاں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے پانی چلتا رہتا ہے وہاں دوسری طرف ایسے علاقے بھی ہیں جہاں پانی ملتا ہی نہیں۔ ان محروم آب علاقوں کا دارومدار کارپوریشن کی آبی لاریوں پر ہے۔ لیکن یہ ذریعہ آب رسانی پوری طرح قابل اعتماد ہے نہ اس کی ضرورت ہی پوری ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ایسے علاقوں میں رہنے والوں کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور عصر کے عہد جاہلیت کی طرح پانی پینے پلانے پر جھگڑے آئے روز ہوتے رہتے ہیں۔

ہمارے اب واٹر بورڈ اور کارپوریشن نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ پانی کی تقسیم مساویانہ طریق سے کی جائے اور شہر کے تمام حصوں میں یکساں طور پر آٹھ گھنٹے پانی مہیا کیا جائے۔ اندازہ یہ ہے کہ اس طرح کوئی پندرہ لاکھ گیلن پانی ہر روز بچ جائیگا اور اسے ان علاقوں میں پہنچایا جا سکیگا جہاں پانی کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں۔ یہ تجویز بدیہی طور پر مفید ہے اور ہمیں خوشی ہوگی اگر واٹر بورڈ والے اس کو عمل کر کے کامیاب بنائیں۔ لیکن ہم اس سلسلہ میں یہ گذارش کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ خداوندان آب نے اب تک حسن انتظام کا کوئی ایسا مظاہرہ نہیں کیا جس سے ان سے یہ حسن ظن قائم کیا جا سکے کہ وہ اس منصوبہ کو بطریق احسن قابل عمل بنائیں گے۔ مثلاً کارپوریشن جہاں جہاں گاڑیوں کے ذریعہ پانی پہنچاتی ہے وہاں سے بے تدبیری، بدانتظامی اور فقدان ہمدردی کی شکایات اکثر و بیشتر موصول ہوتی رہتی ہیں۔ خود ارباب بلدیہ نے کئی مرتبہ اعتراف کیا ہے کہ ان کے پاس ایسا انتظام نہیں کہ وہ محروم آب علاقوں میں زیادہ پانی پہنچا سکیں۔ ان حالات میں بجا طور پر یہ خدشہ ہو سکتا ہے کہ جن علاقوں میں اب زیادہ پانی ہے ان کا پانی تو کم ہو جائیگا لیکن جنھیں زیادہ پانی کی ضرورت ہے ان کے لئے اصلاح حال کی خاطر خواہ صورت پیدا نہیں ہوگی۔ اگر ایسا ہے تو ہم بلدیہ اور بورڈ سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنی بدانتظامی سے ان لوگوں کو پریشان نہ کریں جو اتفاق سے ایسے علاقوں میں رہ رہے ہیں جہاں پانی کی مقدار نسبتاً زیادہ ہے۔ لیکن اگر واقعی ان کے پاس ایسا انتظام ہے کہ وہ اس طریق تقسیم سے بچایا ہوا پانی قلت کے علاقوں میں پہنچا سکیں گے تو وہ نہ محض ان علاقوں کو شکور و ممنون بنائیں گے بلکہ ان کی ہمدردی حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے جن کی پانی کی سپلائی کم کر دی جائے گی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو شہر میں بے اطمینانی پھیل جائے گی اور خواہ مخواہ کا ایک فتنہ کھڑا ہو جائے گا۔ ہم اہل شہر سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بلدیہ اور بورڈ کو اس تجربہ کا پورا موقع دیں اور ضرورت سے زائد پانی سے محرومی کو خندہ پیشانی سے برداشت کریں۔ ان کی خفیف سی پابندی تو ضرور ہو گی۔ لیکن انہی کے کم خوش قسمت بلکہ بدقسمت بھائی جو اس وقت پانی کے ایک ایک قطرے کو ترستے رہتے ہیں قدرے اطمینان سے وقت گزار سکیں گے۔

نیکووال

۱۱؍جون کو سرکاری ذرائع سے ہندوستانی اخبارات نے نیکووال کے حادثے سے متعلق جو کچھ شائع کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان پوری ڈھٹائی سے پروپیگنڈہ کے زور سے حقائق کا منہ چڑانے پر تلا ہوا ہے۔ اس میں ساری ذمہ داری پاکستان پر ڈال کر کہا گیا ہے کہ حکومت ہند نے حکومت پاکستان سے ہرجانہ طلب کر رکھا ہے۔ نیکووال میں جو کچھ ہوا، اس کی تفتیش اقوام متحدہ کے مبصروں تک نے کر لی ہے۔ ان کی رپورٹ یہ ہے کہ معاہدہ کے مطابق نیکووال کے علاقے میں ہندوستانی داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے باوجود ایک دن انھوں نے آکر خالی زمین پر ہل چلانا شروع کر دیا۔ نیکووال کے لوگوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک پاکستانی لڑکی ماری گئی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی نہ صرف پاکستانی علاقے میں ناجائز طور پر داخل ہوئے بلکہ ایک پاکستانی لڑکی کو قتل کرنے کے بھی مرتکب ہوئے۔ یہ کچھ ہو چکا تو پاکستانی سرحدی پولیس موقعہ پر پہنچی اور ان کے اور ہندوستانی جاریوں کے درمیان تصادم ہوا جس میں بارہ ہندوستانی کام آئے۔ اور تین پاکستانی شہید ہوئے۔ اقوام متحدہ کے مبصروں کی رپورٹ میں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ پاکستانی سرحدی پولیس نے پہل یا زیادتی کی۔ اس رپورٹ کے باوجود ہندوستان کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ پاکستان نے پہل کی۔ چنانچہ اس بنا پر ہرجانہ کا بھی مطالبہ کیا گیا ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ حکومت پاکستان نے اس قضیہ میں اپنے فرض کو صحیح طریق سے ادا نہیں کیا۔ حادثے کے فوراً بعد جب ہمارے وزیر اعظم دہلی گئے تو پاکستانی نقطۂ نگاہ پیش کرنے کی بجائے آپ نے سوء بیانی اور معذرت خواہانہ انداز میں یہ کہنے میں باک محسوس نہ کیا کہ اگر پاکستانیوں کا جرم ہوا تو وہ انھیں قرار واقعی سزا دیں گے۔ اسے ہندوستانی پریس نے خوب اچھالا اور

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

تاریخی شواہد

(۲۰)

یہ ہے اس قوم عاد کی عبرت انگیز داستان جس کے متعلق کہا کہ جاؤ دیکھو۔ ان کے اجڑے ہوئے مساکن میں تمہارے لئے کون کون سے سامان بصیرت مدفون ہیں۔؟

وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۛ (۲۹/۳۸)

اور (دیکھو، پھر ایسا ہوا کہ تمہارے پروردگار نے) عاد اور ثمود کو ہلاک کیا۔ اور یہ بات (یعنی ان کی تباہی) تمہارے لئے ان کی آبادیوں سے ظاہر ہو گئی ہے۔

جوں جوں زمانہ آگے بڑھ رہا ہے۔ اثری انکشافات ان زمین دوز بستیوں سے نقاب اٹھاتے چلے جا رہے ہیں۔ جن کے نیچے سے مٹی ہوئی عظمتوں اور لٹی ہوئی سلطنتوں کے نقوش یوں نمودار ہو رہے ہیں جیسے کوئی آنکھیں ملتا ہوا نیند سے اٹھ بیٹھے۔ جس قوم کے سینے میں دل اور نگاہوں میں بصیرت ہے۔ اس کے لئے ان ویرانوں کی ٹھیکریاں عروج و زوال امم کی ہزاروں خاموش داستانیں اپنے اندر رکھتی ہیں فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ کیا کوئی ہے جو ان سے عبرت حاصل کرے؟

حضرت ہودؑ کے بعد ترتیب کے لحاظ سے حضرت صالحؑ (قوم ثمود) کا تذکرہ آنا چاہیئے۔ لیکن قرآن کریم نے ان دونوں کے درمیان ایک ایسی ہستی کا ذکر کیا ہے جو اگرچہ حضرات انبیاء کرامؑ کے زمرہ میں شامل نہیں۔ لیکن اس کی تعلیم کو نمایاں حیثیت دی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ہودؑ مع اپنے متبعین کے، اپنی برباد ہونے والی قوم کے دیار و مساکن سے نکل کر حجاز کی جانب آ گئے تھے اور اسی علاقہ میں ان کی نسل (عاد ثانیہ) بڑھی اور پھیلی۔ ان میں ایک نیک سیرت حکمران گذرا ہے جسے لقمان کہا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکمران حضرت ہودؑ کی شریعت کا متبع تھا۔ اور اپنی حکمت و دانائی کے لحاظ سے حکیم لقمان کے نام سے مشہور تھا۔ ایک قدیمی کتبہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے۔ یہی لقمان ہیں جن کا ذکر قرآن کریم نے خصوصیت سے کیا ہے۔ اس ذکر سے بتانا یہ مقصود ہے کہ جب انسانی عقل و بصیرت وحی کی روشنی میں فیصلے کرتی ہے تو وہ فیصلے کس قدر صادق، واضح اور انسان کو سلامتی کے راستوں پہ لے جانے والے ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا نظام ہی یہ ہے کہ وحی کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاملات کے فیصلے عقل و فکر کی رو سے کئے جائیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں عقل و وحی، علم و عشق، ذکر و فکر، خبر و نظر، خرد و جنوں کا یہی وہ حسین امتزاج ہے۔ جو اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ قرآن نے اسی مقصد کے پیش نظر لقمان کی حکمت آموز باتوں کا ذکر کیا ہے۔ سورۂ لقمان میں ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ (۳۱/۱۲)

اور (دیکھو) ہم نے لقمان کو حکمت و دانائی عطا فرمائی تھی۔ اور کہا تھا کہ وہ (اس) حکمت کی روشنی میں مصروف عمل رہے۔ تاکہ اس کی مساعی بھرپور نتائج کی حامل ہوں۔ یاد رکھو! جو اس طرح کوشش کرتا ہے۔ اس کی کوشش کے نتائج خود اس کی اپنی ذات کے لئے ہوتے ہیں۔ ورنہ اللہ ان باتوں سے بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ قرآن نے حضرت انبیاء کرام کے ضمن میں بھی فرمایا ہے کہ انہیں کتاب و حکمت عطا کی گئی تھی۔ اور حکمت بھی اسی طرح منزل من اللہ تھی جس طرح کتاب۔ وہاں کتاب سے ضابطۂ خداوندی مراد ہوتا ہے۔ اور حکمت سے وہ غایت و مقصود جس تک وہ قوانین پہنچاتے ہیں۔ یہاں کہا گیا ہے کہ لقمان کو حکمت دی گئی تھی۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ اس حکمت سے مراد انسانی فراست نہیں بلکہ وحی الہی ہے۔ لیکن چونکہ قرآن میں کسی جگہ لقمان کا نام انبیاء کے زمرہ میں نہیں آیا۔ اس لئے خیال اس طرف جاتا ہے کہ اس سے مراد انسانی فراست ہی ہے وہ وحی نہیں جو انبیاء سے مخصوص ہوتی ہے

اس سے آگے ہے۔

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ (۳۱/۱۳)

اور (یاد کرو) جب لقمان نے اپنے بیٹے سے اُسے نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ برخوردار! خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔ بلاشبہ شرک کرنا بڑا ہی ظلم ہے۔

شرک کو ظلم عظیم کہہ کر ایک عظیم الشان حقیقت کو دو لفظوں میں سمو دیا گیا ہے۔ ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو غیر محل رکھنا۔ اس کا غلط استعمال کرنا۔ کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ اس لئے شرک ظلم عظیم ہے۔ لہٰذا اس سے بڑھ کر بے محل بات اور کونسی ہو سکتی ہے کہ انسان مخلوق کو خالق کا مقام دیدے (تشریح اپنے مقام پر آئے گی)؛ اس کے بعد اس علام الغیوب کے متعلق فرمایا۔

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝ (۳۱/۱۶)

(اور دیکھو، لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا) برخوردار! (یاد رکھو) بلاشبہ اعمال (کسی کے بھی ہوں) اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی ہوں۔ پھر وہ کسی پتھر کی چٹان میں (رکھ دیئے گئے) ہوں یا آسمانوں کے اندر یا زمین کے اندر ہوں خدا ان کے نتائج کو ضرور مرتب کرے گا۔ بلاشبہ خدا بڑا ہی باریک بین اور خبردار ہے

دیکھئے! اس سے مخلوق اور خالق کا فرق کیسا نمایاں طور پر سامنے آ گیا! اس قسم کا علم سوائے خدائے لطیف و خبیر کے اور کسے ہو سکتا ہے؟ پھر احکامات کی طرف توجہ دلائی کہ۔

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰي مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (۳۱/۱۷)

اور یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا کہ) برخوردار صلوٰۃ کو قائم رکھنا اور معروف کا (لوگوں کو) حکم دینا اور منکر سے روکنا اور جو کچھ (مشکل یا مصیبت) تمہیں پیش آئے اس پر ثابت قدم رہنا۔ بلاشبہ یہ باتیں بہت ہی اہم باتیں ہیں

نظام صلوٰۃ کی پابندی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی میں انفرادی اور اجتماعی نشوونما کی دونوں صورتیں سامنے آ گئیں۔ ایک خدا شناس کے لئے اس سے بڑا جوہر اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ کے قوانین کے سامنے جھکے۔ اور ملک میں قوانین الٰہیہ کی ترویج کرے! اسی کا نام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، اور جب کوئی مصیبت آ جائے تو اس وقت پائے استقلال میں لغزش نہ آنے پائے بلکہ قانون خداوندی کی تائید و نصرت کے بھروسے پر مردانہ وار اس کا مقابلہ کرے کہ یہ فی الواقعہ بڑی بات ہے۔

اس کے بعد معاشرتی اصلاح کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا کہ۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۝ (۳۱/۱۸-۱۹)

اور (یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ برخوردار!) لوگوں سے (مغرورانہ طریقہ پر) منہ نہ موڑنا۔ اور نہ ہی زمین میں اکڑ کر چلنا۔ بلاشبہ خدا کسی مغرور اور متکبر کو پسند نہیں فرماتا۔ اور اپنی رفتار میں میانہ روی (اعتدال قائم) رکھنا اور آواز کو (بھی نرم اور) پست رکھنا۔ بلاشبہ آوازوں میں سب سے زیادہ قابل نفرت آواز گدھوں کی آواز ہے (جو بہت اونچی اور بہت سخت ہوتی ہے آواز کی اس بلندی اور سختی سے بچنا چاہیئے)

غور فرمایئے۔ ایک شاہزادہ کو کس طرح حسن اخلاق اور فروتنی کی نصیحت کی جا رہی ہے؟

اسلام کی سرگزشت

گذشتہ اشاعتوں میں عربوں کے قومی خصائص و امتیاز بیان کئے گئے تھے آج کی فرصت میں زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی حیات عقلیہ کس قسم کی تھی اس پر بحث کی جائیگی۔

بہرحال طبعی حالات اور اجتماعی کوائف ہی کسی قوم کی عقلیت کو بنانے پر اثر انداز ہوتے ہیں اجتماعی کوائف یعنی وہ اجتماعی نظم جو قوم کو محیط ہو جیسے نظام حکومت، دین، قبائلی رسوم وغیرہ۔ ان دونوں عاملوں میں کوئی سا ایک عامل کسی قوم کی عقلیت پر تنہا اثر انداز نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ ہیگل نے عقل یونانی اور ثقافت یونانی کے بارہ میں طبعی احوال و ظروف کے اثرات کا انکار کرتے ہوئے جو کچھ کہا ہے وہ قطعاً غلط ہے۔ ہیگل کی دلیل یہ تھی کہ ترک قوم یونانی سرزمین پر آباد ہوگئی اور ان کے شہروں میں اس نے زندگی بسر کی لیکن ترکوں کو نہ یونانیوں کی ثقافت نصیب ہو سکی اور نہ انکی عقلیت ہیگل کی یہ دلیل اس لئے غلط ہے کہ ایسا ہونا اس وقت ممکن تھا اگر تنہا طبعی حالات ہی واحد مؤثر ہوا کرتے۔ پھر تو یقیناً جہاں ان کا مسلک پایا جاتا یونانی عقل بھی پائی جاتی اور جہاں کا مسلک موجود نہ ہوتا وہاں ان کی عقل بھی موجود نہ ہوتی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عقل یونانی دراصل دو عاملوں کا نتیجہ تھی۔ علت کے جزو کے پائے جانے سے معلول کا پایا جانا لازم نہیں ہو جاتا۔ علم الاجتماع نے اسکی مکمل وضاحت کر دی ہے کہ مختلف قوموں میں ان عوامل کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ہمیں یہاں تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ دیکھنا ہے کہ ان عوامل نے عربوں میں کیا اثرات مرتب کئے تھے۔

لہٰذا عرب — جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ایک صحرائی علاقہ کے رہنے والے تھے جنھیں آفتاب کی گرمی تپاتی رہتی تھی۔ ان کے ہاں پانی کی بڑی قلت تھی اور ہوا خشک تھی یہ ایسے امور تھے جن کی وجہ سے درخت و پودے کثرت سے نہیں ہو سکتے تھے اور نہ کھیتیاں نشو و نما پا سکتی تھیں۔ البتہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے گھاس کے کچھ میدان ہوتے تھے اور متفرق طور پر درختوں اور پودوں کی چند خاص قسمیں کہیں پیدا ہو سکتی تھیں ان چیزوں نے ان میں یہ قدرت پیدا کر دی تھی کہ وہ سخت گرمی اور خشک فضا کو برداشت کر سکیں۔ ان کی حیوانی طاقتیں زندہ اور ان کے جسم نحیف ہوتے تھے۔

— انہی چیزوں نے ان میں نقل و حمل کی کمزوریاں بھی پیدا کر دی تھیں — ان کے ہاں اونٹ کے سوا اور کوئی جانور عموماً چل پھر نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ ایران و روم کی قریبی تہذیبوں کے لئے یہ دشوار تھا کہ وہ سرزمین جزیرۂ عرب کو آباد کر کے اپنی تہذیب و ثقافت کے اثرات سے مالا مال بنا سکیں۔ ان تک ان تہذیبوں کے وہ کم از کم اثرات ہی پہنچ سکے۔ جو تنگ آبادوں اور بیچ بیچ پکی نہ ٹوٹنے والی ندیوں کے ذریعہ جنہیں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں مختلف طریقوں سے خود بخود پہنچ سکتے تھے۔

ایک دوسری چیز پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ یعنی یہ امر کہ اس صحرائی زندگی کے نفوس انسانی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں:- بات یہ ہے کہ صحرا میں زندگی — جبکہ اس کا شہری زندگی کے ساتھ مقابلہ کیا جائے — بہت ہی کم ہوتی ہے۔ اسمیں پودوں کی زندگی، جانوروں کی زندگی اور انسان کی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ صحرا کی زمین — اکثر — انسانی آثار سے خالی ہوتی ہے۔ نہ بڑی بڑی عمارتیں ہوتی ہیں۔ نہ وسیع کھیتیاں ہوتی ہیں، نہ پھوٹنے بڑھنے والے درخت ہوتے ہیں۔ صحرائی باشندہ طبیعت کا رو در رو مقابلہ کرتا ہے کہ اس کے طبیعت کی طرف توجہ کرنے میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی آفتاب نکلتا ہے تو کوئی سایہ نہیں ہوتا۔ چاند اور ستارے نکلتے ہیں تو کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا۔ آفتاب اپنی ظالم اور سوزاں شعاعیں پھینکتا ہے تو وہ اسکی ریڑھ کی ہڈی کے گودے کی گہرائی تک جا پہنچتی ہیں۔ چاند روشن ہوتا ہے تو اسکی پرسکون ٹھنڈی شعاعیں اسکی عقل و ادراک کو جلا بخشتی ہیں آسمان میں ستارے جگمگ جگمگ کرتے ہیں تو وہ اس کے دل کو لبھا لیتے ہیں تیز رفتار آندھیوں کے جھکڑ چلتے ہیں تو جو چیز سامنے آتی ہے اسکو برباد کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اس قوی، خوشنما و جمیل اور ظالم و سنگدل طبیعت کے بالمقابل حساس نفوس کا رجحان وہ رحیم باری اور مصور، حفیظ اور مقیت یعنی خدائے برتر کی طرف طبعی میلان بھی تھا۔ شاید اس کا راز بھی یہی ہے کہ تینوں بڑے بڑے ادیان جن کے پیرو دنیا کی آبادی کا عظیم ترین حصہ ہیں — یہودیت، نصرانیت اور اسلام — صحرا سینا، صحرا فلسطین اور صحرا عرب ہی میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔

بلاشبہ وہ سکون و اطمینان جو ہمیشہ صحرا پر خیمہ انداز رہتا ہے مستعد نفوس کو شوکت و دبدبہ سے بھر دیتا اور طبیعتوں کو جلا بخشتا ہے۔ صحرا میں کوئی چیز انسانی کاریگری نہیں ہوتی بلکہ تمام چیزیں خدا کی صنعت کا شاہکار ہوتی ہیں۔ دیکھنے والے کی نگاہیں روشن آفتاب، سرگوشیاں کرنے والے ستارے راز و نیاز کی باتیں کرنیوالے چاند ہواؤں اور آندھیوں پر ہی پڑتی ہیں جو کھلے اور وسیع فضا میں کھیلتی رہتی ہیں۔ صاف اور شفاف طبیعتوں پر یہاں ایک ایسی کیفیت چھا جاتی ہے جسے شہروں کے باشندے محسوس کرنا تو درکنار سمجھ بھی نہیں سکتے۔

صحرا کی موسیقی کا ایک ہی نغمہ ہوتا ہے جو بار بار اپنے آپ کو دہراتا رہتا ہے۔ — ترش رو، سنگدل، پرہیبت اور شاندار موسیقی — کوئی تعجب نہیں کہ تم ان صحرانشینوں پر ایک طرح کا نفسی انقباض، بےچینی، غصہ — جو تمہارا جی چاہے اس کا نام رکھ لو — کی سی خاص کیفیت چھائی ہوئی دیکھو گے۔ پھر اس میں بھی کوئی تعجب نہیں کہ تم ان کے شعراء کو ایک ہی قسم کی باتیں اور ایک ہی طرح کے نغمے گاتے ہوئے پاؤ گے! کیونکہ صحرائی زندگی ان کے نفوس کو ایک ہی آواز کا عادی کر دیتی ہے لہٰذا — جیسا کہ انھوں نے سیکھا ہوتا ہے۔ وہ ایک ہی طرح کے شعر گنگناتے رہتے ہیں۔

وہ ایک کشادہ فضا کی پیداوار ہوتے ہیں جس کی ہوا کو کوئی عمارت نہیں روکتی، جیسے آفتاب کو کوئی بادل نہیں ڈھانپتا جس کی بارشوں اور سیلابوں کو کوئی مقید نہیں کر دیتا۔ ہر چیز وہاں فطرت کے مطابق آزاد ہوتی ہے۔ وہ اپنے ملک کی طرح خود بھی آزاد ہوتے ہیں۔ انھیں ان کی کھیتی باڑی نہیں روکتی جس کی وہ خبرگیری کرتے ہوں؛ کوئی صنعت و حرفت ان کی دامنگیر نہیں ہوتی جس میں وہ اپنا وقت کاٹتے ہیں۔ ان کی طبیعتیں حکومت اور نظام کی قیود سے بھی آزاد ہوتی ہیں مگر دو باتیں تھیں جو ان کی عقل اور طبیعت پر پابندیاں عائد کر سکتی ہیں بت پرستانہ دین کی پابندیاں اور اس دین کی شعائر و رسوم کی پابندیاں۔ اور دوسرے اپنی قبائلی پابندیاں اور وہ پرمشقت لوازم و واجبات جن کو یہ پابندیاں مستلزم ہوں وہ اپنی قبائلی پابندیوں کے لئے زیادہ مخلص اور ایمان و اعتقاد میں قوی تر ہوتے تھے۔

یہ اس قسم کا ایک معاشرہ تھا جس نے ان کی معیشت کی حد بندیاں کر رکھی تھیں۔ وہ سفر کے عادی تھے، گھاس اور چارہ کی تلاش میں ہر طرف مارے مارے پھرتے تھے۔ وہ فقیر ہوتے تھے ان کی ثروت ان کے مویشیوں کی کثرت پر منحصر تھی۔ یہ ثروت ہر گھڑی طبعی رحمت کے آسرے پر جیتی تھی۔ کبھی مویشی بڑھ جاتے تھے اور کنوؤں کا پانی خشک ہو جاتا تھا۔ بارشیں کم ہوتی تھیں لہٰذا چراگاہیں بھی کم ہو جاتی تھیں۔ زندگی بدحالی کا شکار ہو جاتی تھی۔ انھوں نے بارش کا نام غَیْث رکھا تو ٹھیک ہی رکھا۔ اس معاشرہ نے ان کے اخلاق و عادات اور عقلیت کی حد بندیاں بھی کر دی تھیں۔ ان کی یہ تنگ معیشت ہی تو تھی جس نے سخاوت، مہمان نوازی، راتوں کو آگیں جلانے تاکہ مسافر مہمان روشنی دیکھ کر اس طرف آ جائیں — جیسی خصوصیات کو تمام فضائل میں سرفہرست رکھا تھا۔ ان کا یہ فقر ہی تو تھا جس نے لوٹ مار کو ان کا محبوب ترین مشغلہ بنا دیا تھا اور جس نے قبیلہ کی حمایت کو اس قدر بلند مرتبہ دے دیا تھا کہ جو شخص قبیلہ کی حمایت میں ذرا سی کوتاہی برتتا تھا وہ رسوائی اور ذلت کا نشانہ بن جاتا تھا۔ یہ قبیلہ کی حمایت ہی تو تھی جس نے انسانی جان کو اس قدر ارزاں کر دیا تھا۔ زندگی جب اسی میں گھر کر رہ جائے کہ فلاں قبیلہ پر لوٹ مار کرنی ہے یا فلاں قبیلہ کی لوٹ مار کی مدافعت کرنی ہے اور اس کے ساتھ راستے غیر محفوظ ہوں۔

مجلسِ اقبال

مثنوی اسرارِ خودی

(تمہید - مسلسل)

اس سے پہلے شعر میں، اقبال اپنی اس آرزو کا اظہار کرچکا ہے کہ وہ فیضِ رومی سے مستفید ہو اور اس طرح کائنات کے اسرارِ سربستہ کو بے نقاب دیکھ سکے۔ اس کے بعد وہ پیرِ رومی سے اپنا تقابل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

جانِ او از شعلہ ہا سرمایہ دار　　　من فروغِ یک نفس مثلِ شرار

رومی بجھر بھڑکتے ہوئے شعلوں کا پیکر، اور سوز و حرارت کا تابندہ مجسمہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں میری چمک، ایک شرارہ کی طرح، محض ایک لمحہ کے لئے ہے۔ رومی کے سوزِ عشق اور گرمیٔ محبت میں دوام اور پائندگی ہے۔ اس کے مقابلہ میں میری شعلہ سامانیاں بالکل عارضی ہیں۔ میں خام ہوں۔ وہ پختہ ہے۔ اور میری جس قدر حرارت ہے وہ بھی اسی کی شمعِ سوزاں کی رہینِ منت ہے۔ اسی لئے کہ

شمعِ سوزاں، تاخت بر پروانہ ام　　　بادہ شبخوں ریخت بر پیمانہ ام

اس کی شمعِ درخشندہ نے میرے پروانۂ دل پر یک لخت حملہ کیا۔ اور اسے خاکستر بنا دیا۔ اس کی شرابِ عشق نے میرے پیمانۂ قلب پر شب خوں مارا اور اس کی متاعِ صبر و ہوش کو لوٹ کر لے گئی قاعدہ یہ ہے کہ پروانے شمع پر حملہ کرتے ہیں۔ اور پیالے شراب کو لوٹتے ہیں۔ لیکن اقبال یہ کہتا ہے کہ میرے ذوق و شوق کو دیکھ کر رومی خود آگے بڑھا۔ اور مجھے اپنے سیلابِ محبت میں بہا کر لے گیا۔ اصغر کے الفاظ میں

شعلہ ہر خود بیتاب ہے جذبِ تمنا سے　　　حقیقت ورنہ سب معلوم ہو پروازِ شبنم کی

لیکن یہ اقبال کا ابتدائی دور تھا۔ ورنہ بعد میں وہ رومی تو ایک طرف، خدا کے متعلق کہہ گیا ہے کہ

یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

بہرحال وہ کہتا یہی ہے کہ

پیرِ رومی خاک را اکسیر کرد　　　از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

پیرِ رومی کی نگاہِ گرم نے میری خاک کو اکسیر کر دیا۔ اور میرے اس غبار سے رنگا رنگ کے ہزاروں جلوے تعمیر کردیئے۔ اور خود میری خفیہ صلاحیتوں کو اس درجہ بیدار کر دیا کہ مجھ میں یہ ہمت اور جرأت پیدا ہوگئی کہ میں بلند سے بلند حقائق تک اپنا ہاتھ بڑھا سکوں۔ چنانچہ

ذرہ از خاکِ بیاباں رخت بست　　　تا شعاعِ آفتاب آرد بدست

ذرہ کا اصل مستقر تو خاکِ بیاباں میں ہوتا ہے۔ مگر رومی کا اثر یہ تھا کہ اس ذرہ نے اپنے مستقرِ خاکی سے اپنا رختِ سفر باندھ لیا۔ اور فضا کی پہنائیوں میں محوِ پرواز ہو گیا۔ اس عزمِ بلند کے ساتھ کہ وہ شعاعِ آفتاب کو اپنی گرفت میں لے لے۔ یہ سب کچھ فیضِ رومی کے اثر سے ہوا۔

موجم و در بحرِ او منزل کنم　　　تا دُرِ تابندۂ حاصل کنم

میری ہستی محض ایک موج کی سی ہے۔ جس کی منزل رومی کا بحرِ بے کراں ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اور یہ سب اس لئے کہ میں اس طرح آغوشِ رومی میں سکون پذیر ہو کر زندگی کا گوہرِ تابندہ حاصل کرسکوں۔

من کہ مستی ہا ز صہبائش کنم　　　زندگانی از نفسہائش کنم

میری تمام مستیاں شرابِ رومی کی کیف انگیزی سے ہیں۔ نہیں! بلکہ یوں کہئے کہ میری تمام زندگی ہی نفسہائے رومی کی رہینِ منت ہے۔ پیکر مرا ہے۔ اس میں سانس رومی کا ہے شراب میری ہے۔ اس میں کیف رومی کا ہے۔

※

اس کے بعد اقبال بتاتا ہے کہ اس کی فضائے فکر پر رومی کس طرح جلوہ بار ہوا، اسے وہ محاکاتی انداز سے یوں بیان کرتا ہے کہ

شب، دلِ من مائلِ فریاد بود　　　خامشی از یاربم آباد بود

ایک رات کا ذکر ہے کہ میں اپنی تنہائیوں میں بیٹھا، خدا سے ناسازگاریٔ حالات کا شکوہ کر رہا تھا۔ ہر طرف سناٹا ہی سناٹا تھا۔ اس چار سو خاموشی کو کوئی توڑنے والی آواز تھی تو یا رب کے نعرہ کی تھی۔ جو مسلسل آہوں کے ساتھ میرے لب پر آ رہی تھی۔

شکوہ آشوبِ غمِ دوراں بدم　　　از تہی پیمانگی نالاں بدم

میں غمِ روزگار سے شکوہ سنج تھا۔ حالات کی ناسازگاری سے نالاں تھا۔ اور بحضور رب العزت یہ شکایت کر رہا تھا کہ دوسروں کے میکدوں کے میکدے آباد ہیں۔ اور میری حالت یہ ہے کہ ایک چھوٹا سا جامِ صہبا بھی بالکل خالی ہے۔ میرے آہ و نالہ اور گریہ و فغاں کے یہ جذبات اس قدر شدید ہوئے کہ میں دعا مانگتا مانگتا سو گیا۔

ایں قدر نظارہ ام بے تاب شد　　　بال و پر بشکست و آخر خواب شد

یہ شہپرِ نظارہ اس قدر پھڑپھڑایا کہ اس کے بازو اور پر سب ٹوٹ گئے۔ اور اس کی بیتابی مائل بہ سکون ہوگئی۔ اور مجھے نیند آگئی۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ

روئے خود بنمود پیرِ حق سرشت　　　کو بحرفِ پہلوی قرآں نوشت

سامنے پیرِ رومی کھڑے ہیں۔ وہ پیرِ رومی جنہوں نے اپنی مثنوی میں قرآن کو فارسی زبان میں لکھ دیا ہے۔

ہم سابقہ قسط میں بتا چکے ہیں کہ اقبال کو رومی سے کس قدر عقیدت تھی۔ یہ دونوں جذبات اسی عقیدت مندی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ عام عقیدہ کہ

مثنویٔ مولوی معنوی　　　ہست قرآں در زبانِ پہلوی

کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے! اس میں شبہ نہیں کہ اقبال نے رومی کے ہاں سے بھی بڑی حد تک وہی کچھ لیا ہے۔ جو قرآن کے مطابق ہے۔ لیکن اس کے باوجود رومی کے متعلق اقبال کا اس درجہ اظہارِ عقیدت، بہت سوں کے لئے ایک شدید غلط فہمی کا موجب بن گیا ہے ایک بڑی حد تک اس کی ذمہ دار یہ چیز بھی ہے کہ اقبال نے اپنے اظہارِ مدعا کے لئے پیرایۂ بیان شعر کا اختیار کیا۔ شاعری میں ہوتا یہی ہے کہ مضامین کی آمد سے انسان یہ بھول جاتا ہے کہ اسے کہاں رکنا چاہیئے۔

بہرحال خواب میں رومی اقبال کے سامنے آگئے۔

ذاتی ملکیت
کا اصول
ملا کے نزدیک بڑا مقدس ہے
لیکن اس کے بارے میں
قرآن کا حکم کیا ہے
اس کی تفصیل
"نظامِ ربوبیت"
میں دیکھئے

عورت کا قرآن

(۱۷)

قرآن پیغام لایا تھا کہ:-

وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ (انفال ۶)

"دیکھو خبردار! تم لوگ آپس میں نزاع جھگڑا نہ کرنا، ورنہ کمزور ہو جاؤ گے اور سارے لوگوں پر سے تمہاری دھاک اٹھ جائے گی"

قرآن نے مسلمانوں کو تاکید کی تھی کہ:-

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا.... وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (آل عمران - ۱۱)

"دیکھو، تم لوگ اللہ کی ایک رسی کو سب مل کر پکڑے رہنا۔ اور تم میں باہم اختلاف کبھی نہ ہونے پائے.... اور تم لوگ ان قوموں کی طرح نہ ہو جانا جنھوں نے اللہ کی طرف سے واضح احکام اور ہدایت پہونچ جانے کے باوجود آپس میں تفریق کر لی تھی۔ اور باہم اختلاف کرنے لگے تھے۔ ایسا کرنے والے بڑی سخت سزا کے مستحق ہیں۔

قرآن نے بتایا تھا کہ اسلام میں گروہ بندی حرام اور ٹولیوں ٹولیوں میں بٹ جانا شرک ہے۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا۔ (روم ۴)

دیکھو تم لوگ مشرک نہ ہو جانا۔ جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا ہے۔ اور مختلف جماعتوں اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔

قرآن نے تو رسول اللہ تک کو سمجھا دیا تھا کہ:-

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (انعام ۲۰)

دیکھو اے رسول! جو اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں اور مختلف گروہوں میں بٹ جائیں۔ وہ تم میں سے نہیں ہیں۔ اور تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مگر مسلمانوں کا یہ حال کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ الگ الگ جماعتیں ہیں۔ اور ان میں سے ایک دوسرے سے اس طرح بے تعلق ہے۔ گویا دوسری جماعت "مسلمان" ہی نہیں ہے۔ یہ حال اس وجہ سے ہے کہ اب اسلام کی کتاب "قرآن" نہ رہی اور اب مسلمانوں کے سامنے صرف "احادیث" اور "فقہ" کی کتابیں ہیں۔ مولانا مسعود عالم ندوی ۱۹۴۹ء میں حج کو گئے تھے۔ وہاں ایک مسئلہ کے بارے میں علماء نے کہ معظمہ میں جواب دیا کہ:-

"تم حنفی ہو تو پھر تمہیں حدیث تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے! فقہائے حنفیہ کا فتویٰ معلوم کر لینا کافی ہے" (دیار عرب میں ص ۲۴)

ذرا غور فرمائیے "قرآن" کا نام تک نہیں لیا گیا۔ یہ کعبے کا حال ہے۔ "چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی"

میری بہنو! یاد رکھیے کہ اسلام میں گروہ بندی حرام ہے۔ تفریق شرک ہے۔ مگر مسلمان تفریق ہی کو اسلام سمجھے ہیں۔ ذرا غور کیجئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے پیغمبر بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ تھے کہ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کو حضرت ہارون کے سپرد کر کے حضرت موسیٰ کوہ طور پر تشریف لے گئے۔ اس درمیان میں بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی شروع کر دی۔ حضرت ہارونؑ نے منع بھی کیا مگر وہ نہ مانے۔ حضرت موسیٰ کو وحی الٰہی نے بتایا کہ تمہاری قوم نے گوسالہ پرستی شروع کر دی ہے۔ وہ غصہ میں بھرے ہوئے تشریف لائے۔ آپ نے حضرت ہارونؑ کو ڈانٹا کہ تم نے ایسا کیوں ہونے دیا؟ اب ذرا دیکھئے کہ حضرت ہارونؑ کیا جواب دیتے ہیں! انھوں نے فرمایا کہ ہم نے سمجھایا تو ان لوگوں کو بہت مگر وہ نہ مانے، البتہ زیادہ سختی میں نے اس لئے نہ کی کہ:-

إِنِّي خَشِيتُ أَن تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي - (طٰہٰ ۵)

میں اس بات سے ڈر گیا کہ کہیں آپ (آ کر) یہ نہ کہنے لگیں کہ تو نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میرے حکم کا پاس نہ کیا۔

ذرا سوچئے کہ "تفرقہ اندازی" اتنا بڑا "شرک" ہے کہ ایک پیغمبر نے "گوسالہ پرستی" کے نسبتاً چھوٹے شرک کو تو گوارا کر لیا۔ مگر بڑے شرک "فرقہ پرستی" کو گوارا نہ کیا۔ یعنی یہ پسند نہ کیا کہ بنی اسرائیل مختلف ٹولیوں اور جماعتوں میں بٹ جائیں۔ مگر مسلمان! اللہ اللہ رونے کی بات ہے کہ وہ سینکڑوں ٹولیوں اور جماعتوں میں بٹ گئے۔ اور بقول قرآن:-

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (روم ۴)

"ہر گروہ اپنے ان اعتقادات پر خوش ہے جنہیں وہ لئے بیٹھا ہے"

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جیسا کہ فرمایا تھا۔ مسلمانوں کی دھاک اٹھ گئی۔ اور وہ کہیں کے نہ رہے، آج دنیا میں وہ سب سے زیادہ ذلیل ہیں۔

بہرحال آپ یہ خوب سمجھ لیں کہ "اسلام" کوئی مذہب نہیں ہے۔ جس کا تعلق صرف چند رسومات کی ادائیگی سے ہو بلکہ یہ "دین" ہے۔ جس کو "قانون" یا "نظام" کہا جاتا ہے۔ اور جو "دین" اور "دنیا" دونوں کے لئے ہدایت ہے۔ اور جس کو ہماری زندگی کے ہر شعبے میں دخل ہے اور اس نظام اسلامی کا ایک اور صرف ایک ہی دستور العمل ہے۔ جس کو "قرآن" کہا جاتا ہے اس لئے اسلام صرف قرآن میں ہے جسے رسول اللہ صلعم خود مرتب کر کے دے گئے تھے جس کو صحابہ کرام نے پھیلایا تھا۔ جس کو تابعین نے اپنایا تھا۔ اور جس کے ذریعے عورت فرش سے اٹھ کر عرش تک پہونچ گئی تھی۔ اور یہ قرآن ہی ہے جس کو اگر مسلمان مرد و عورت پھر اپنائیں گے۔ تو پھر فائز المرام ہو سکتے ہیں۔ اگر خود ساختہ اسلام کو کلیجہ سے لگائے رہے تو مسلمان ہمیشہ اسی حال میں قعر مذلت میں پڑے رہیں گے۔ اور کبھی باوقار نہ ہو سکیں گے۔ چاہے جس قدر بھی سر پٹکیں۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم
نہایت اس کی "حسین" ابتدا ہے "اسمٰعیل" (اقبال)

لہٰذا میں اپنی بہنوں کو مشورہ دیتی ہوں کہ مروجہ مذہب اسلام سے ہٹ کر خدا کے لئے قرآن پاک کا توجہ اور گہری نظر سے مطالعہ کر کے یہ جاننے کی کوشش کیجئے کہ واقعی اسلام کیا ہے اور "دین" کہتے کس کو ہیں؟

اے کہ نشناسی "خفی" را از "جلی" ہشیار باش
اے گرفتار ابوبکر و علی ہشیار باش (اقبال)

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (محمد ۳)

یہ لوگ قرآن میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے؟ کیا دلوں پر تالے لگ گئے ہیں؟

اتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ (کہف ۴)

تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری طرف جو کتاب وحی کی گئی ہے اس کی پیروی کرو۔ کوئی اس کے کلمات کو بدل نہیں سکتا۔

قُل لَّوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُم بِهِ (یونس ۲)

"کہہ دو کہ اگر خدا کو منظور نہ ہوتا تو نہ تو میں تم کو یہ قرآن پڑھ کر سناتا۔ اور نہ اللہ تم کو اس کی اطلاع دیتا"

إِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ (زخرف ۴)

یہ قرآن تمہارے لئے اور تمہاری قوم کے لئے بڑے شرف کی چیز ہے"

گوا:- ہندوستان اور پرتگال کی استخوان نزاع

تاریخ میں شاید ایسی مثال ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملیگی کہ کوئی قوم غیر ملکی غلامی سے آزاد ہوتے ہی ہمسایوں کی آزادی کے درپے ہو گئی ہو۔ اور اس کے نزدیک آزادی کا مفہوم اپنی تعمیر سے کہیں زیادہ اوروں کی تخریب ہو جائے۔ ایسی مثال ہندوستان نے قائم کی کم و بیش نصف صدی کی جدوجہد کے بعد ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئی۔ لیکن نئی فضا میں آنکھ کھول کر اس نے دیکھا کہ اس کے مشرق اور شمال مغرب میں آزاد مسلمان مملکت قائم ہے ان مسلمانوں کی حکومت تھی جسے آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہرلال نہرو قابل اعتنا سمجھنا خلاف شان سمجھتے تھے اور کوئی دس سال پیشتر انھوں نے بڑی ڈھٹائی سے کہ دیا تھا کہ برصغیر ہند میں دو طاقتیں ہیں۔ ایک انگریزی اور دوسری ہندو کانگرس کی۔ یہ منظر ہند کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا لیکن یہ منظر اور ڈراؤنا ہو گیا جب جوناگڑھ، مانگرول اور مناوادر کی ریاستوں نے پاکستان سے الحاق کا اعلان کر دیا۔ حیدرآباد کی ریاست سے متعلق یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ وہ آزادی کا اعلان کردے گی اور ریاست کشمیر کی مسلمان آبادی کے متعلق یہ یقین ہو گیا کہ وہ پاکستان سے الحاق کرے گی۔

ہندوستان نے ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا کہ ایسا نہ ہو چنانچہ ایک طرف پاکستان کے خلاف مہم شروع ہوئی۔ مسلمانان ہندوستان کو دہشت زدہ کر کے گھروں سے نکالا جانے لگا تاکہ وہ نہایت بے سروسامانی کی حالت میں بھاگ بھاگ کر پاکستان میں پناہ لیں اور اس کی معیشت کو تباہ کر دینے کا باعث بنیں۔ یہ وار بڑا کارگر تھا۔ لیکن اللہ کی توفیق شامل حال نہ ہوتی تو پاکستان اس سیلاب ہلاکت میں غرق ہو جاتا۔ پاکستان کو یوں الجھا کر ہندوستان نے کشمیر کا رخ کیا۔ آناً فاناً اس کی فوجیں ریاست میں پہنچ گئیں اور اہل کشمیر کے لئے استبداد کا نیا اور جاں گسل دور شروع ہو گیا۔ یہ پاکستان کی معیشت پر ایک اور وار تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان کشمیر سے آنیوالے زندگی بخش دریاؤں کے پانی سے محروم ہو کر خوراک اگلنے کے قابل نہ رہے اور فاقوں مر جائے۔ کشمیر میں پاکستان کی شہ رگ کو قابو کر کے ہندوستان نے جوناگڑھ وغیرہ میں نام نہاد تحریک "آزادی" شروع کرادی۔ ہندوستانی "رضاکار" ہندوستانی علاقے سے ہندوستانی حکومت کی مدد سے جوناگڑھ میں جا گھسے اور اسے آزاد کرالیا۔

یہ معرکہ نوعیت کے اعتبار سے عجیب تھا ہجوم مصائب میں پاکستان اس جنگ کے تقاضوں کو کماحقہ نہ سمجھ سکا۔ چنانچہ وہ ہندوستان کا حریف نہ ہو سکا۔ ہندوستان نے دراصل پاکستان کی اسی پوزیشن کا فائدہ اٹھایا۔ استعماریت کا یہ پہلا معرکہ کامیاب نظر آیا تو ہندوستان کے حوصلے بڑھ گئے۔ اب اس نے اور جرأت سے کام لیا اور حیدرآباد دکن پر چڑھ دوڑا۔ دو ایک روز میں ہی نظام کی بے تدبیری کے ہاتھوں سلطنت آصفیہ ہندوستان کا حصہ بن گئی۔ استعماریت کا یہ دوسرا معرکہ تھا جس کا نتیجہ ہندوستان کے حق میں رہا اور جس سے اس کے حوصلے اور بڑھ گئے۔

اس سلسلہ کا تیسرا معرکہ فرانس سے پیش آیا۔ فرانس دوسری عالمگیر جنگ سے بالکل چور ہو کر نکلا تھا۔ لیکن اسے سستانے کا کوئی موقعہ نہ ملا۔ ہندچینی اور مغرب اقصیٰ کی شورش اور بدامنی نے اسے اور بے دست و پا کر دیا۔ چنانچہ وہ بھی ہندوستان کا حریف نہ ہو سکا۔ اس نے اپنے مقبوضات رفتہ رفتہ ہندوستان کی تحویل میں دے دیئے۔ ہندوستان اس طرح کامیابی پر کامیابی حاصل کئے چلا جا رہا تھا کہ اس کا واسطہ ایک نئے حریف سے پڑا۔ یہ حریف سرخ چین تھا۔ وہ بڑھتے بڑھتے تبت تک پر قابض ہو گیا تھا۔ تبت کا علاقہ تقسیم سے پیشتر انگریز کے زیر اثر تھا۔ اور اس میں ہندوستانی چوکی قائم تھی۔ ہندوستان نے اسے غنیمت جانا اور شمال کی طرف توسیع کا ذریعہ سمجھا۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے دنیا کی چھت پر چڑھنے کے لئے استعماریت کی سیڑھی آگے بڑھائی۔ لیکن چین نے جو پہلے ہی سے وہاں موجود تھا اسے الٹا دیا۔ تبت کے ساتھ ساتھ ہندوستان نے شمال کی چھوٹی سی ہمالیائی ریاست نیپال میں بھی اثر و دخل پیدا کرنا شروع کر دیا تھا۔ چین نیپال تک براہ راست تو نہیں پہونچ سکا۔ لیکن اس ریاست میں اشتراکیت ضرور نمودار ہو گئی ہے۔ یہ تحریک ہنوز ابتدائی مراحل میں ہے۔ لیکن یہ توق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس ریاست میں ہندوستان اور چین کی جنگ شروع ہو گئی ہے۔

چین ہندوستان کی سرحد پر آ بیٹھا تو ہندوستان کو معلوم ہوا کہ یہ کم و بیش بارہ سو میل کی مشترک سرحد بالعموم غیر متعین ہے چین نے جگہ بہ جگہ اس عدم تعین کو مفید مطلب بنایا اور حسب فرصت اور موقعہ ان میں ردوبدل کیا۔ ہندوستان کے لئے یہی کچھ کم تشویشناک نہ تھا کہ اس نے دیکھا کہ چین کا سایہ لمبا ہو کر سارے جنوب مشرقی ایشیا تک چھا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اندرون ہند بھی کئی علاقے اشتراکیت کی زد میں آگئے تھے۔ اس صورت حال کا مقابلہ ناممکن تھا۔ چنانچہ ہندوستان نے اس سے مطابقت پیدا کرنی شروع کر دی حتیٰ کہ پسپا ہو کر اس نے چین سے دوستی کی طرح ڈالی۔ ہندوستان نے اس دوستی میں دو فائدے دیکھے ایک تو یہ کہ چین ہندوستان کا لحاظ کرے گا۔ اور اسے اپنی توسیع کا نشانہ نہیں بنائے گا۔ اور دوسرے یہ کہ چین کی طرف اس کا جھکاؤ دیکھ کر امریکہ اس کی اور زیادہ خوشامد کرے گا۔

گو چین کے معاملہ میں ہندوستان نے زک اٹھائی لیکن اس شر میں اس کے لئے ایک حد تک یا وقتی طور پر خیر کا پہلو نکل آیا ہندوستان اس شکست سے متعلق دھوکہ میں تو نہیں رہا۔ لیکن اس کے لئے فی الحال اس میں تسکین کا سامان ضرور ہے۔ اب ہندوستان نے ایک اور طرف رخ کیا اور پرتگال کو نشانہ بنایا اور مطالبہ کیا کہ وہ اپنے ہندوستانی مقبوضات سے دستکش ہو جائے ہندوستان کو توقع تھی کہ جس طرح اس کی استعماریت کی گنگا کشمیر، حیدرآباد، جوناگڑھ اور فرانسیسی مقبوضات کو نگل گئی ہے، اسی طرح پرتگال بھی ایک تر نوالہ ثابت ہوگا۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب پرتگال نے گوا کو اٹھا کر گنگا میں ڈال دینے اور ہندوستان کے آگے ڈنڈوت بجا لینے کی بجائے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔

ہندوستان اور پرتگال کی کشمکش کو سمجھنے کے لئے پرتگال کے ہندی مقبوضات کا پس منظر جاننے کی ضرورت ہے۔ پرتگالی علاقے کا رقبہ ۱۵۳۸ مربع میل ہے۔ اس میں سب سے بڑا اور قابل ذکر گوا ہے جو ۱۳۷۰ مربع میل ہے۔ باقی علاقے دمن اور دیو ہیں۔ یہ علاقہ جنوبی ہندوستان میں مغربی گھاٹ پر واقع ہیں۔ گوا ایک بندرگاہ ہے اور اس کا ساحل ۶۲ میل لمبا ہے۔ اس صوبے کے دو حصے ہیں۔ ایک نیا ایک پرانا۔ پرانا حصہ اس علاقے پر مشتمل ہے جس پر پرتگیز سولہویں اور سترھویں صدی میں تجارت کی غرض سے آباد ہوئے۔ نیا علاقہ کوئی تین سو سال بعد مرہٹوں کے زوال کے بعد ان کے تصرف میں آیا۔ پرانا علاقہ کم و بیش پرتگیزی ہے۔ اس کے باشندے زیادہ تر عیسائی ہیں۔ اور ان کے نام پرتگیزوں کی طرح ہیں۔ یہ لوگ خوشحال بھی ہیں۔ نیا علاقہ جو پرانے علاقے کے حوالی میں ہے آٹھ اضلاع میں بٹا ہوا ہے۔ اس میں عیسائی ہیں لیکن ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ دونوں فرقے رہتے تو امن و امان سے ہیں لیکن فرقہ وارانہ امتیاز موجود ہے۔ دمن بمبئی سے ایک سو میل شمال کی جانب ہے اور اس کا رقبہ ۱۴۸ مربع میل ہے۔ دیو کاٹھیاوار کے سامنے ایک جزیرہ ہے یہ جزیرہ خود ۱۴ مربع میل ہے لیکن اس سے متصل مجموعی علاقہ ۲۰ مربع میل ہے یہ پرتگالی علاقے مغربی گھاٹ پر واقع ہونے کی بدولت بڑے سرسبز ہیں کیونکہ ان میں مئی سے اکتوبر تک خوب بارشیں ہوتی ہیں۔ گوا زیادہ تر پہاڑی علاقہ ہے اور اس میں بعض نہایت قابل دید قدرتی مناظر ہیں۔

ان علاقوں پر بالخصوص گوا پر پرتگیزی رنگ نمایاں ہے۔ پرتگیزی آمد کے بعد ایک تو عیسائی مشنریوں کی آمد اور تبلیغ کا وسیع سلسلہ شروع ہو گیا۔ دوسرے پرتگیزوں نے اخلاقی طور پر اچھے معیار قائم کئے مثلاً البوکرک جو گوا کا دوسرا وائسرائے تھا پرتگیزی سپاہیوں اور ہندوستانی عورتوں کے ناجائز اختلاط کو اخلاقاً روا نہیں سمجھتا تھا البتہ جو پرتگیزی سپاہی ہندوستانی عورتوں سے شادی کرنا چاہتے تھے انھیں اس کی کھلی اجازت تھی۔ اس طرح گوا قلیل مدت میں عیسائی ہو گیا۔ اور وہاں کے باشندے ایسے ہو گئے جن کے ماں باپ مخلوط نسل کے تھے۔ ان باشندوں کو گوا اور پرتگال دونوں میں مساوی حقوق حاصل تھے۔ چنانچہ اب پرانے حصہ میں جو آبادی پائی جاتی ہے اس میں معتدبہ حصہ ہندوستانیوں ہی کی اولاد ہے لیکن ان کے نام اور طرز بود و ماند پرتگیزوں کے سے ہیں۔ گوا اور پرتگال میں صدیوں کے میل جول سے اتنا گہرا اختلاط پیدا ہو گیا ہے کہ اہل گوا اپنے آپ کو باقی ہندوستان سے ایک جداگانہ برادری سمجھتے ہیں۔ ان کا گروہی زندگی کا احساس اتنا قوی ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی جاتے ہیں اکٹھے رہتے ہیں اور جداگانہ تشخص برقرار رکھتے ہیں۔ ان کے کلب تک علیحدہ ہوتے ہیں۔ وہ کافی تعداد میں دوسرے ملکوں میں آباد ہیں۔ اور ایک عرصے سے وہیں رہ رہے ہیں۔ لیکن ان کا وطن سے تعلق منقطع نہیں ہوا۔ ہندوستان میں ان کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ ہے، پاکستان میں وہ تیس ہزار کے قریب ہیں

صرف کراچی میں ان کی تعداد دس ہزار ہے۔

گوا کی سیاسی حیثیت کیا ہے؟ ہندوستان اسے استعماریت کے باقیات میں سے سمجھتا ہے۔ اور اپنے چہرے پر بدنما چھائیں سے موسوم کرتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت نہیں۔ پرتگال نے گوا کو شروع سے ہی ایک مستعمرہ کی حیثیت سے رکھنے کی بجائے اسے اپنے برابر سیاسی رتبہ دیا۔ اس نے محض اعلان ہی نہیں کیا بلکہ اس پر عامل بھی رہا کہ پرتگال اور گوا میں کوئی سیاسی امتیاز نہیں اور ان کا باہمی تعلق حاکم اور محکوم کا نہیں بلکہ ایک ہی ملک کے مختلف حصوں کا ہے نیز پرتگال گوا سے کچھ کمانے کی بجائے گراں قدر رقوم اس پر صرف کرتا ہے۔ مثلاً گوا کا سالانہ بجٹ ۵ ۲لاکھ پونڈ کے لگ بھگ ہے اور کم و بیش یہ ساری رقم گوا میں ہی صرف ہوتی ہے۔ پرتگال اس کو ہر سال ۵۰۰ر۸۰ پونڈ کی مدد دیتا ہے۔ بجٹ میں مدد کے علاوہ وہ اور کئی طریقوں سے گوا کی مدد کرتا ہے۔ ان دریں حالات یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پرتگال گوا کو بہ حیثیت مستعمرہ استعمال کرتا ہے اور کسی قسم کے استحصال کا مجرم ہے۔ اس تعلق نے دونوں ممالک کو ثقافتی اعتبار سے ایسا ہم آہنگ بنا دیا ہے کہ ڈاکٹر سلازر وزیر اعظم پرتگال کے الفاظ میں ہندوستان کے راستے گوا میں داخل ہو کر ایسا نظر آتا ہے کہ ایک نئی انسانی سرحد عبور کر لی گئی ہے گوا تو ہے مشرقی آب و گل میں مغربی ثقافت کی تخم ریزی کا یہ پرتگال کے ہاتھوں ہی ممکن ہو سکتا تھا کیونکہ دیگر یورپی اقوام کے برعکس پرتگال مشرق میں غلاموں کی تلاش میں نہیں آیا بلکہ اہل مشرق کو تہذیب و تمدن کی دولت سے بہرہ ور کر کے اپنے برابر دینے میں ساعی رہا۔

پرتگال نے جس محنت سے گوا کی آبیاری کی ہے اس نے گوا کے مسئلہ کی نوعیت بدل دی ہے۔ ہندوستان نے خیال کیا کہ وہ استعماریت استعماریت پکاریگا تو پرتگال فرانس کی طرح بوریا .... بستر باندھ کر چپکے سے چل دے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور فروری سنہ ۱۹۵۰ء میں جن مذاکرات باہمی کی طرح ڈالی گئی تھی وہ اب تک کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکے۔ پرتگال کی طرف سے ہندوستان کو بار بار یہی جواب دیا جاتا ہے کہ پرتگیزی دستور اس کی بالکل اجازت نہیں دیتا کہ ملک کا کوئی حصہ فی سبیل اللہ کسی دوسرے ملک کو دیدیا جائے۔ پرتگال کا رویہ دیکھ کر ہندوستان نے جنوری سنہ ۱۹۵۳ء میں نئی تجویز پیش کی۔ یعنی یہ کہ اگر گوا سے مل جائے تو وہ اس کے ثقافتی حقوق، زبان، قانون، رسم و رواج کو محفوظ رہنے دے گا۔ اس کا پرتگال پر کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے پہلا سا جواب دے کر اس تجویز کو مسترد کر دیا۔

اب ہندوستان آپے سے باہر ہو گیا اس نے بالکل ہٹلر کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا۔ ہٹلر ہمسایہ ممالک سے پہلے تو یہ مطالبہ کرتا تھا کہ ان کی حدود کے اندر جو جرمن آبادی ہے وہ جرمن قوم کے باشندے ہیں۔ وہ جرمنی کو دیدیئے جائیں۔ جب اس مطالبہ کو منظور نہیں کیا جاتا تھا تو اس کی طرف سے یہ مہم شروع ہو جاتی تھی کہ جرمنوں پر بے تحاشا مظالم توڑے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اس بہانے سے حملہ کر کے وہ ان علاقوں کو کیا سارے ملکوں کو اپنے قبضہ میں کر لیا کرتا تھا۔ ہندوستان نے یہی کیا۔ اس کے اخبارات اور ارباب حکومت و سیاست نے یہ کہہ کہہ کر آسمان سر پر اٹھا لیا کہ گوا میں سیاسی آزادی نہیں۔ پرتگال نے رعایا پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ مئی سنہ ۱۹۵۳ء میں حکومت ہند نے حکومت پرتگال کو ایک یادداشت بھیجی جس میں تحریر تھا کہ ان حالات میں ہندوستان کے لئے لزبن در حکومت پرتگال میں سفارت خانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ دوسرے مہینے (۱۱ر جون کو) اسے بند کر دیا گیا۔ سفارتی تعلقات کا انقطاع مہذب ممالک کے مابین جنگ سے ورے انتہائی اقدام ہوتا ہے۔ ہندوستان نے سمجھا کہ پرتگال اس سے مرعوب ہو جائے گا اور وہ اسے شکور کر دے گا۔ لیکن اس کا رویہ بدستور سابق رہا اور اس میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

جولائی سنہ ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر سلازر نے جو اعلان کیا وہ پرتگال کی روش کا آئینہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ "ہم نہ استصواب کے ذریعہ نہ اس کے بغیر کبھی اپنے ملک کے کسی حصے یا اس کی آبادی کے انتقال سے متعلق گفتگو کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ ہم کیا پرتگال کی کوئی حکومت اس کے لئے تیار نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ نہ ہمارا آئین ہمیں اس کی اجازت دیتا ہے نہ ہمارا ضمیر۔" ڈاکٹر سلازر اس کے لئے البتہ رضامند ہے کہ چونکہ گوا کی سرحد ہندوستان سے ملتی ہے اور ہندوستان کو شکایت ہے کہ گوا کے ذریعہ ناجائز مال کی تجارت ہوتی ہے اس لئے وہ دونوں مل کر ایسے اقدامات کریں جن سے اگر ایسا ہوتا ہے تو اس کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ نیز انھوں نے اس کے لئے بھی رضامندی کا اظہار کیا کہ وہ ہندوستان کی تسلی کر سکتے ہیں کہ گوا میں اس کے خلاف کسی قسم کی جنگی تیاری نہیں ہوگی اور نہ گوا کو ہندوستان کے خلاف محاذ جنگ کے طور پر استعمال ہونے دیا جائے گا۔ ہندوستان نے ان تجاویز کو شائستہ اعتنا نہ سمجھا کیونکہ وہ الحاق سے کم پر راضی نہیں ہو سکتا تھا۔

کوئی عجب نہ تھا کہ حیدر آباد، جوناگڑھ، کشمیر وغیرہ کی طرح ہندوستان پرتگال سے سفارتی تعلقات منقطع کرنے کے بعد گوا پر حملہ کر دیتا۔ لیکن اب اس کا پالا کسی ناتواں حریف سے نہیں تھا پرتگال نہ محض دباؤ میں آنے والا نہیں تھا بلکہ پرتگال اور گوا کی مخصوص حیثیت نے اس مسئلہ کو بین الاقوامی توجہ کا مرکز بنا دیا تھا گوا کے باشندے زیادہ تر کیتھولک ہیں۔ اس بنا پر انھیں تمام کیتھولک دنیا کی ہمدردیاں حاصل تھیں۔ مزید برآں پرتگال کے دیگر اقوام یورپ سے ایسے معاہدے تھے کہ وہ گوا پر حملہ کی صورت میں ان سے مدد لے سکتا تھا۔ مثلاً برطانیہ سے اس کا کم و بیش سات سو سال پرانا معاہدہ ہے۔ جو وقتاً فوقتاً حالات زمانہ کے مطابق بدلتا رہا ہے۔ اس کی رو سے جنگ کی صورت میں اگر پرتگال برطانیہ سے استمداد کرے تو برطانیہ اس کا پابند ہوگا۔ پرتگال ناٹو* کا رکن ہے اس نے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ اگر ضرورت پڑی تو دیگر ارکان سے وہ گوا کے معاملہ میں مشورہ لے گا۔ مزید برآں ....

برطانیہ نے ہندوستان کو یادداشت بھیجی اور گوا سے متعلق تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اس امید کا اظہار کیا کہ ہندوستان کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائے گا جس کا نتیجہ جنگ ہو۔ اسی طرح امریکہ، اٹلی، بلجیم، برازیل اور کئی ایک اور جنوبی امریکہ کی حکومتوں نے ہندوستان کو یادداشتیں بھیج کر اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ اس سے ہندوستان کو پتہ چلا کہ اگر وہ گوا پر چڑھ دوڑا تو نہ صرف بین الاقوامی رائے اس کے خلاف ہوگی بلکہ پرتگال دوسری قوموں کی مدد سے اس کا مقابلہ کرے گا۔ اس سے ہندوستان کی بوکھلاہٹ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پنڈت نہرو کو یقین تھا کہ ہندچینی میں انھوں نے جو پارٹ ادا کیا ہے اس کے پیش نظر ان کی بین الاقوامی پوزیشن مستحکم ہو گئی ہے۔ اور وہ اس کے زور پر پرتگال کو نیچا دکھا سکیں گے لیکن یہاں معاملہ الٹا ہو گیا۔ اور ہندوستان بین الاقوامی ہمدردیوں سے محروم ہوتا نظر آیا۔ اب پنڈت جی کی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے دیکھا کہ ان کا معاملہ نہ تو حیدر آباد جیسا ہے کہ اس کی داد فریاد کوئی نہ سنے۔ نہ فرانس سے کہ وہ ایک دھمکی میں اپنے مقبوضات سے دستکش ہو جائے اور نہ پاکستان سے کہ وہ بیچارگی سے اقوام متحدہ کا منہ تکتا ہے۔ انھوں نے تمام متعلقہ اقوام کو تسلی دی کہ وہ جنگ کی طرح نہیں ڈالیں گے حالانکہ بقول ان کے وہ چاہیں تو فوجیں بھیج کر گوا پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ البتہ وہ اہل گوا کو آزادی کی جدوجہد سے باز نہیں رکھ سکیں گے گو وہ ہندوستانیوں کو ایسا کرنے سے روکیں گے۔

اس پر پرتگال نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ ہندوستان سے مل کر غیر جانبدار حکومتوں کے ایسے نمائندے منتخب کریں جو گوا اور ہندوستان کی سرحد پر موجود رہیں۔ اور حالات کا مشاہدہ کرتے رہیں ہندوستان نے اس تجویز میں یہ ترمیم کی کہ یہ مبصر گوا کی سرحد کے اندر رہیں اور ہندوستان کی سرحد میں نہ آئیں۔ اس لئے یہ تجویز قابل عمل نہ ہو سکی۔ ہندوستان کی ترمیم بلاوجہ نہ تھی۔ اس نے ہر طرف سے مایوس ہو کر گوا کے لئے تحریک آزادی شروع کرا دی تھی۔ گو یہ نام نہاد تحریک ہندوستان کی طرف سے شروع کی گئی تھی۔ اور اسے ہندوستانی فوج اور پولیس کی مدد مل رہی تھی تاہم بیرونی دنیا کو یہ بتانے کی ناکام کوشش کی گئی کہ اسے اہل گوا نے جاری کیا ہے۔ "آزاد گوا" تحریک کے جراثیم گوا کے اندر ضرور ملتے ہیں۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کے دوران میں کانگریس عموماً اس علاقے میں مداخلت کرتی رہتی تھی۔ اس طرح ایک "گوان نیشنل کانگریس" بھی قائم ہو گئی تھی۔ ہندوستان اسے بطور شہادت پیش کرتا ہے کہ "آزاد گوا" کی تحریک پرانی ہے حالانکہ یہ طومار تازہ کھڑا کیا گیا ہے۔ اس تحریک کے سورما گوا پر وقتاً فوقتاً حملے کرتے رہتے ہیں اور پولیس وغیرہ کی نگرانی میں انھوں نے بعض دیہات پر قبضہ بھی کر لیا ہے۔ اس سے دونوں ممالک میں کشیدگی بڑھ گئی ہے۔ ہندوستان نے بھی تحریک کو تیز تر کر دیا۔ اور بڑے طمطراق سے اعلان ہونے لگا کہ ۱۵ اگست سنہ ۱۹۵۴ء کو یعنی ہندوستان کے یوم آزادی پر گوا پر یلغار کر دی جائے گی۔ گوا میں ہندوستان کے سفارتی نمائندے زمین کی تیاری میں مشغول تھے پرتگال نے یہ دیکھ کر ہندوستان سے مطالبہ کیا کہ وہ انھیں واپس بلا لے۔ ہندوستان نے اس کے جواب میں بمبئی کے پرتگیزی قونصل خانے کے ارکان کو واپس کرنے کے لئے کہہ دیا۔ بہرحال کشیدگی بڑھتی گئی۔ پرتگال نے جرأت سے کام لیتے ہوئے اعلان کر دیا کہ وہ گوا کی پوری طرح مدافعت کریگا اس کے ساتھ ہی متعدد اقوام مغرب نے ہندوستان کو متنبہ کیا کہ وہ جنگ سے باز رہے چنانچہ ۱۵ اگست کی تاریخ آئی تو

* (ناٹو) NORTH ATLANTIC TREATY ORGANIS- یعنی شمالی بحر اوقیانوس کی دفاعی تنظیم۔ اس میں امریکہ، برطانیہ، فرانس، ترکی اور دیگر اقوام مغربی یورپ شامل ہیں۔ جن کی تعداد پندرہ ہے

ہندوستانی ڈھول کا پول کھل گیا۔ نہ تو ہندوستان سے رضاکاروں کی کوئی قابلِ ذکر جماعت اکٹھی ہو سکی۔ نہ "مظلوم" اہلِ گوا ہی آمادہ بغاوت ہو سکے۔

یہ واضح رہے کہ گوا کی آزادی کے لئے جو "گوا لبریشن کونسل" (GOA LIBERATION CONCIL) بنی اس نے اپنی طرف سے جو یادداشت شائع کی، اس میں یہ بیان کرتے ہوئے کہ گوا میں تحریکِ آزادی کہاں شروع ہوئی یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ پرتگال کا سلوک گوا سے اتنا اچھا تھا کہ اہلِ گوا کو آزادی کا خیال بھی نہیں آیا (یہ قابلِ ذکر ہے کہ یادداشت میں اس اعتراف کا منہ یہ کہہ کر چڑایا گیا ہے کہ پہلے تو گوا سے حسن سلوک روا رکھا جاتا تھا لیکن اب حالات خراب ہو گئے ہیں) اس میں یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ اہلِ گوا نے کانگریس کی دعوت پر اس لئے لبیک نہیں کہی تھی کہ انہیں ڈر تھا کہ "آزادی" کی صورت میں وہ ہندوستان میں جذب ہو جائیں گے اور اپنا تشخص کھو بیٹھیں گے۔ اس اعتراف کے بعد کونسل کے دعوٰیِ آزادی اور ہندوستانی موقف کی قلعی کھل جاتی ہے۔

گوا سے متعلق پنڈت نہرو نے جس طرح پہلو بدلے ہیں وہ قابلِ غور ہیں۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ طاقت کے سامنے جھکتے ہیں۔ زبانی جمع خرچ کا ان پر کوئی اثر نہیں۔ گوا کے معاملہ میں جو کچھ ہوا ہے اس میں کشمیر کے لئے سامانِ عبرت ہے۔ کوئی ہے جو آنکھیں کھولے اور یہ سبق حاصل کرے۔

مطبوعاتِ طلوعِ اسلام

معراجِ انسانیت — از پرویز۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہبِ عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد مع گرد پوش — قیمت بیس روپے

ابلیس و آدم — از پرویز۔ سلسلہ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظرِ ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق قصۂ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۲۰۰ صفحات — قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستورِ پاکستان — اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اور حکومت علماء اور اسلامی جماعت کے بنائے ہوئے دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ دو سو چوبیس صفحات — قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات۔ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۸۰ صفحات — قیمت — دو روپے

سلیم کے نام — از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شگفتہ، مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات — قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے — روزمرہ کی زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ ۴۰۰ صفحات — قیمت — چار روپے

اسبابِ زوالِ امت — از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ایک سو اڑتالیس صفحات — قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے — ایسے منظومات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دورِ آزادی کی مسخ ہوئی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات — قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناسِ رسول — یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناسِ رسول؟ مزاج شناس کون ہے؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۰۰ صفحات۔ قیمت — چار روپے

مقامِ حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد — چار روپے

فردوسِ گم گشتہ — از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۱۲ صفحات — قیمت چھ روپے

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات — قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت — از پرویز۔ مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔ صفحات ۱۹۲ — قیمت دو روپے

نظامِ ربوبیت — از پرویز۔ انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور۔ دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب۔ ضخامت تین سو صفحے۔
قیمت قسم اول — چھ روپے، قسم دوم (غیر مجلد) — چار روپے

اقبال اور قرآن — از پرویز۔ علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ۔ ڈسٹ کور کے ساتھ۔ صفحات ۲۵۶ — قیمت دو روپے

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۳۱۲ - کراچی

ماہنامہ طلوع اسلام کے پرانے پرچے

ماہنامہ طلوع اسلام کے جو پرانے پرچے دفتر میں موجود ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۹۴۹ء	اگست، ستمبر، نومبر، دسمبر
۱۹۵۰ء	نومبر
۱۹۵۱ء	مارچ تا نومبر
۱۹۵۲ء	اگست تا نومبر
۱۹۵۳ء	جنوری کے علاوہ سب
۱۹۵۴ء	پورے سال کے

یہ پرچے خریدارانِ طلوع اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دیئے جائیں گے۔
خواہشمند حضرات اپنی فرمائشیں جلد بھیجیں۔ ورنہ پرچے ختم ہو جانے کا احتمال ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام — کراچی

جاوید پرنٹرس میکلوڈ روڈ کراچی

اندرونِ ہند

جمیعۃ علماء مغربی بنگال نے حال ہی میں صوبے کے وزیر اعلیٰ کو ایک یادداشت پیش کی ہے جس میں یہ درخواست کی گئی ہے کہ وہ جمیعۃ کے ایک وفد کو ملاقات کا موقع دیں۔ تاکہ یادداشت کے مندرجات پر تفصیل سے گفتگو کی جاسکے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کا اقلیتی فرقہ حکومت کا وفادار ہے۔ لیکن بار بار توجہ دلانے کے باوجود حکام نے ان کی شکایات کے ازالہ کی کوئی کوشش نہیں کی۔ وزیر اعلیٰ سے اپیل یہ کی گئی ہے کہ

آپ اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق کوئی ایسا قدم اٹھایئے جو مساجد اور جائدادوں کی بحالی، مکانات کی واپسی اور تعمیر و مرمت کے کاموں میں معاون ثابت ہو۔ نیز بے گھر مسلمانوں کو مالی مدد دی جائے۔ تاکہ وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو سکیں۔ اور مذہبی مقامات کو بے حرمتی سے بچانے کے لئے متولیوں کے حوالے کیا جائے۔

معاصر "الجمیعۃ" دہلی یادداشت مذکورہ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

مغربی بنگال میں سنہ ۱۹۵۰ء میں جو خونی ہنگامہ ہوا۔ اس کے نتیجے میں ہزاروں مسلمان گھروں سے بے گھر ہو گئے ایک بڑی تعداد مشرقی پاکستان میں چلی گئی اور باقی مغربی بنگال میں ہی رہ گئی۔ دوسری طرف مشرقی پاکستان سے جو ہندو بھاگ کر مغربی بنگال آئے۔ وہ مسلمانوں کی جائداد پر قابض ہو بیٹھے۔ پھر دونوں حکومتوں میں یہ بات طے پائی کہ جو لوگ ہنگامے کے دوران میں مغربی بنگال سے مشرقی بنگال چلے گئے ہیں۔ وہ اگر واپس آنا چاہیں تو ان کی جائدادیں انھیں واپس کر دی جائیں گی۔ اس طرح جو لوگ مشرقی بنگال سے مغربی بنگال چلے آئے۔ وہ بھی اگر واپس جانا چاہیں تو ان کی جائدادیں انھیں واپس کر دی جائیں گی۔ چنانچہ اس معاہدے کے پیش نظر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مغربی بنگال واپس چلی آئی۔ اور بہت سے ہندو بھی مشرقی بنگال چلے گئے۔ مگر ان کی جو تعداد مغربی بنگال میں رہ گئی۔ اس نے مسلمانوں کی جائدادوں پر قبضہ کر لیا۔ اور جو مسلمان مشرقی بنگال سے واپس آئے وہ اپنی جائدادوں سے محروم رہ گئے۔ اور آج بھی جب کہ اس ہنگامہ کو گذرے ہوئے پانچ سال ہو چکے ہیں۔ مشرقی بنگال سے آنے والے پناہ گزیں (ہندو) مسلمانوں کی جائیدادوں کے مالک بنے بیٹھے ہیں اور مسلمان گھر سے بے گھر ہو کر دربدر سارے پھر رہے ہیں یادداشت میں ایسے بے خانماں اور بے گھر مسلمانوں کی تعداد سات لاکھ بتائی گئی ہے۔ گویا یوں سمجھئے کہ جو مسلمان مغربی بنگال سے گئے۔ ان کے مکانات اور زمینوں پر مشرقی بنگال سے آنے والے پناہ گزیں قابض ہو بیٹھے مگر جب مسلمان معاہدے کے مطابق مغربی بنگال آئے تو انھوں نے اپنے مکانوں میں دوسروں کو مقیم دیکھا اور وہ ہزار کوشش کے باوجود اپنے مکانوں کو پناہ گزینوں سے خالی نہ کرا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود مغربی بنگال کے مسلمان تو آج تک در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور دوسرے ملک یعنی (مشرقی بنگال) سے آئے ہوئے ہندو ان کے مکانوں میں موج کر رہے ہیں۔"

اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے معاصر موصوف لکھتا ہے:-

اس کی وجہ وہ قانون ہے جو سنہ ۱۹۵۱ء میں مغربی بنگال ایکٹ ۱۶ کے نام سے نافذ کیا گیا ہے۔ اس قانون کا منشا یہ ہے کہ جب تک مشرقی بنگال سے آئے ہوئے ہندوؤں کے ایک ایک فرد کو (جو ناجائز طور پر مسلمانوں کی جائدادوں پر قابض ہیں) بسایا نہیں جائے گا۔ اس وقت تک ان سے مسلمانوں کے گھروں کو خالی نہیں کرایا جا سکتا۔ حیرت ہے کہ آنے والے مہمانوں کا خیال تو اس قدر رکھا گیا کہ ان کا کوئی فرد بے گھر نہ رہنے پائے۔ لیکن جو مسلمان صوبے کے اصل باشندے تھے۔ وہ اپنی جائداد کی موجودگی میں در در کی ٹھوکریں کھاتے پھریں۔ پانچ سال سے قبضہ اور بسا دکا یہی چکر چل رہا ہے۔ اصل مالک روٹیوں تک سے محتاج ہیں۔ اور مہمان عزیزان کے گھروں میں پاؤں پھیلا کر آرام سے سو رہے ہیں (اس کے باوجود) ذمہ دار لوگ یہ کہتے نہیں تھکتے کہ مسلمانوں کو بھی کما بسایا جا چکا ہے"۔

یہ یادداشت تیار ہو رہی تھی کہ لندن کے لئے روانہ ہونے سے قبل مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم حکومت ہند نے بمبئی میں کہا:-

"مختلف اسباب کی بنا پر ادھر سات آٹھ سال میں جو حالات ملک کے اندر رونما ہوئے اور جو مصائب اور مشکل مسائل سامنے آئے۔ ان کا نہایت پامردی اور استقلال سے مقابلہ کیا گیا۔ الحمد للہ بہت بڑی حد تک حالات پر قابو پا لیا گیا ہے۔ مسلمانوں کو اپنے مستقبل سے قطعاً مایوس نہیں ہو کر اپنی سیاسی اور مذہبی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا چاہیئے۔ اگرچہ زندگی کے بعض گوشوں میں ابھی کچھ کانٹوں کی چبھن باقی ہے۔ مگر انہیں اطمینان رکھنا چاہیئے کہ یہ کانٹے بھی عنقریب صاف ہو جائیں گے۔ اور زندگی کے تمام شعبوں میں چین اور اطمینان نصیب ہوگا۔"

جمیعۃ علمائے مغربی بنگال کی محولہ بالا یادداشت کی ایک مثال ہی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زندگی کے کن کن گوشوں میں ابھی تک کون کون سے کانٹوں کی چبھن باقی ہے۔ اور جن کے سینوں میں یہ کانٹے پیوست ہیں وہ کہاں تک اطمینان رکھ سکتے ہیں کہ "عنقریب" یہ کانٹے بھی صاف ہو جائیں گے۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کانپور کا اخبار "ہماری آواز" لکھتا ہے:-

"حضرت مولانا نے یہ بات جس انداز سے کہی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مقابلہ کرنا اور قابو پانا ان کی ذات گرامی یا جمیعۃ علماء کا کارنامہ ہے۔ حالانکہ دیکھنے والے جانتے ہیں کہ ایسا نزدیک و دور بھی نہیں۔ اگر اس صاف گوئی کو گراں نہ تصور کیا جائے تو امر واقعہ یہ ہے کہ جو تباہ کن مصائب اور مشکل مسائل سات آٹھ سال دور میں مسلمانوں کے سر پڑے۔ ان میں شدت، ڈھٹائی اور بے باکی کا اظہار اسی باعث حد سے زیادہ ہوا کہ مولانا اور رفقاء حکومت کے چند عہدے لئے بیٹھے رہے اور ہر ظلم و ستم اور ہر ناانصافی اور حق تلفی کو خود بخود ان کی قبولیت اور پسند کی سند ملتی رہی۔ مثال کے طور پر حیدرآباد کے پولیس ایکشن کو لیجئے۔ قاسم رضوی اور ان کے رضاکاروں کی سرکوبی ہزار بار جائز سہی۔ لیکن اس کا دائرہ جو لاکھوں عام مسلمانوں تک وسیع ہوا اور اس کے آج تک تباہ کن اثرات باقی ہیں۔ کیا اس کی ذمہ داری سے مولانا اور جمیعۃ علماء بری ہیں؟ ان کی تائید اور مکمل یقین دہانی کے بغیر حکومت اس اقدام کی جراءت ہی نہ کرتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ایکشن کے ریلے میں ایک قوم نے دوسری قوم کو ایسا پیس کے رکھ دیا کہ اگر صدیوں میں اصلاح ہو جائے تو آج ہوئی۔ اس سلسلہ کی دوسری مثال لیجئے، حضرت مولانا کے مرکزی وزیر تعلیم اور کابینہ کے اہم رکن ہوتے ہوئے کانگریس نے "ہندوستانی" زبان کے قدیم موقف سے اس لئے روگردانی کی کہ اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت نہ ملے، چنانچہ "ہندی" سرکاری زبان بن گئی۔ اور پھر سارے ملک میں اردو پر جھاڑو پھیر دی گئی۔.... مگر مولانا اور ان کے ہم خیال بدستور اردو کش حکومت کے ساتھ ہیں۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ یہ سب کچھ ان کی حمایت و تائید سے ہو رہا ہے؟ تو اس میں کیا غلط ہوگا؟

رہ گیا مسلمانوں کا مستقبل اور چبھے ہوئے کانٹوں کی صفائی تو انشاء اللہ وقت آنے پر کانٹوں کی صفائی کے ساتھ مستقبل بھی لائق اطمینان سامنے آجائے گا۔ اس کے لئے قدرت ایسے آدمی پیدا کرے گی جو ابن الوقت اور جی حضوری نہ ہوں گے۔ اور جراءت کے ساتھ حکومت کو غلط روی سے باز رکھنے پر قادر ہوں گے۔"

معاصر "مدینہ" جسے مولانا کا احترام پوری طرح ملحوظ ہے۔ اس پر یوں تبصرہ کرتا ہے:-

"مسلمانوں کی ساری بدقسمتی یہ ہے کہ سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے ان کا ملی شیرازہ منتشر ہو چکا ہے۔ اس کو یکجا کرنے کے لئے جیسے عظیم رہنما کی ضرورت تھی۔ وہ آج ہم میں

(باقی صفحہ ۱۷ کالم ۳ پر)

حقائق وعبر

تشتت و افتراق

ابھی پچھلے دنوں وزیر اعظم مسٹر محمد علی نے فرمایا تھا کہ مسلم لیگ اب بھی ملک میں مضبوط ترین اور موثر ترین جماعت ہے۔ صدر کی حیثیت سے اپنی جماعت سے وہ جتنا حسن ظن بھی قائم کریں کم ہے۔ لیکن ان کی مسلم لیگ نے مضبوط اور موثر ہونے کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ذرا پشاور سے چلئے اور دیکھتے جائیے کہ مسلم لیگ کے صحرائے اعظم میں کون کون سے نخلستان نظر آتے ہیں۔ خان عبدالقیوم خاں کے نام نامی سے بچہ بچہ واقف ہے۔ تقسیم سے پہلے وہ کانگریس کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ تقسیم کے بعد وہ سرحدی مسلم لیگ کے صدر بھی ہو گئے، اور صوبہ کے وزیر اعلیٰ بھی۔ لیکن وقت یکساں نہیں رہتا۔ وہ صوبے سے بے دخل ہوئے اور مسلم لیگ کی صدارت سے بھی علیحدہ کر دیئے گئے۔ وہ بہر حال ہے مسلم لیگی۔ اب جو مجلس دستور ساز کے انتخابات کا وقت آیا۔ تو انہوں نے سرحد سے مسلم لیگ کا ٹکٹ مانگا۔ ٹکٹ مرکزی پارلیمانی بورڈ کی طرف سے صوبائی بورڈ کی سفارش پر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن آپ نے صوبائی بورڈ سے بالا بالا براہ راست مرکزی بورڈ کو درخواست دی۔ لیکن انہیں ٹکٹ نہیں دیا گیا۔ اس پر انہوں نے مسلم لیگ کو چھوڑ دیا۔ اور آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑنے کا اعلان کر دیا اس کے ساتھ ہی انہوں نے مسلم لیگ میں وہ کیڑے نکالے کہ پتہ چلتا تھا کہ یہ جماعت ایسی ہے کہ کوئی شریف آدمی اس میں رہ نہیں سکتا تھا۔ اب وہ ہر چند مسلم لیگ سے باہر آ گئے ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ کئی مسلم لیگی ان کو ووٹ دیں گے۔

پشاور سے لاہور آیئے یہاں پنجاب مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے صدر ملک فیروز خاں نون ہیں۔ لیکن چونکہ اب وہ وزیر اعلیٰ نہیں ہیں اس لئے بورڈ کے ارکان نے ان کے بغیر اجلاس کر کے نامزدگیاں کر دیں۔ مرکزی بورڈ نے کم و بیش ان کی تصدیق کر دی۔ اور ملک نون اور ان کے ساتھیوں کو اس بنا پر ٹکٹ نہیں دیئے کہ وہ جماعتی ڈسپلن کا احترام نہیں کرتے یہ فیصلہ ہوا تو مسلم لیگیوں نے دھڑا دھڑ کاغذات نامزدگی داخل کرنے شروع کر دیئے۔ پنجاب میں اب تین قسم کے مسلم لیگیوں نے کاغذات داخل کئے ہیں۔ قسم اول وہ ہیں جن کو سرکاری طور پر نامزد کیا گیا ہے۔ دوسری قسم ملک صاحب کے گروہ کی ہے وہ بھی اپنے آپ کو مسلم لیگی کہلاتے ہیں۔ تیسرا گروہ آزاد مسلم لیگیوں کا ہے۔ وہ بھی مسلم لیگی ہیں۔ لیکن نہ وہ سرکاری نامزدگان میں نہ وہ نون گروہ کے ساتھ ہیں۔

اب سندھ کا منظر دیکھئے۔ یہاں مسٹر کھوڑو وزیر اعلیٰ ہیں۔ اور وہی صوبائی پارلیمانی بورڈ کے صدر ہیں۔ لیکن انتخاب کا وقت آیا تو قاضی فضل اللہ صاحب نے دعویٰ باندھا کہ صوبائی پارلیمانی بورڈ کے صدر مسٹر کھوڑو نہیں بلکہ وہ ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مسٹر کھوڑو اور قاضی صاحب دونوں نے امیدواروں سے درخواستیں طلب کیں اور دونوں نے اپنی اپنی سفارشات مرکزی بورڈ کو بھیج دیں۔ مرکزی بورڈ نے پنجاب میں تو تقریباً ایک ہی گروہ کو ٹکٹ دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن سندھ میں اس نے دوسرے گروہ کو بھی خوش کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ مسٹر کھوڑو کے تین امیدواروں کو ٹکٹ مل گئے۔ اور چوتھا ٹکٹ میر غلام علی خاں تالپور کو دے دیا گیا۔ میر صاحب مرکز میں وزیر بھی رہ چکے ہیں مرکزی وزیر ہونے کے باوجود آپ سندھی سیاست میں دخیل رہے اور کئی اہم معاملات میں انہوں نے مرکزی پالیسیوں کا ساتھ نہیں دیا گویا ایسی فضا موجود تھی کہ جس کی بنا پر ملک نون صاحب کو پنجاب میں ٹکٹ نہیں دیا گیا تھا اسی بنا پر انہیں بھی ٹکٹ نہ دیا جاتا۔ لیکن انہیں ٹکٹ مل گیا۔ مرکزی بورڈ نے جس کے صدر خود وزیر اعظم ہیں یہ اصولی نکتہ بھی حل نہ کیا کہ سندھ میں مسٹر کھوڑو کی مسلم لیگ قابل تسلیم ہے یا قاضی فضل اللہ کی۔ ویسے بورڈ نے ایک امیدوار مسٹر کھوڑو کی مخالف پارٹی کا لے کر دبی زبان سے یہ اعتراف کر لیا کہ ان کے نزدیک دونوں کی حیثیت مسلّم ہے۔ اب جو کاغذات نامزدگی داخل کرنے کا وقت آیا تو ان چار سرکاری مسلم لیگی نمائندوں کے علاوہ متعدد مسلم لیگیوں نے کاغذات داخل کر دیئے۔ ان میں ایک قاضی محمد اکبر بھی تھے جو مسٹر کھوڑو کی پارٹی کے ہیں۔ ایک مقامی اخبار کو مسٹر کھوڑو نے بتایا کہ قاضی اکبر کا اقدام ان کی ایماء پر ہوا ہے اور یہ جماعتی ڈسپلن کے منافی نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹکٹ دیتے وقت میر صاحب سے یہ طے ہوا تھا کہ ان کے علاوہ ان کی پارٹی کا اور کوئی امیدوار نہ ہوگا۔ لیکن عملاً اور کئی امیدوار پیدا ہو گئے۔ گویا میر صاحب نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور قاضی صاحب کے کاغذات اس کی صدائے بازگشت ہیں دوسرے مسلم لیگیوں کا کہنا ہے کہ میر صاحب نے خفیہ معاہدہ کیا یا نہیں اس کا انہیں علم نہیں۔ اور کیا تو وہ اس کی پابندی کے مکلف نہیں۔

یہ کچھ تو صوبوں میں ہو رہا ہے۔ مرکز کی حالت یہ ہے کہ مرکزی بورڈ کے ایک رکن میر بلخ شیر خاں مزاری نے پنجاب میں اپنے کاغذات نامزدگی داخل کر دیئے ہیں۔ آپ ٹکٹ حاصل نہیں کر سکے تھے لیکن پارٹی ڈسپلن کا لحاظ کئے بغیر امیدوار کھڑے ہو گئے یہ اجمالی سا نقشہ ہے اس افرا تفری کا۔ جو ملک کی "مضبوط ترین اور موثر ترین جماعت" میں پھیلی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ پارٹی ڈسپلن کمزور ہے۔ لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ فلاں شخص بیمار اس لئے ہے کہ اس کی صحت ٹھیک نہیں۔ نہ یہ مرض کی تشخیص ہے۔ نہ اس کا مداوا۔ چنانچہ وزیر اعظم نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ وہ ہر اس رکن کے خلاف "تادیبی کارروائی" کریں گے۔ جس نے جماعتی نظم کی مخالفت کی ہے۔ یہ

ٹھیک ہے لیکن ڈسپلن ایک منظم اور فعال جماعت کا ہو سکتا ہے مردہ جماعت کا نہیں۔ اور جماعت کی زندگی اس وقت ممکن ہو سکتی ہے کہ متعین مقاصد پیش نظر ہوں اور ان کا کما حقہٗ شعور موجود ہو۔ جہاں تک ملی مقاصد کا تعلق ہے ان کا شعور پارٹی کے تنگ نظرانہ نقطۂ نگاہ سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ معاملات کو ملی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے نہ کہ پارٹی کے نقطۂ نگاہ سے۔ بالفاظ صحیح تر ملت کو بھی ذاتہٖ ایک پارٹی سمجھنا چاہیئے اس میں مزید پارٹیاں اور تشتت و افتراق کی مردود کوششیں نہیں کرنی چاہئیں۔ مشکلات کا حل پارٹیوں کے خاتمے اور ملی شعور کی بیداری میں ہے۔ ہمارے ہاں پارٹیاں عملاً ختم ہو چکی ہیں۔ ہمیں کرنا صرف یہ ہے کہ اس حقیقت کا اعتراف کر لیں کہ وہ ختم ہو گئی ہیں اور اب ملت میں مزید تفرقہ پیدا نہیں کیا جائیگا۔

اندرون ہند

(صـ۱۴ سے آگے)

موجود نہیں ہے۔ ہاں درد اور تڑپ رکھنے والے کچھ لوگ ضرور موجود ہیں۔ جو اپنی سی کوشش کئے جا رہے ہیں۔ لیکن ان سب کا ذہنی سطح پر ایک ہونا بھی تو ضروری ہے"۔

"ہماری آواز" اور "مدینہ" دونوں کے تبصروں سے یہ حقیقت بخوبی سامنے آ جاتی ہے کہ مسلمانان ہند کو جس قیادت کی ضرورت تھی۔ وہ انہیں میسر نہیں آ سکی۔ اور جو قائدین میدان میں تھے انہوں نے سرے سے قوم آنے کی بجائے حکومت اور کانگریس کی خوشامد کر کے ذاتی مناصب کے حصول پر توجہ دینے کو مقدم سمجھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ قوم یتیم ہو گئی۔ اور اس کا پرسان حال کوئی نہ رہا جس کشتی کا ملاح کوئی نہ ہو۔ اور وہ طوفانوں میں گھر جائے۔ اس کا جو حشر ہو سکتا ہے۔ اس کا تصور مشکل نہیں۔ مسلمانان ہند کے ساتھ یہی ہوا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ اب بھی ان قائدین کی طرف دیکھ رہے ہیں جنہوں نے عظیم الشان ابتلاؤں میں ان کا ساتھ دینا شخصی مصالح کے منافی سمجھا تھا۔ وقت آ گیا ہے کہ مسلمان گردوپیش کا جائزہ لیں اور بدلے ہوئے حالات میں اپنی جگہ پیدا کریں۔ اگر انہوں نے ژرف نگاہی سے کام لیا اور حقائق کو برأی العین دیکھا۔ تو ایسی قیادت ان کے اندر سے ہی ابھر سکتی ہے جس کے فقدان سے وہ مبتلائے آلام و محن چلے آ رہے ہیں۔

۱۹ر مارچ ۱۹۵۵ء کا طلوع اسلام ادارہ کے پاس بالکل ختم ہو گیا ہے۔ اگر کسی صاحب کے پاس یہ پرچہ فالتو ہو تو ادارہ اسے قیمتاً لے لیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام کراچی

بین الاقوامی جائزہ

روس نے چوٹی کی کانفرنس کی مغربی تجویز قبول کرکے عالمی توجہات کو جنیوا پر مرکوز کر دیا ہے۔ یہ کانفرنس صدر امریکہ اور وزرائے اعظم برطانیہ، فرانس اور روس کے مابین ہوگی۔ روس کی تجویز یہ تھی کہ اس کا انعقاد وی آنا میں ہو لیکن مغربی تجویز یہ تھی کہ کانفرنس جنیوا میں ۱۸ر جولائی سے شروع ہو۔ اس کانفرنس کے لئے کوئی طے شدہ ایجنڈا مرتب نہیں کیا جائیگا بلکہ عمومی امور کو زیر بحث لا کر تفاصیل کے تعین کے لئے وزرائے خارجہ کے سپرد کر دیا جائیگا۔ گو امریکہ کی کوشش یہ ہے کہ جنیوا کی کانفرنس امور یورپ تک محدود رہے۔ لیکن برطانیہ اور فرانس مشرق بعید کو بھی زیر بحث لانا چاہتے ہیں۔ ویسے یہ امر قرین قیاس نظر نہیں آتا کہ دول اربعہ کے اعلیٰ قائدین مل بیٹھیں اور مشرق بعید کا معاملہ سامنے نہ آئے۔ امریکہ مشرق بعید کو کانفرنس کے دائرہ بحث سے باہر رکھنا چاہتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا خیال یہ ہوگیا ہے کہ چین سے متعلق معاملات کو براہ راست مذاکرات سے سلجھائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ نیشنلسٹ چین کو بالواسطہ یا بلاواسطہ ان سے متعلق کر لیا جائے۔ بہرحال قیاس یہی ہے کہ تمام عالمی مسائل پر بحث و تمحیص ہوگی البتہ بعض مستثنیات ضرور ہوں گی مثلاً اقوام مغرب نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ وہ ناٹو، دفاعی تنظیموں وحدت یورپ وغیرہ مسائل کو بحث کا مدار نہیں بننے دیں گے اسی طرح روس نے بھی یہ شرط لگا دی ہے کہ وہ مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ممالک کے معاملات اور "بین الاقوامی کمیونزم" کی سرگرمیوں کو زیر بحث نہیں لانے دیگا۔ روس کی مخالفت کی وجہ یہ ہے کہ اس نے غیر جانبدار ممالک کا سلسلہ قائم کرنے کی جو طرح ڈالی ہے تو امریکہ نے اس کے جواب میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ روس کے حلقہ بگوش ممالک کو بھی یہ موقع ملنا چاہئے کہ وہ فیصلہ کریں کہ وہ روس کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا غیر جانبدار بننا چاہتے ہیں۔ اشتراکی ممالک کا معاملہ عالمی قائدین کے روبرو پیش ہو یا نہ ہو وہ ایک گونہ دلچسپی کا حامل ضرور ہے۔ یہ یقیناً امر واقعہ نہیں کہ یہ ممالک بہ طیب خاطر روس کے حلقہ بگوش ہیں بلکہ وہ زبردست فوجی آمریت میں مبتلا ہیں اور ان کے ہاں ایسے افراد برسر اقتدار ہیں جنہیں ماسکو نے اپنے مفاد کے لئے آلہ کار کے طور پر آگے بڑھا رکھا ہے۔ گو روس کی عسکری گرفت بڑی آہنی ہے اور اس آہنی پردے کے پیچھے جو کچھ ہو رہا ہے اس کا صحیح اندازہ بہت کم بیرونی دنیا کو ہوتا ہے لیکن وقتاً فوقتاً جو خبریں اس پردے کو چیر کر نکل آتی ہیں ان سے یہ استنباط کرنا مشکل ہے کہ وہاں بالکل خیریت ہے۔ سال گذشتہ مشرقی برلن میں ۱۷ر جون کو وسیع پیمانے پر خلاف اشتراکیت مظاہرے ہوئے تھے جو بعد کو اور جگہوں میں بھی پھیل گئے تھے۔ اس سال ان مظاہروں کی سالگرہ منائی گئی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ جذبات بغاوت بالکل فرو نہیں ہوگئے۔ فرو ہونا تو ایک طرف ہو سکتا ہے کہ ان جذبات کو اور ہوا ملے روس نے جس بھونڈے طریق سے مارشل ٹیٹو کی خوشامد کی ہے اس کا اثر لامحالہ مشرقی ممالک پر پڑیگا۔ مارشل ٹیٹو کو اسلئے راندہ درگاہ قرار دے دیا گیا تھا کہ وہ ماسکو کی مکمل اطاعت کے حق میں نہیں تھے۔ اب روسی قائدین الٹے بلگریڈ جا کر گویا یہ تسلیم کر لیا ہے کہ مارشل ٹیٹو کو ماسکو سے مختلف اپنے انداز کی سوشلزم رائج کرنے کا حق حاصل ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حق ٹیٹو کو دیا گیا ہے وہ دوسرے ممالک کو بھی ملیگا؟ یعنی بالفاظ صحیح تر کیا روس کے زیر نگیں ممالک کو یہ اجازت دی جائے گی کہ وہ بھی ماسکو برانڈ کی کمیونزم کی بجائے قومی سوشلزم کا تصور قائم کریں اور اپنے حالات و مقتضیات کے مطابق روسی قالب میں تبدیلیاں کر لیں؟ یہ سوال بڑا بنیادی ہے۔ بظاہر نہیں کہا جا سکتا کہ روس اس قسم کی اجازت دے کر کمیونزم کی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے دے گا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی گرفت اور مضبوط کرے اور علیحدگی یا بغاوت کے جذبات کو پھیلنے نہ دے۔ لیکن اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ یہ باغیانہ خیالات مستقبل قریب میں لباس حقیقت و عمل نہ پہن سکیں لیکن رفتہ رفتہ ذہنیتوں میں تبدیلیاں پیدا کرتے رہیں گے اور ہو سکتا ہے کہ اندر اندر پکنے والا مواد کسی وقت اچانک پھوٹ پڑے۔ لہٰذا گو فوری نتائج کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ لیکن ان رجحانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس سلسلہ میں چین کا مسئلہ بھی قابل مطالعہ ہے چین اشتراکی سہی لیکن یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ وہ روس کا حلقہ بگوش بچہ یا بن جائے گا۔ وہ رفتہ رفتہ قومی سوشلزم کا ہی تصور پیدا کریگا اور گو ابھی عرصے تک چین اور روس کے مفادات سطحی طور پر مشترک ہوں گے اور ان میں پھوٹ کا سوال پیدا نہیں ہوگا لیکن عین ممکن ہے کہ مستقبل بعید میں روس اور چین سلطنت اشتراکیت کے دو معاون و ہم آہنگ حصے نہ رہ سکیں۔ یوں بھی خود چین کے اندر بغاوت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ گذشتہ ہفتے پیکنگ ریڈیو نے یہ انکشاف کیا کہ وسطی چین میں ایسے کارکن گرفتار کئے گئے ہیں جو تہ خانوں میں کام کرتے تھے ان کا مقصد موجودہ اشتراکی حکومت کا تختہ الٹ کر ملوکیت کا قیام تھا۔ چنانچہ ایسے کئی رضا کاروں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہے۔ یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ایک ایک کارکن کو گرفتار کرکے ٹھکانے لگا دیا گیا ہے۔ اس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ بغاوت کے جراثیم اندر اندر پرورش پاتے رہیں گے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کے متعلق قیاس آرائی قبل از وقت ہے۔

مغربی جرمنی کے چانسلر ڈاکٹر ایڈینار کو روس نے ماسکو آنے کی جو دعوت دی ہے اس کے خدوخال واضح ترہوتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر ایڈینار نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ وہ اقوام مغرب سے اتحاد کی پالیسی سے دستکش نہیں ہونگے چنانچہ وہ امریکہ میں امریکی، برطانوی اور فرانسیسی وزرائے خارجہ سے ملاقات کرکے اپنا موقف طے کر آئے ہیں ان کی کوشش ایک طرف یہ ہے کہ مغرب کے حلیف رہیں اور اسلحہ بندی کا جو فیصلہ ہو چکا ہے اس کا فائدہ اٹھائیں۔ دوسری طرف وہ یہ چاہتے ہیں کہ روس سے ایسا تصفیہ ضرور ہو جائے کہ وحدت جرمنی کی صورت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ ان کا خیال یہ نظر آتا ہے کہ وہ تحدید اسلحہ کے کسی ایسے قابل عمل فارمولے کو جانبین سے منوائیں جس سے عالمی کشیدگی کم ہو اور وحدت کے امکانات روشن ہو جائیں۔ انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ ماسکو جانے سے پہلے روس سے یہ وعدہ لیں گے کہ وہ جرمن جنگی قیدیوں کو رہا کر دیگا۔

چونکہ ڈاکٹر ایڈینار قائدین اعلیٰ کی چوٹی کی کانفرنس کے بعد ماسکو جائیں گے اس لئے توقع کی جا سکتی ہے کہ روس اس کانفرنس میں اپنی امن پسندی کا ایسا ثبوت دنیا ضرور بھیجیگا جس سے مغربی جرمنی میں یہ امید بیدار تر ہو جائے کہ روس سے مصالحت ممکن ہے لہٰذا پہلے اس صورت کو اچھی طرح آزما کے دیکھ لیا جائے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ روس کا رویہ کانفرنس میں کیا ہوگا۔ بعض حلقوں میں قیاس آرائی ہو رہی ہے کہ شائد روس یہ ثبوت دینے کے لئے کہ وہ دوسرے ممالک میں مداخلت کا قائل نہیں کمنفارم (cominform) کو بھی ختم کر دے۔ ایسا کرکے وہ اقوام مغرب کے دل میں یہ خیال پیدا کرنا چاہیگا کہ وہ ان سے ہر طرح کے تعاون کے لئے آمادہ ہے کمنفارم کمیونسٹوں کے پروپیگنڈے کا شعبہ ہے اور اس کا مقصد تمام ممالک کی کمیونسٹ پارٹیوں کے پروگرام میں مطابقت پیدا کرنا ہے ابتداً اس شعبے کا نام کمنٹرن (cominTern) تھا لیکن جنگ کے دوران میں ایسے ہی مقاصد کے تحت اسے کمنفارم سے بدل دیا گیا تھا اس نئے شعبہ کا دفتر پہلے بلگریڈ میں تھا اور جب مارشل ٹیٹو باغی ہو گئے تو اسے بخارسٹ (رومانیہ؟) میں منتقل کر دیا گیا۔

فارموسا سے متعلق ابھی تک پس پردہ مذاکرات ہو رہے ہیں گو یہ خبریں آ رہی ہیں کہ چین اور امریکہ دونوں تیاریوں میں مصروف ہیں چین حملے کی تیاریاں کر رہا ہے اور امریکہ مدافعتی تدابیر میں منہمک ہے چونکہ جنیوا کانفرنس میں بھی فارموسا کا سوال ضرور اٹھیگا اسلئے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ان تیاریوں کے باوجود صورت حال جلدی نہیں بگڑے گی۔

مشرقی پنجاب میں سکھوں کا مورچہ بدستور جاری ہے۔ یہ مورچہ پنجابی صوبے کیلئے نعرے لگانے کا حق حاصل کرنے کے لئے شروع کیا گیا ہے اب تک پانچ ہزار سے زائد سکھ گرفتار ہو چکے ہیں صوبائی وزیر اعلیٰ لالہ بھیم سین سچر نے ان دنوں کہا ہے کہ ان کے جیلوں میں ابھی بہت جگہ پڑی ہے اس لئے وہ سکھوں کے سامنے جھکیں گے نہیں۔ اسکے جواب میں سکھوں نے کہا ہے کہ وہ سنٹرل جیل بھر دیں گے

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

عالمِ اسلامی

داخلی آزادی کے سمجھوتے نے ٹیونس میں امن وسکون کی فضا پیدا کردی ہے۔ پچھلے دنوں ٹیونس کے قائد حبیب بورقیبہ تین سال کی نظر بندی کے بعد وطن واپس آئے تو ان کا بڑا گرمجوشانہ استقبال کیا گیا۔ لیکن اہل ٹیونس نے جس نظم وضبط کا مظاہرہ کیا اس نے فرانس کے اس متشدد طبقے کو لاجواب کردیا ہے جس کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اگر مسلمانوں کو اختیارات سونپ دیئے گئے تو فرانس کے مفادات غیر محفوظ ہوجائیں گے۔ ٹیونس کے تصفیہ نے البتہ دوسرے حصوں میں بہت ہلچل مچا دی ہے۔ الجزائر میں وطن پرستوں کا زور مشرقی حصے میں ہے۔ وہاں فرانسیسیوں کے زرعی فارم باقاعدہ قلعوں میں بدل گئے ہیں۔ اور وہ لوگ گورنر جنرل سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ انھیں وطن پرستوں کو جواب دینے کی اجازت دی جائے۔ مراقش میں تو فرانسیسی آبادکاروں نے قانون اپنے ہاتھ میں لے ہی لیا ہے۔ اور انھوں نے 'جوابی کارروائی' شروع کردی ہے۔ انھوں نے ایک نامور فرانسیسی تاجر کو قتل کردیا ہے؟ کیونکہ وہ اعتدال کی راہ اختیار کرنے کے حق میں تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ اب فرانسیسی آبادکاروں میں ایسا طبقہ پیدا ہوتا جا رہا ہے جو مطالبہ آزادی کا ہمدرد ہے۔ اگر یہ طبقہ زور پکڑ گیا تو خود فرانسیسیوں میں خانہ جنگی شروع ہوسکتی ہے۔

الجزائر کے آزادی پسندوں نے ایک حالیہ کنونشن میں اس پر اظہار افسوس کیا ہے کہ ٹیونس نے فرانس سے علیحدہ معاہدہ کرلیا ہے۔ حالانکہ یہ تینوں ممالک مطالبہ آزادی میں متفق ہیں۔ انھوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ سارے علاقہ کو آزاد کرانے کے لئے ایک مشترکہ محاذ بنایا جائے۔ اس تجویز کی معقولیت میں کوئی شبہ نہیں۔ اگر تینوں ممالک کے آزادی پسند ایک دوسرے کے معاون ومددگار ہوجائیں تو آزادی کی منزل قریب تر ہوجائیگی۔

مغرب اقصیٰ میں جو صورت حال پیدا ہو رہی ہے وہ فرانس کے نزدیک خوش آئند نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ فرانس نے یہ خدشہ محسوس کرنا شروع کردیا ہے کہ مغرب اقصیٰ ایک دوسرا ہند چینی بن جائے گا۔ اور اسے بیک بینی ودوگوش وہاں سے نکلنا پڑے گا۔ لیکن فرانس نے ہند چینی کی مثال سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی۔ وہ بدستور تشدد اور دباؤ کی باتیں کر رہا ہے چنانچہ وہ رفتہ رفتہ اپنی فوجیں ناٹو کی تحویل سے نکال کر شمالی افریقہ بھیج رہا ہے یہ شکل امریکہ کو پسند نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس سے ناٹو کی دفاعی حیثیت مخدوش ہوجاتی ہے۔ غالباً اسے دیکھ کر فرانس نے امریکہ پر الزام لگایا ہے کہ وہ اس سے تعاون نہیں کر رہا ہے۔ اور مغرب اقصیٰ کو ناٹو کے زیر اثر بھی نہیں رہا۔ امریکہ کو یقین دلانے کے لئے کہ وہ مغرب اقصیٰ سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں فرانس نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مغرب اقصیٰ غیر ملک نہیں بلکہ فرانس کا ناقابل تقسیم حصہ ہے۔ اس نے امریکہ کو یہ کہہ کر بھی مداخلت سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے کہ فرانس امریکہ کے حلقہ ہائے اثر کا احترام کرتا ہے۔ اور ان میں مداخلت نہیں کرتا لہٰذا امریکہ کو بھی فرانسیسی مفادات کا تحفظ کرنا چاہیئے فرانس الجزائر کو اپنے ملک کا حصہ سمجھ سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا الجزائر بھی اس پوزیشن کو تسلیم کرتا ہے؟ اندازہ یہی ہوتا ہے کہ فرانس سختی ہی سے کام لے گا۔ لیکن اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسے اپنی کمزوری کا احساس ہے۔ چنانچہ اس نے سخت گیر پالیسی کے ساتھ ساتھ اصلاحات کی بھی باتیں شروع کردی ہیں۔ فرانسیسی کابینہ نے الجیریا کے لئے جو منصوبہ تیار کیا ہے اس کی چیدہ چیدہ شقیں یہ ہیں (۱) زیادہ سے زیادہ زمین قابل کاشت بنائی جائے۔ اور ایسی زرعی اصلاحات نافذ کی جائیں۔ جن سے زمین کی تقسیم منصفانہ ہوجائے (۲) زیادہ سرمایہ لگا کر صنعتی ترقی کی رفتار تیز تر کی جائے (۳) دو محکموں کا اضافہ کیا جائے (۴) عربی کو فرانسیسی کے ساتھ دوسری قومی زبان تسلیم کیا جائے۔ یہ اصلاحات اس اعتبار سے تو اہم ہیں کہ ان سے اہل ملک کا ملکی معیشت میں حصہ اور بڑھ جاتا ہے۔ لیکن اس سے سیاسی آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ الجزائر کی جنگ آزادی اب جس مرحلہ میں پہنچ گئی ہے اس کے پیش نظر سیاسی آزادی کہیں زیادہ ضروری ہے۔ فرانس کو اس سلسلے میں کم سے کم یہ کرنا چاہیئے کہ ٹیونس کے برابر الجزائر اور مراقش کو داخلی آزادی دے دے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو جبر وتشدد سے بغاوت کی آگ کو فرو نہیں کیا جاسکیگا۔

غازہ میں مصری اسرائیلی کشیدگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ دونوں کے مابین تصادم کی خبریں سر روز آتی رہتی ہیں۔ صورت حال ایسی ہے کہ اس کا نتیجہ جنگ ہوسکتا ہے۔ یہودیوں کی کوشش ہے کہ مصر براہ راست مذاکرات کے لئے

قدم بہ قدم

صحت وشادمانی کی طرف

اچھی صحت اور اچھی قسمت کی بنیاد بچپن ہی میں رکھی جاتی ہے

اپنے بچے کو غذا کی کمی اور موسمی علالتوں کا شکار نہ ہونے دیجئے۔

"نونہال وہ صحت بخش ٹانک ہے جو آپکے بچے کے قویٰ کو مضبوط کرتا ہے اس کے بڑھنے اور پنپنے میں مدد کا اعلیٰ اس کی آمد ترقی کا ضامن ہے۔ اس میں وہ تمام قدرتی اجزا موجود ہیں جن کی بچوں کے جسم اور دماغ کو ضرورت ہوتی ہے۔

بچوں کی صحت کا محافظ

نونہال

ہمدرد

تیار ہو جائے۔ لیکن مصر اقوامِ متحدہ کے نمائندے کی وساطت کے بغیر گفتگو کے لئے آمادہ نہیں۔ اگر متحدہ اقوام کی نگرانی میں ایسی ملاقات جلد نہ ہوئی اور ہوئی اور اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا تو جنگ ناگزیر ہو جائے گی۔ تمام عرب ممالک نے مصر کو یقین دلایا ہے کہ وہ جنگ کی صورت میں اس کا ساتھ دیں گے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اگر ایسا وقت آیا تو عربی اتحاد کہاں تک موثر ثابت ہوگا۔ ۱۹۴۸ء کی جنگِ فلسطین میں عرب اقوام میں اس قدر پھوٹ تھی کہ جنگ میں شریک ہونے کے باوجود وہ پوری طرح تعاون نہیں کر سکے تھے اور شکست کھا گئے تھے۔ مصر اس شکست کو نہیں بھولا۔ یوں بھی ان دنوں دنیائے عرب میں اتحاد مفقود ہے۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عرب یہودی جنگ کی صورت میں متفرق رہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سابقہ شکست کے پیشِ نظر وہ واقعی متحد و منظم ہو جائیں۔ مصر کو بہرحال اپنی تنہائی کا احساس ہے۔ اور وہ اسی حیثیت سے جنگ کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔

یمن اپریل میں ایک خونین انقلاب میں مبتلا ہوتے ہوتے بچا تھا۔ جب اس کے حکمران امام احمد کو ان کے بھائیوں نے تخت سے معزول کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ دونوں ناکام ہو کر قتل ہو گئے تھے۔ اب وہاں پھر کچھ تبدیلیوں کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ قاہرہ میں متعین یمنی سفیر نے اعلان کیا ہے کہ وزیرِ اعظم سیف الاسلام الحسن کو وزارتِ عظمیٰ سے ہٹا دیا گیا ہے۔ اب وہ محض امیرِ یمن کے مشیر ہیں۔ الحسن جنوری سے ملک سے باہر ہیں۔ وہ بنڈنگ کانفرنس میں شریک ہوئے۔ پھر وہاں سے جاپان ہوتے ہوئے ان دنوں اپنے ملک کی نمائندگی کرنے کے لئے سان فرانسسکو پہنچ گئے ہیں۔ اعلان میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ امیرِ یمن عنقریب حکومت کی تشکیلِ نو کریں گے۔ یہ تشکیل کیوں ہوگی اور اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ اتنا یقینی ہے کہ یہ ہیجان شدید خاندانی مناقشات کا بین ثبوت ہے۔

انڈونیشیا آزادی کے بعد پہلے عمومی انتخابات کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ یہ انتخابات ۲۹ ستمبر کو ہو رہے ہیں۔ ان کے ایک ماہ بعد یعنی دسمبر میں ایک مجلسِ دستور ساز منتخب کی جائے گی جو ملک کا آئین تیار کرے گی۔ اب تک مجلسِ دستور ساز معرضِ وجود میں نہیں آسکی۔ کیونکہ ملک میں عمومی حالات ایسے نہیں کہ عام انتخابات کرائے جائیں۔ گو حالات اب بھی اطمینان بخش نہیں ہیں۔ لیکن اتنے بہتر ضرور ہیں کہ انتخابات کے مرحلے سے گزرا جا سکے۔ انڈونیشیا جیسے ملک میں انتخابات جمہوری آسان کام نہیں کیونکہ آبادی منتشر بھی ہے اور سیاسی شعور سے محروم بھی ہے۔ حکومت عوام کو انتخابات کی اہمیت و افادیت کو پروپیگنڈے کے ہر ممکن طریقے سے آگاہ کر رہی ہے۔ پارٹیاں بھی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ گزشتہ دنوں چار مسلمان جماعتوں نے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ اس کا خیال رکھیں گے کہ سیاسی اختلافات سے وحدتِ اسلامیہ پارہ پارہ نہ ہو۔ وہ دیگر مسلمان جماعتوں پر طعن نہیں کریں گے اور تمام انڈونیشی باشندوں سے درخواست کریں گے کہ وہ حکومت سے تعاون کا ثبوت دیں۔ یہ فیصلہ خوش آئند ہے۔ اگر اس کی بجائے سیاسی جماعتوں کا مشترکہ محاذ بن جاتا تو وہ مشکل ملک کے لئے زیادہ مفید ہوتی۔ لیکن اگر

نیکو وال

(صفحہ ۲ سے آگے)

پاکستان کے اندیشوں کو جرم سے تعبیر کیا۔ آپ نے دہلی میں یہ کچھ کہا لیکن اس کے بعد جب اس مہینے میں یہ خبر آئی کہ ہندوستان نے نیکو وال پر قبضہ کر لیا ہے۔ تو آپ نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ وہ انسائیکلو پیڈیا نہیں ہیں کہ انہیں معلوم ہو کہ نیکو وال پر قبضہ ہو چکا ہے یا نہیں۔ اگر ہمارے وزیرِ اعظم کا اندازِ گفتگو یہ ہو تو ہندوستان کا رویہ جتنا بھی متشدد ہو قابلِ فہم ہے۔ کیا ہم توقع کریں کہ اب بھی وزیرِ اعظم صحیح صورتِ حال سے ملک کو مطلع کریں گے؟ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ کوئی محبِ وطن پاکستانی اپنے وطنِ عزیز کے ایک انچ حصہ کو بھی ہندوستان کے تصرف میں دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا۔

بین الاقوامی جائزہ

(صفحہ ۱۶ سے آگے)

لیکن نعرے لگانے سے باز نہیں آئیں گے۔ حکومت کی طرف سے مورچے کو ناکام بنانے کے لئے طرح طرح کی چالیں چلی جا رہی ہیں۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ سکھوں نے یہ مورچہ پاکستان کی شہ پر شروع کیا ہے۔ اس الزام نے سکھوں کو اور مشتعل کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ خود سکھوں کو یہی ابھارا جا رہا ہے کہ وہ مورچے کے خلاف اس بنا پر مورچہ لگائیں کہ اکالی گوردواروں کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں ابھی تک حکومت کو اس ضمن میں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔

بزمِ طلوعِ اسلام

چکوال اشرف سرودی صاحب، ترجمان بزمِ طلوعِ اسلام سرودی کاٹیج، چکوال (ضلع جہلم) اطلاع دیتے ہیں کہ بزم اگست ۱۹۵۴ء سے مصروفِ عمل ہے۔ اور قرآنی فکر کی ترویج و اشاعت میں منہمک۔ اس بزم کی سرگرمیوں کی تفصیل بعد میں شائع کی جائے گی۔

جلال پور جٹاں رائے محمد اکبر صاحب پنشنر، پاکستانی محلہ جلال پور جٹاں (ضلع جہلم) لکھتے ہیں کہ وہ بزمِ طلوعِ اسلام کی تشکیل کے لئے کوشاں ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے مقامی قارئین کا اجلاس طلب کیا ہے۔ توقع ہے کہ جملہ احباب ان سے پورا تعاون کریں گے۔ اور جلد سے جلد بزم کی تشکیل کریں گے۔

ملتان اختر علی صاحب معرفت شاہ محمد اینڈ سنز آٹو موبائل انجینئرز بیرون پاک دروازہ ملتان۔ مقامی قارئین سے فرداً فرداً مل کر تشکیلِ بزم کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ قارئین سے التماس ہے کہ وہ بہ عجلت تمام بزمِ طلوعِ اسلام متشکل کریں اور قرآنی فکر کی ترویج کے فریضہ کی ادائیگی میں مصروف ہو جائیں۔

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ہوگا اسی قدر قرانی فکر عام ہوگا اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ہے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا دس روپے* کی ماھانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تا آنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ہوجائے۔ اس طرح - - -

- آپ کی پیشگی رقم سے ہمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اب شامل ہوجائیے۔

* پہلے ماھانہ قسط کی رقم کم سے کم پچیس روپے تھی لیکن اب متعدد قارئین کے اصرار پر اسے بدل کر دس روپے کر دیا گیا ہے۔ جو احباب دس روپے سے زیادہ قسطیں دینا چاہیں وہ دے سکتے ہیں۔

معاملہ کی ضروری باتیں

- طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ہی برتاؤ کریگا۔
- حساب میں بعض اوقات غلطی ہوسکتی ہے۔ ایسی غلطی باھمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے۔
- رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
- مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے۔
- پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ہفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ہفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۴۱۳ - کراچی - ۳

الصلوٰۃ اور الزکوٰۃ

تانا بانا

ھیں اس قرآنی معاشرے کا جس کا ھر فرد

مستقل اقدار

کو اپنے اندر سموئے دل کی مرضی اور روح

کی خوشنودی سے دوسروں کے لئے سامان نشو و نما

بہم پہنچانے کی فکر میں لگ جائے ۔

یہ معاشرہ

کیسے قائم ھو سکتا ھے؟

اس کا جواب

☆ نظام ربوبیت ☆

(از - پرویز)

میں ملاحظہ کیجئے ۔

دور حاضرہ کی عظیم کتاب ۔

قسم اول: کاغذ سفید کرنافلی جلد مضبوط مع گردپوش - چھ روپے

قسم دوم: کاغذ میکانیکل صرف گرد پوش کے ساتھ - چار روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۴۳۱۳ - کراچی-۳

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Jawed Press, McLeod Road, Karachi. Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1 Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi.
Editor: KHURSHID ALAM